قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جنوری 2018 قیمت ₹15

ماھنامہ

اُردو دُنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

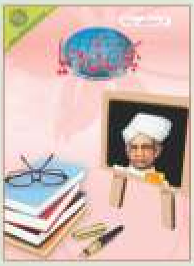

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

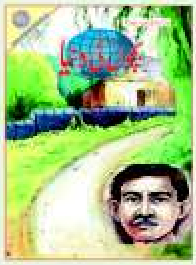

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:20، شمارہ:01، جنوری 2018

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے
Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو
ابوذر عثمانی سے انٹرویو — ناز آفرین 7

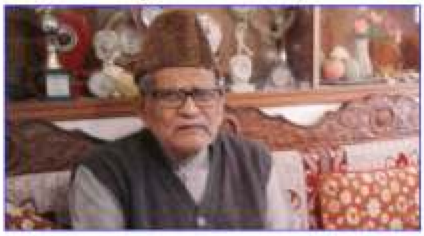

زبان و تعلیم
اردو یونیورسٹی کا بیس سالہ سفر — پی ایف رحمٰن 11

نقد و نگاہ
اردو خطوط نویسی کی تاریخ فن اور نمائندہ خطوط نگار — وہاب عندلیب 15
انتشار کا شاعر اور نقاد: ٹی ایس ایلیٹ — احمد سہیل 19

زلیخا بیگم — عشرت ناہید 22
جمیل مظہری کی نظموں میں رومانیت — زرنگار یاسمین 25

جنوری کے لعل و جواہر
منشی نول کشور اور ان کا مطبع — عبداللہ عثمانی 28
حسرت موہانی کی صحافت — امتیاز الائی 30
قرۃ العین حیدر کا خاندانی پس منظر — مہتاب عالم فیضانی 33
سوشلزم کا شیدائی: کیفی اعظمی — بی محمد داؤد محسن 35

پیغام آفاقی کا 'مافیا' — رقیہ نبی 37

سلسلۂ صحافت
لکھنؤ کی صحافتی خدمات — فرح ہاشم 39

رسالوں کے خاص نمبر
نگار کا مومن نمبر — فرزانہ بیگ 42

نیا آسماں نئے ستارے
فکشن تنقید اور 'گئو دان' — جاوید عالم 46
اردو کی خواتین افسانہ نگار — سمت کمار 49

اکیسویں صدی میں اردو ناول — رام پرساد مینا 51

سائنس اور سماج
ماہر بصریات و ریاضیات: ابن الہیثم — نیلوفر حفیظ 53
سماج پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے اثرات — محمد افروز عالم 55

ہم نے جنھیں بھلا دیا
ایک گمنام شاعر: باذل عباسی — الماس فاطمہ 59

کمپیوٹر
ونڈوز پر کام کی شروعات 62

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 67

عالمی اردو نامہ
اردو نامہ — ادارہ 80

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 81

ہماری بات

قارئین اردو دنیا کو یوم جمہوریہ اور نیا سال مبارک!

ہر نئے سال کا آغاز نئے خوابوں اور نئے عزائم سے ہوتا ہے۔ بہت کچھ نیا کرنے کی چاہت لے کر ہم نئے سال میں داخل ہوتے ہیں مگر سال کے اختتام پر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ جس نقطے سے نئے سال کا سفر شروع ہوا تھا ابھی تک زندگی اسی نقطے پر ٹھہری ہوئی ہے۔ ہم نئے سال میں مختلف سطحوں پر ماضی کا محاسبہ کرتے ہیں تو ہمیں رائیگانی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ محاسبہ کرتے ہوئے اکثر ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے لیے سال سے زیادہ اہمیت ساعت کی ہے۔ ہمارے لیے ہر لمحہ قیمتی ہے اور ان لمحوں کا صحیح استعمال نہ کیا جائے تو وقت آگے بڑھ جاتا ہے اور آدمی بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ ادب کا کوئی کلینڈر نہیں ہوتا۔ ادب ایک تسلسل سے عبارت ہے۔ ادب کا ایک ایک لمحہ سماج اور معاشرے کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے کہ ادب ہی ایک ترقی پسند صحت مند سماج کی تشکیل کرتا ہے۔ نئی ثقافتوں اور تہذیبوں کی کھڑکیاں کھولتا ہے، ساری دنیا کے مسائل سے ہمیں آگاہ کرتا ہے۔ انسانی زندگی کے کرب اور دکھ سے آشنا کرتا ہے۔ ادب ہی کی وجہ سے انسان کے سینے میں سارے جہاں کا درد پیدا ہوتا ہے اور یہی درد کا رشتہ ہے جو ہمیں قوم اور ملک سے ماورا پوری انسانی وحدت اور جمعیت سے جوڑتا ہے۔ اسی لیے ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ہم جن مباحث میں الجھے ہوئے ہیں کیا ان سے معاشرے کا کوئی فائدہ ہے؟ کیا ان مباحث کا انسانی زندگی کے ارتقا اور فلاح و بہبود سے تعلق ہے؟ دراصل ہم غیر ضروری فروعی مسائل میں الجھ کر انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کو فراموش کر دیتے ہیں۔ وہ مسائل جو آج عالمی سطح پر پوری انسانیت کو درپیش ہیں۔ ہماری نظر صرف ایک علاقے، خطے یا ملک پر نہیں ہونی چاہیے بلکہ ایک انسان ہونے کی حیثیت سے پوری دنیا کے مسائل ہمارے اپنے مسئلے کے ذیل میں آتے ہیں۔ آج انسانی زندگی سے جو مسائل جڑے ہوئے ہیں ان میں غربت، بھکمری، تشدد، ہجرت، پناہ گزینی، مطلقائی تنازعے، مہلک امراض، نیوکلیائی ہتھیار، بچہ مزدوری، غذائیت کی کمی، گلوبل وارمنگ، ماحولیاتی تبدیلی، کثافت، جنگی جرائم، نسلی امتیاز اور مذہبی و ثقافتی تصادم بہت اہم ہیں۔ ان مسائل کی تفہیم کی کئی سطحیں ہیں جہاں سماجی اور سیاسی سطح پر ان مسائل پر غور و فکر کیا جاتا ہے۔ وہیں حساس اور باشعور فنکار بھی ادبی اور ثقافتی سطح پر ان مسائل کی تفہیم کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ عالمی ادبیات میں بیشتر مسائل زیر بحث رہے ہیں اور ان کے تعلق سے مضامین، افسانے، ناول لکھے جاتے رہے ہیں۔ ہمارے بیشتر ادبا انسانی دردمندی کے احساس کے تحت ان مسائل پر نہ صرف غور کرتے رہے ہیں بلکہ معاشرے کی بیداری کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ مغرب میں بہت سے ناول و افسانے انہی عالمی مسائل پر لکھے گئے ہیں اور وہاں ان تحریروں کی وجہ سے کافی بیداری بھی آئی ہے۔ اردو زبان و ادب میں بھی انسانی حیات و کائنات کے بنیادی مسائل پر ماضی میں بھی گفتگو ہوتی رہی ہے اور حال میں بھی مکالمہ جاری ہے۔ اردو کا ایک عالمی تناظر ہے، اردو کا فنکار عالمی شعور رکھتا ہے۔ غربت، بھکمری، تشدد، ہجرت اور نسلی امتیازات مذہبی تصادم وغیرہ کے تعلق سے بہت سے افسانے لکھے گئے ہیں اور اب بھی لکھے جاتے ہیں۔ دراصل اردو زبان کسی خاص مقام یا ملک تک محدود نہیں ہے۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس سے جڑے ہوئے فنکار بھی اپنے آپ کو ایک خاص خانے میں قید نہیں رکھتے ہیں بلکہ عالمی سطح کے مسائل سے آگاہ ہو کر اپنی تخلیقات میں اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ اردو زبان کے لیے بڑی اچھی بات ہے کہ اس زبان میں ہر موضوع سے متعلق خواہ وہ علاقائی ہو، ملکی ہو یا عالمی ہو، تحریریں مل جاتی ہیں۔ اردو کے آفاقی کینوس نے ہی تمام فنکاروں کو عالمی مسائل اور موضوعات سے جوڑے رکھا ہے۔

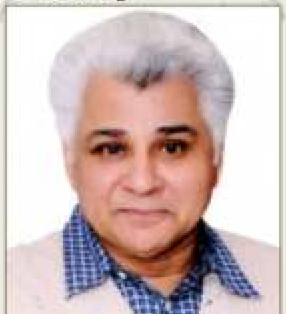

قومی اردو کونسل زبان و ثقافت کا ایک باشعور عالمی پلیٹ فارم ہے اس لیے قومی اردو کونسل نے اس وقت پوری دنیا کے مسائل پر دانشوروں سے مکالمے کی ایک صورت نکالی ہے۔ پانچویں عالمی اردو کانفرنس کا مرکزی عنوان 'اردو زبان و ثقافت اور موجودہ عالمی مسائل' رکھا ہے۔ اس میں بنیادی زور امن عالم پر ہوگا کہ امن اس دنیا کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور دہشت گردی پوری انسانیت کے لیے ایک ناسور ہے۔ اردو کے دانشوروں اور ادیبوں نے ہمیشہ امن کی بات کی ہے، آشتی کا پیغام دیا ہے، اتحاد کا نعرہ بلند کیا ہے۔ اس لیے آج اردو زبان سے تعلق رکھنے والوں کو اس مسئلے پر بہت سنجیدگی سے غور کرنا ہے اور عالمی دہشت گردی کے خلاف ایک محاذ تیار کرنا ہے کہ جس زبان نے 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ دے کر ملک کو سامراجی استعمار سے آزاد کرایا تھا وہی زبان آج دہشت گردی کے خلاف آواز بلند کرے گی تو پورا معاشرہ یقیناً اس آواز پر لبیک کہے گا۔ ہمیں انسانیت کی بقا اور تحفظ کے لیے دہشت گردی کے خلاف پوری جنگ لڑنی ہوگی ورنہ یہ انسانی کائنات تباہ و برباد ہو جائے گی۔

اردو نے ہمیشہ صرف سماج نہیں بلکہ اہل سیاست کو بھی پیغام محبت دیا ہے اور آج ہمیں اسی پیغام کو اور عام کرنے کی ضرورت ہے!

ارتضیٰ

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

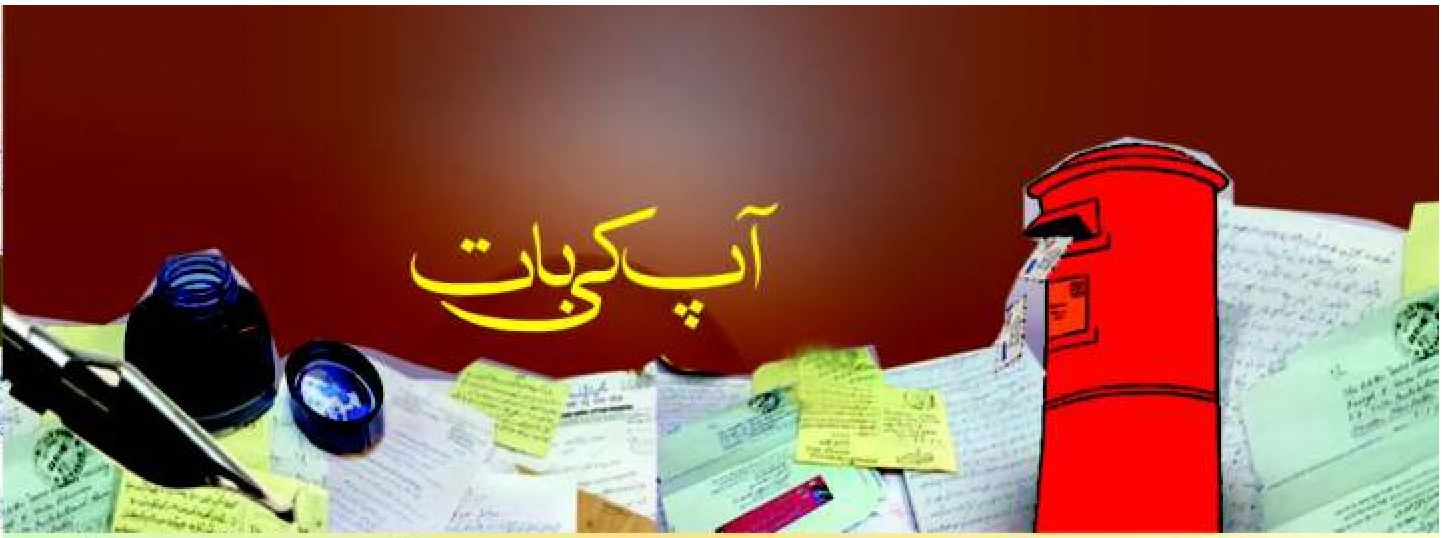

آپ کی بات

'اردو دنیا' دسمبر 2017 پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ دیدہ زیب سرورق نے دل خوش کردیا۔ تمام مضامین معلوماتی دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔ حقانی القاسمی صاحب نے 'کردار اور افسانہ یعنی دنیائے افسانہ (حصہ دوم)' پر بڑے ہی اچھے انداز میں تبصرہ کیا۔ آپ لوگ بہت بڑا کام کر رہے ہیں کہ ادب کی گمشدہ شخصیات کو گمنامی کے پردوں سے باہر لاکر متعارف کرا رہے ہیں، اور ادب کے تنوع کا احساس کرا رہے ہیں۔ پروفیسر لطیف احمد صاحب نے نہایت ہی عمدہ مضمون تحریر کیا ہے۔ 'تکنیکی سطح پر اردو زبان کو چیلنجز' ایک اچھا مضمون ہے جس میں بہت ساری کام کی باتیں یکجا ہوگئی ہیں۔ 'ونڈوز کیا ہے؟' کے ساتھ ساتھ تمام مضامین معیاری ہیں۔

محمد علیم اسماعیل: ناندورہ، مہاراشٹر

'اردو دنیا' نومبر کا شمارہ ملا۔ زیرِ نظر شمارے کے اداریے 'ہماری بات' میں آپ نے ناقدر شناس معاشرے کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہوئے فن کاروں اور ہنرمندوں کی ناقدری اور ناشناسی کو واضح کیا ہے اور غالب کے شعر کا بھی حوالہ دیا ہے جنھوں نے دہلی میں رہ کر عرضِ ہنر میں خاک نہیں کا گلہ کیا صرف دہلی کے غالب تک یہ بات ختم نہیں ہوتی، دہلی ہو کہ لکھنؤ، الہ آباد ہو کہ کلکتہ اور اسی طرح جنوب میں حیدرآباد ہو کہ بنگلور اور مدراس (چینائی) کے ایک شہر استاد شاعر شریف مدراسی نے ڈیڑھ سو سال پہلے اس کرب ناقدر شناسی کا اظہار یوں کیا ہے:

مدراس سا ناقدر کوئی نہیں ہے

یہ کرب ناشناسی ہر اس شاعر اور ادیب کے حصے میں آئی ہے جن کی جیتے جی کبھی مناسب اور مستحق پذیرائی نہیں ہوپائی۔ قدر افزائی اگر کبھی جائے تو زیادہ سے زیادہ اس کے اعزاز میں شال پوشی کرکے نمود تا دو چار تہنیتی نشستیں کرادی جاتی ہیں اور پذیرائی کی صورت میں ایک مومنٹو پیش کردیا جاتا ہے۔ بقول آپ کے کل ہند بہادر شاہ ایوارڈ،

اقبال سمان ایوارڈ، گیان پیٹھ ایوارڈ، سرسوتی سمان ایوارڈ جیسے اعزازات تک وہ پہنچتا بھی ہے تو کب جب اس کی زندگی کا ایک تہائی حصہ شعر و ادب کی سنگلاخ مہم جوئی میں صرف ہوجاتا ہے۔ عمر کے آخری حصے میں کسی ادارے نے اسے چاہے ایک لاکھ کی رقم کے کیسۂ زر سے نوازا ہو یا دس لاکھ کے کیسۂ زر سے—

اعزاز تو اس کا نام شہرت کی منزلت کو پاگیا لیکن اس کے میزان دیانت پر تولے گئے خونِ جگر کی قیمت تو کبھی وصول نہیں ہوسکتی۔ بہرچند آپ نے فن کاروں کو اعزازات بخشنے کے سلسلے میں ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے ادبی دنیا اور کونسل کے اعزازی سلسلے کی اسکیم کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے تو یہ کار مستحسن ہے۔ بالیقیں یا بلاشبہ یہ سلسلہ کہنہ مشق اور ابھرتے ہوئے شعرا اور ادبا کی حوصلہ افزائی کا باعث بنے گا۔

'منی پور میں اردو کا چراغ' والا مضمون یقیناً حقانی القاسمی کی زبان کی مٹھاس سے لبریز ہے۔ ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ کی تقریر کا ایک جملہ ہے "اس زبان نے دوسری زبانوں کے الفاظ کو بھی اپنے اندر سمویا ہے اور اب اردو کے الفاظ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی مستعمل ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جبکہ اردو زبان میں کئی دوسری زبانوں کے الفاظ اس طرح گھل مل کر اس کی وسعتوں میں سما گئے ہیں جیسے پانی میں نمک یا شکر'۔

نور فاطمہ کا مضمون 'شبلی نعمانی بحیثیتِ نقاد' پڑھنے کے بعد ایسا لگا کہ محترمہ نے مضمون کی تیاری میں انٹرنیٹ سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ آج کل تو ہندوستان کی تمام تر دانش گاہوں پر انٹرنیٹ مسلط ہے اور مضامین اور مقالوں کی تیاری میں حوالہ جات کا سہارا بھی مل جاتا ہے۔ محمد منصور عالم نے مولانا ابوالکلام آزاد کے فنِ موسیقی سے عشق کا جائزہ لیا ہے۔ مستجاب شبلی نے اپنے مضمون 'منفرد ردیوں کا شاعر جون ایلیا' کے انفرادی قوافی اور ردیفوں کا احاطہ کرتے ہوئے بہت سارے اشعار مختلف عنوانات کے تحت پیش کیے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جون ایلیا منفرد ردیفوں کے شاعر جانے گئے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان کی غزلوں کی سارے ردیف اور قوافی انفرادیت کے میزان پر تولے جائیں جب تک بات دل سے نکل کر سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں نہ اتر جائے تب تک ندرت اور تہہ داری کا احساس نہیں دلاتے— سماعتیں تاثیر شعر کو قبول کرتی ہیں محض انفرادیت کو نہیں۔ مضمون نگار نے ایک شعر 'بہت دل کو کشادہ کرلیا ہے' پیش کیا ہے۔

علیم صبا نویدی: رائس منڈی اسٹریٹ، چنئی، تمل ناڈو

نومبر 2017 کا 'اردو دنیا' پیش نظر ہے۔ صفحہ نمبر 4 کی تحریر ذرا بھی منفی نہیں ہے.. یہ سچ ہے کہ دور حاضر میں ذی علموں کی کوئی فکر نہیں ہے ضرورت ہے اپنا کام کیے جانے کی۔ پیشہ ور فنکاروں کی قدر افزائی تو ہوتی ہے مگر قدرتی فنکاروں کی ذرا عزت نہیں کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اصل فنکاری اور اصناف مفقود ہوتی جارہی ہیں۔ عبدالستار دلوی کا انٹرویو انتہائی سبق آموز ہے.. حقانی صاحب کی تحریر بھی خوش کردیتی ہے۔ اس شمارے میں موقر شخصیات کو

دیکھ کر اور ان کے بارے میں دلچسپ معلومات حاصل کر طبیعت بشاش ہوگئی۔ اردو کے عالمی فروغ کے لیے فرید قریہ ایک سید اختر امام کی ضرورت ہے۔

اکتوبر 2017 کے شمارے میں سر سید احمد خان؛ مولانا ابوالکلام آزاد؛ ظفر گورکھپوری؛ پروفیسر علیم اللہ حالی؛ پروین شاکر اور قمر رئیس صاحبان کی تصاویر سے مزین اردو دنیا افتخار نظر ہوا۔ مذکورہ تمام تصاویر میں بفضل تعالی ایک حالی صاحب بقید حیات ہیں۔ خدا موصوف کو لمبی عمر عطا فرمائے۔

ارتضی کریم صاحب آپ کا اداریہ خاطر خواہ پذیرائی کا مستحق ہوتا ہے... اللہ کرے چشمہ خامہ اور زیادہ۔ نئی نسلوں کے لیے انٹرویو درس آموز ہے۔ حالی صاحب کا آخری جواب بہت خوب ہے۔ ریاض احمد صاحب کا مقالہ یقیناً بڑا کارآمد ہے... شمارہ کی دیگر تمام تخلیقات لائق مطالعہ ہیں اور تمام قلمکار مبارکباد کے مستحق ہیں۔

❖ **شکیل سہسرامی**: پٹنہ، بہار

نومبر 2017 کا شمارہ اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں اور جدتوں کے ساتھ موصول ہوا۔ میں 'اردو دنیا' کا ایک طویل عرصے سے قاری ہوں۔ 'اردو دنیا' ہماری علمی تشنگی کا سامان ہے۔ اس کا نیا کالم 'نیا آسماں نئے ستارے' تو ہم نوجوانوں کی امنگوں کا فلک ہے۔ بلکہ دیگر رسائل کے لیے قابل تقلید بھی۔ جو آج کے وقت کی ضرورت بھی ہے اور تقاضا بھی۔

❖ **عمران عاکف خان**: 259، تاپتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

'اردو دنیا' نومبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اگرچہ شمارے میں مندرج تمام مضامین معیاری اور محققانہ ہیں تاہم مزمل سرکھوٹ کا ترجمہ شدہ مضمون 'پروفیسر عبدالستار دلوی سے ایک ملاقات' میں سمجھتا ہوں کہ حاصل شمارہ ہے۔ اردو زبان و ادب کی تئیں دلوی صاحب کی خدمات یقیناً قابل ستائش ہیں۔ زبان اور رسم الخط پر مشتمل گفتگو کا حصہ اس بات کی دلیل فراہم کرتا ہے کہ کسی بھی زبان کی چاشنی صحیح معنوں میں اس کے رسم الخط میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ نیہا اقبال کا مضمون 'اختر الایمان کے کلام میں ماضی کا رنگ' بھی اس وجہ سے اہم ہے کہ اردو تحقیق و تنقید ایک طویل عرصے تک ایک عظیم شاعر کی ادبی خدمات اور شاعرانہ کمالات سے صرف نظر کرتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ حقانی القاسمی کا مضمون 'منی پور میں بھی روشن ہے اردو کا چراغ'، 'شبلی نعمانی: بحیثیت تنقید نگار' از نور فاطمہ، 'منفرد ردیفوں کا شاعر: جون ایلیا' از مستجاب شبلی 'ادبی افق پہ درخشاں: چاند کلوی' از ابوارشد اعظمی وغیرہ بہترین مضامین کی فہرست میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔

ساتھ ہی یہ جان کر بھی بے حد مسرت ہوئی کہ کونسل نے سال 2017 سے سالانہ ایوارڈ کے آغاز کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ایک حوصلہ افزا قدم ثابت ہوسکتا ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ اس طرح کے اقدام سے نئے قلمکاروں اور فن کاروں کو ایک نئی تحریک ملے گی۔

❖ **ذاکر ریاض**: چھترہامہ، سرینگر، کشمیر

اردو دنیا بابت ماہ نومبر 2017 میں شائع مضامین میں، کیرلہ میں اردو لغت نویسی، سرسید اور علی گڑھ کی معنویت، نثار احمد فاروقی، پرسنل کمپیوٹر کیا ہے؟ اور ادبی کوئز خاص طور پر پسند آئے۔ اداریہ میں آپ نے بجا فرمایا کہ نئے دور میں ہمیں پرانی کتابوں کی اشد ضرورت ہے کیونکہ ان کتابوں میں ہمارا قیمتی سرمایہ محفوظ ہے۔ شمارے کے تمام مستقل کالم بھی اہم اور معلوماتی ہیں۔

❖ **رضوان علی خان**: جنرل سکریٹری بزم اردو، سیتاپور، یوپی

ماہ نومبر کا شمارہ ملا۔ آپ کے اداریے کے توسط سے یہ جان کر بہت مسرت ہوئی کہ معاشرے کے بہترین فن کاروں اور قلم کاروں کی قدر و تحسین کے سلسلے میں یہ معروف قومی ادارہ سالانہ ایوارڈ اسکیم کا آغاز کر چکا ہے، امید قوی ہے کہ اس حوصلہ افزائی کے قدرے بہترین نتائج فراہم ہوں گے۔ ڈاکٹر نور فاطمہ کا شامل اشاعت مقالہ 'شبلی نعمانی بحیثیت نقاد (موازنہ انیس و دبیر اور شعر العجم کی روشنی میں)' نہایت اہم اور معلوماتی نوعیت کا ہے۔ 'کلام اکبر میں ذومعنویت اور احتجاج' عرشیہ سرفراز کا رقم شدہ مقالہ اپنی مثال آپ ہے۔ جس میں کلام اکبرالہ آبادی کے مخفی گوشوں کو منصۂ شہود پر لایا گیا ہے۔

جانے یہاں ہوں ، میں یا میں
میں اپنا گماں ہوں ، میں یا میں

'منفرد ردیفوں کا شاعر جون ایلیا' کے زیر عنوان مستجاب شبلی کا مقالہ انفرادیت کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ قابل مطالعہ ہے۔ حقانی القاسمی، تابش مہدی، پرویز عادل ماہی، یونس غازی وغیرہ کے شامل اشاعت مقالات بلاشبہ معیاری نوعیت کے ہیں لیکن محمد منصور عالم کا تحریر کردہ مقالہ 'مولانا ابوالکلام آزاد اور فن موسیقی' راقم کو بہت راس آیا۔

❖ **توصیف احمد ڈار**: ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی

اکتوبر کا شمارہ دیکھ کر مسرت ہوئی۔ سرورق سرسید احمد خان کی دیدہ زیب تصویر سے مزین ہے۔ آج کل کتابیں خوب شائع ہو رہی ہیں اس کے باوجود قارئین میں مطالعے کا فقدان نظر آرہا ہے ممکن ہے ایسی کتابیں کم دستیاب ہوں جو ان میں دلچسپی پیدا کرسکیں۔ اداریے میں آپ کی تشویش کی میں تائید کرنا چاہوں گی کہ اگر ہمارے مصنفین ان پرانی کتابوں کو شائع کر کے منظر عام پر لے آئیں جنھیں پڑھنے سے اردو زبان کی اہمیت کا اندازہ ہوجائے اور دلچسپی کے ساتھ مطالعے کا شوق بھی بڑھتا رہے یقیناً اس سے زبان پڑھنے، سمجھنے اور زبان دانی کا رجحان بڑھتا جائے گا۔

صفحہ نمبر 74 پر شیخ عمران کے ذریعے مرتب کیے گئے معروضی سوالات دیکھ کر معلومات میں اضافہ ہی ہوا۔ مجھے اس ادبی کوئز میں اہم بات یہ نظر آئی کہ صنف رباعی، قصیدہ اور خاکہ کے بارے میں گراں قدر حقائق کا علم حاصل ہوا۔

❖ **ثمینہ یاسمین**: امت نگر، ناگپور (مہاراشٹر)

یوں تو مجھے ہر ماہ 'اردو دُنیا' کے نئے شماروں کا انتظار رہتا ہے، مگر اکتوبر 2017 کے شمارے کا میں بڑی بے صبری سے انتظار کرتا رہا۔

اس شمارے میں گلشن عبداللہ کا مضمون 'تعلیم نسواں اور سرسید احمد خان' دراصل ان پڑھے لکھے، لوگوں کو جواب ہے، جو آج بھی سرسید کو تعلیم نسواں کا دشمن سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں مذکورہ شمارے میں 'اردو دُنیا' کے ہر شمارے کی طرح ایک سے بڑھ کر ایک مضامین شامل ہیں، مگر نوجوان اسکالر ڈاکٹر محبوب حسن کا مضمون 'جین آسٹین۔ انگریزی کی مایہ ناز ادیبہ' اس لیے پسند آیا، کیونکہ اکثر ہمارے نوجوان اسکالرس، قلم کار اُردو فکشن پر مضمون لکھتے وقت زیادہ تر سرقے سے کام لیتے ہیں، جبکہ موصوف نے معتبر حوالوں کے ساتھ ان کے فکشن کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

یہ تاثراتی خط لکھتے لکھتے 'اردو دُنیا' نومبر 2017 کا شمارہ بھی ملا اور اسے پڑھ کر اور زیادہ خوشی اس لیے محسوس ہوئی، کیونکہ ہماری بات کے تحت اداریے میں لکھا گیا ہے کہ NCPUL اب سالانہ ایوارڈ سے بھی اُردو ادیبوں کو نوازے گا۔ ہماری ساری نظریں آپ کی نگرانی میں چل رہے موقر ادارے کی ہی طرف جمی ہوئی ہوتی ہیں۔ بس اس میں یہی ایک کمی ہمیں نظر آتی تھی۔ جو کہ اب پوری ہو رہی ہے۔ اُمید ہے کہ مذکورہ ایوارڈ دینے کے سلسلے میں آپ ایسا لائحہ عمل اختیار کرلیں گے تاکہ واقعی لگے گا کہ جینوئن قلم کاروں کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔

❖ **محی الدین زور کشمیری**: محکمہ اعلی تعلیم، جموں و کشمیر

اردو کا مستقبل خوددار اردو بولنے والوں سے وابستہ ہے

نازآفرین

ابوذر عثمانی

معاصر ناقدین میں ابوذر عثمانی ایک نمایاں نام ہے۔ جھارکھنڈ کے علاقے میں اردو تحریک کے سلسلے میں ان کی کافی خدمات رہی ہیں۔ پروفیسر ابوذر عثمانی نے متفرق علمی و ادبی موضوعات پر اردو اور انگریزی کے معیاری رسائل و جرائد میں گراں قدر مضامین سپرد قلم کیے۔ ادبی تنقید ان کے مطالعے کا مخصوص موضوع ہے۔ اس ذیل میں "غالب کا شعور نقد، عملی تنقید، ادبی تنقید کی تدریس کا مسئلہ، پرویز شاہدی کا طرز سخن، انشائیے کی ہیئت کے تعین کا مسئلہ اور بہار میں اردو تنقید کا ارتقا" ان کی معرکہ آرا کاوشیں ہیں۔ ان کی اہم ترین تصانیف میں 'فن کار سے فن تک' اور 'جدید ادبی و تنقیدی نظریات' ادبی حلقوں میں خاصی مقبول ہوئیں۔ ان کی اردو کے تئیں خدمات کو دیکھتے ہوئے انہیں 'بابائے اردو، جھارکھنڈ' کے لقب سے نوازا گیا۔ 33 برس کی خدمات کے بعد 1997 میں ونوبا بھاوے یونی ورسٹی، ہزاری باغ سے صدر شعبۂ اردو کے عہد سے سبک دوش ہوئے۔ 'اردو دنیا' کے لیے نازآفرین نے ان سے خصوصی طور پر انٹرویو لیا ہے۔ پیش ہیں طویل گفتگو کے کچھ اقتباسات:

نازآفرین: آپ کی پیدائش، ابتدائی تعلیم وتربیت کہاں ہوئی؟

ابوذر عثمانی: میری پیدائش اورنگ آباد بہار میں شرفا کی ایک مشہور بستی بشارت پور (واقع قصبہ رفیع گنج) میں ہوئی۔ میٹرک کی سرٹیفکٹ کی رو سے پیدائش کی تاریخ 2 جنوری 1937 قرار پاتی ہے۔ بچپنے کے اوائل میں چند سال نانا نانی کی شفقتوں کے سایے میں پروان چڑھا۔ کوئی پانچ برس کی عمر میں اپنے والد کے پاس اورنگ آباد آگیا اور یہیں پر میری بسم اللہ ہوئی۔ رواج زمانہ کے مطابق مجھے ابتداً اردو اور فارسی کی تعلیم دی گئی۔ والد صاحب اردو اور عربی و فارسی کے ایک بڑے عالم تھے۔ اس لیے ان ہی سے اردو اور فارسی کا درس لیا اور اس طرح میری ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ کچھ دن مکتب اور پاٹھ شالے میں بھی بٹھایا گیا اور اسکول پہنچنے تک میری پڑھائی کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ آٹھ برس کا ہوا تو مقامی گیٹ ہائی انگلش اسکول میں چھٹے درجے میں داخل کرایا گیا۔ آٹھویں درجے تک پہنچتے پہنچتے والد صاحب نے گلستاں بوستاں کا اچھا خاصا حصہ ختم کرا دیا تھا۔ فارسی کی مشہور کتاب 'مالا بدمنہ' جو اس زمانے میں مدارس کے نصاب میں داخل تھی پڑھا دی تھی۔ عربی کی ایک کتاب 'درایۃ الادب' بھی پڑھائی جس سے عربی کی گرامر اور صیغوں سے واقف ہوا جس نے میری عربی دانی کی بنیاد ڈالی۔ میٹرک تک آتے آتے یہ دونوں ہی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ 1951 میں اورنگ آباد ٹاؤن ہائی اسکول سے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوا۔ والد صاحب میری تعلیم و تربیت کے معاملے میں خاصے سنجیدہ رہے اور یہ ان ہی کی پدرانہ شفقت اور توجہ کا نتیجہ تھا کہ میں اپنی تعلیم یونی ورسٹی کی سطح تک جاری رکھ سکا اور آج کسی لائق ہوں۔ واضح ہو کہ 1953 میں جب کہ ابھی انٹرمیڈیٹ کے درجے میں تھا والد صاحب 51 برس کی عمر میں قبل از وقت انتقال کر گئے اور میں ان کی سرپرستی سے محروم ہو کر چند سال سخت ابتلا و آزمائش سے دوچار رہا۔ تاہم میں نے صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ حالات کا پامردی سے مقابلہ کرتے ہوئے پڑھائی جاری رکھی اور یونی ورسٹی کی اعلا تعلیمی منزل تک پہنچنے میں الحمداللہ کامیاب رہا۔

ن آ: اپنے والدین اور اہل خاندان کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ابوذر عثمانی: والد مرحوم محمد ایوب عثمانی اور والدہ مرحومہ سلمٰی خاتون کے بارے میں اپنی پرورش و پرداخت کے حوالے سے کچھ باتیں ابھی بتا چکا ہوں۔ اس سلسلے میں کچھ مزید باتیں یاد آ رہی ہیں جن کا ذکر کرنا یہاں ضروری سمجھتا ہوں، جن کے میری شخصیت پر واضح اثرات مرتب ہوئے۔ عربی اور فارسی کے نام ور عالم کی حیثیت سے والد صاحب کا کردار بالخصوص نمایاں رہا۔ ان کا اصل سرمایہ ان کی کئی اعلا پایے کی تصانیف اور تالیفات ہیں جن میں مولانا ابوالکلام آزاد کی مرتب کردہ عربی کے نصاب میں شامل دو حصوں پر مشتمل کتاب ازہار العرب کی شرح ہے جو انہار العرب فی شرح ازہار العرب کے نام سے شائع ہوئی جس کی خصوصیت کے ساتھ پذیرائی ہوئی۔ دوسری قابل ذکر تصنیف الحسین حصہ اول و دوم کا

اردو ترجمہ سیرت شہید کربلا ہے جو چھ سو (600) صفحات پر محیط ہے اور اردو میں اپنے موضوع پر ان کی اہم ترین کاوش شمار کی جاتی ہے۔ اردو کے مؤقر جرائد معارف، الفرقان، صدق اور جامعہ نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے بالاتفاق یہ رائے دی ہے کہ اردو میں حضرت امام حسین کی سیرت اور واقعۂ شہادت پر اس سے زیادہ جامع، مفصل اور محققانہ کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اس ذیل میں دو کتابیں 'المعیشۃ الباقیۃ' فی شرح دیوان ابی الطاحیۃ' اور' القرأۃ الرشیدہ' حصہ سوم اور کچھ رسالے بھی مرتب کیے۔ جن کا امتیاز اپنی حدود میں مسلّم ہے۔ وہ اہم مذہبی اور سیاسی موضوعات پر وقتاً فوقتاً مضامین بھی لکھتے رہے ہیں جنھیں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے مدرسہ اسلامیہ اورنگ آباد میں کچھ عرصہ تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد اپنا ایک ذاتی مدرسہ مدرسہ معارف القرآن کے نام سے قائم کیا جسے بعد میں ایک اشاعتی ادارہ مکتبہ معارف القرآن میں تبدیل کرکے مذکورہ ساری کتابیں اسی ادارے کے تحت شائع کیں اور اس کی بہ دولت ملک گیر سطح پر ایک خاصے بڑے علمی حلقے میں متعارف ہوئے۔ والد صاحب کو سیاسی اور سماجی سرگرمیوں سے بھی دل چسپی رہی۔ وہ جمعیۃ العلما اورنگ آباد کے باضابطہ صدر رہے اور اس حیثیت سے دینی اور فلاحی کاموں میں بھی وہ حسب مقدور حصہ لیتے رہے۔

والد صاحب نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہم بہن بھائیوں کی نگہ داشت میں کوئی کمی نہیں کی اور ہمارے تعلیمی فروغ پر توجہ دے کر حقیقتاً ہمارے بہتر اور خوش آئند مستقبل کی راہ ہموار کی۔ والدہ مرحومہ مشرقی وضع کی سیدھی سادی، فرشتہ صفت صوم وصلوٰۃ کی پابند خاتون تھیں۔ تعلیم سے اگرچہ بہرہ ور نہ ہوسکیں مگر وہ ایک ہنر مند خاتون تھیں۔ ان کی بڑی خوبی تھی کہ انھوں نے ہم بچوں کو بے جا لاڈ پیار سے دور رکھا اور خانہ داری کے امور کو خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہوئے ہماری اصلاح وفلاح پر خصوصی توجہ دی اور والد صاحب کی تصنیف کے کام میں ان کی بالواسطہ طور پر مدد کی۔ والد صاحب نے بھی ہم پر بڑی سخت نظر رکھی۔ ہمیں باہر کی آلائشوں سے بڑی حد تک محفوظ رکھا۔ ہم ان کے زجر وتوبیخ کے عمل سے بھی دوچار رہے۔ کبھی کبھی ہماری کسی لغزش اور خطا پر وہ برہم ہوتے تو ان کا رویہ بے حد درشت ہوجاتا تھا جسے برداشت کرنے کے ہم عادی ہوچکے تھے۔ ایسے مواقع پر ماں کی ممتا ہماری مدافعت کرتی تھی اور والد صاحب ٹھنڈے پڑ جاتے تھے۔ والد صاحب کا بہرحال بڑا کرم رہا کہ انھوں نے میری تعلیم وتربیت پر خاصی توجہ دی اور میں اس کی بہ دولت کسی لائق بن سکا۔

ن آ: آپ کو اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ عزیز کون ہیں؟

ابوذر عثمانی: میں نے گریجویشن ایس سنہا کالج اورنگ آباد سے کیا۔ مجھے کالج کے دو فاضل اساتذہ، پرنسپل بی این مادھو نے انگریزی اور پروفیسر ایودھیا پرشاد اچل نے نفسیات کے استاد کی حیثیت سے بے حد متاثر کیا اور میں ان کی اعلا علمی لیاقت اور تدریسی صلاحیت کی وجہ سے ان کا خصوصیت کے ساتھ گرویدہ رہا۔ میں نے ایم۔اے اردو بہار یونی ورسٹی سے پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے کیا اور اس بنا پر اس زمانے کے اردو اور فارسی کے نام ور اساتذہ پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر اختر قادری اور پروفیسر سید حسن سے براہ راست درس لینے اور استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ مجھے تحصیل علم کی دُھن تھی، اس لیے ان بزرگ اساتذہ تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کچھ زیادہ وقت نہیں ہوئی اور میں ان سے بہت جلد قریب ہوگیا اور مجھے ان کی صحبتوں میں اٹھنے بیٹھنے اور ان سے سیکھنے کے مواقع ملنے لگے۔ ان بزرگوں کی علمی و ادبی خدمات مطالعے اور ان کی قدر و منزلت کے باب میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بزرگ میرے لیے استاد معنوی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے ان سے بہت کچھ اکتساب فیض کیا ہے اور ان کا بے حد احترام کرتا ہوں۔

ن آ: آپ جب رانچی آئے، اس وقت یہاں کی ادبی صورت حال کیا تھی؟

ابوذر عثمانی: میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں ستمبر 1963 میں پہلے پہل رانچی وارد ہوا جب حسن اتفاق سے رانچی کالج کے شعبۂ اردو میں لکچرار کی حیثیت سے میری تقرری عمل میں آئی۔ مجھے رانچی کے پرانے شعرا میں جو اپنے کلاسیکی طرز اور لب ولہجے سے پہچانے جاتے تھے، ان میں توحید رانچوی، نظر رانچوی، غلام مصطفے اثر، عبدالحمید اثر رانچوی، الیاس ریاض اور عباس غزنوی کے نام اس وقت یاد آرہے ہیں جنھیں قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ افسوس کہ ان شعرا میں ابھی تک صرف مولانا غلام مصطفے اثر صاحب کا مجموعۂ کلام 'کلام اثر' شائع ہوسکا ہے، جس میں راقم الحروف کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ یہ مجموعہ شاعر کے کلام کے صوفیانہ رنگ کو نمایاں کرتا اور اپنا ایک واضح نقش اور اثر چھوڑتا ہے۔ توحید، نظر اور عبدالحمید اثر کا کلام روایتی طرز کے باوجود اپنے دل پذیر آہنگ سے متاثر کرتا ہے۔ نظر رانچوی کو ممتاز اردو نقاد پروفیسر شکیل الرحمان بہت عرصہ قبل اپنے ایک مضمون میں داد سخن دے چکے ہیں۔ توحید رانچوی اور عبدالحمید اثر کی بھی پہچان اور پرکھ کی ضرورت ہے۔ جسے میرے خیال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ رانچی میں ان شعرا کے بعد ابھرنے والے جدید شعرا میں پرکاش فکری، وہاب دانش، صدیق مجیبی اور اختر یوسف کے نام آتے ہیں جو اپنے کلام کی انفرادیت کی بنا پر اور اس لحاظ سے کل ہند سطح پر معروف ہیں، اپنی واضح شناخت رکھتے ہیں۔ میں رانچی آیا تو اولاً فکری اور دانش سے رابطہ رہا۔ بعد میں صدیق مجیبی اور اختر یوسف سے بھی شناسائی ہوئی۔ اس وقت ان شعرا پر تفصیلی گفتگو مقصود نہیں ہے۔ غنیمت ہے کہ ان شعرا کے کچھ مفصل مطالعے سامنے آئے ہیں۔ یہ بتانا بھول گیا کہ رانچی آنے کے بعد میری فکری اور دانش سے مین روڈ پر فرایالال کے پاس ایک ہوٹل شاید اس کا نام منیرا ہوٹل تھا تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوجاتی تھی۔ یہاں شام میں بیٹھک ہوتی تھی اور ادبی گفتگو کا سلسلہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہتا تھا۔ فکری کے بھائی وحید الحسن بھی نشست میں معمولاً شریک ہوتے تھے۔ کبھی کبھی ش اختر بھی آجاتے تھے۔ وحید صاحب اب مستقلاً امریکہ میں مقیم ہوچکے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ نثری نظموں پر مشتمل ہے عرصہ قبل منظر عام پر آچکا ہے۔ رانچی میں انجمن ترقی اردو کی سرگرمیاں بھی چل رہی تھیں۔ انجمن سے قمر العارفین اور نعیم مجاز یہی دو حضرات وابستہ نظر آئے جو عوامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کچھ نہ کچھ کررہے تھے۔ ان حضرات سے وابستہ ہوا تو میں نے بھی اس کام میں ہاتھ بٹانا شروع کیا پھر ایسا ہوا کہ میں نے جناب محی الدین احمد صاحب ایم۔اے کے ترغیب دلانے پر انجمن کی باضابطہ ذمے داری سنبھال لی اور رانچی میں ریاستی انجمن ترقی اردو کی شاخ کو مضبوط اور فعال اور اس کی کارکردگی کو موثر بنانے اور اسے تحریکی شکل دینے کے لیے باضابطہ ایک نقشۂ کار مرتب کیا اور رانچی میں غلام سرور صاحب صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی آمد کے موقع پر ان کے سامنے پیش کیا جسے سرور صاحب نے خصوصی اہمیت دیتے ہوئے اپنے روزنامے 'سنگم' میں شائع کیا۔ میں نے رانچی اور چھوٹا ناگپور (اب جھارکھنڈ) میں اردو کے منصوبہ بند انداز میں فروغ کے لیے رانچی کی انجمن کی جانب اپنے ذاتی پیسے سے کئی کتابچے شائع کیے اور انھیں گھر گھر بٹوادیا۔ رانچی میں میں نے کئی عوامی جلسے بھی منعقد کیے۔ اس سلسلے میں 1971 میں چھوٹا ناگپور علاقائی اردو کانفرنس کا انعقاد خصوصی اہمیت رکھتا ہے جس میں غلام سرور، جناب صدیقی، پروفیسر عبدالمغنی، مولانا فاروق

الحسینی اور ممتاز آدی باسی رہ نما این ای ہورو شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں کئی بے حد اہم اور کلیدی نوعیت کی تجاویز منظور کی گئیں اور ریاستی حکومت سے بعض فوری اور حل طلب مسائل کے حل کے ضمن میں فوری اقدام کا مطالبہ کیا گیا۔ انجمن نے جھارکھنڈ کے خطے میں اردو تعلیم کی ترویج، پرائمری اردو ٹیچرس کی بحالی، اردو کی درسی کتابوں کی حکومت کے ذریعے فراہمی، رانچی میں پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو کے قیام، اردو کو سکنڈری اور انٹرمیڈیٹ کی سطح پر ذریعۂ امتحان کی حیثیت سے رائج رکھنے، مردم شماری کے موقع پر (1971 سے 2011 تک) اردو آبادی کو بیدار اور متحرک رکھنے، ریاست میں اردو کی دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے بحالی، رانچی میں مولانا آزاد میموریل سنٹر کے قیام اور دوسرے بہت سارے امور اور مسائل پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے اردو کی بقا اور تحفظ کے لیے سرگرمی کے ساتھ جدوجہد جاری رکھی ہے، جس کی فی الوقت تفصیل پیش نہیں کی جا سکتی۔ ہم نے یہ چند باتیں یہاں اس لیے مرقوم کر دی ہیں تاکہ اس کے آئینے میں آج سے پچاس سال قبل رانچی اور اس پورے خطے میں اردو کی کیا صورت حال تھی (میں ادبی صورت حال کو لسانی صورت حال سے جوڑ کر دیکھتا ہوں، اس لیے یہ بحث تھوڑی پھیل گئی ہے، اس کے لیے معذرت خواہ ہوں)۔ واضح ہو کہ میں نے انجمن کی ادبی شاخ 'حلقۂ ادب' کو بھی اپنی حد تک متحرک رکھنے پر توجہ دی۔ رانچی آنے کے چند ہی برسوں میں میری ذاتی کوشش سے اولاً 'بزم فکر' کے نام سے ایک ادبی تنظیم کی تشکیل بھی ہوئی اور بعد میں اس کی جگہ زیادہ وسیع بنیاد پر 'حلقۂ ادب' کا قیام عمل میں آیا اور اس کی وقفے وقفے سے ادبی نشستیں اور جلسے منعقد ہوتے رہے جن میں شعرا اور ادبا اپنی تخلیقات پیش کرتے اور ان پر بحث و گفتگو ہوتی۔ اس سلسلے کی روداد مقامی انگریزی اور اردو اخبارات کے علاوہ ہفتہ وار 'مورچہ' گیا میں جو کلام حیدری اور عشرت ظہیر صاحبان کی ادارت میں نکلتا تھا، خصوصی طور پر شائع ہوتی رہی۔ میں نے شعبۂ اردو میں آنے کے بعد 1970 اور 1971 دو سال لگاتار 'بزم ادب' رانچی کالج کی جانب سے جس کی سرگرمیاں عرصے سے معطل تھیں، ادبی جلسے اور مشاعرے منعقد کرائے اور مختلف علمی و ادبی موضوعات پر انعامی مقابلے اور انٹر کالج مباحثے کا اہتمام کر کے شعبے میں بہتر علمی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ 'بزم ادب' کے مذکورہ پروگرام میں ممتاز ادبی شخصیات کی بھی شرکت ہوتی رہی۔ ایک موقع پر اردو دنیا کی نامور شخصیت جناب سہیل عظیم آبادی نے بھی اپنی شرکت سے ہمارے جلسے کو رونق

بخشی۔ شعبے کی جانب سے 1968 میں پروفیسر اختر قادری صدر شعبۂ اردو، بہار یونی ورسٹی کی صدارت میں موجودہ ادبی مسائل پر ایک اہم سیمینار منعقد کیا گیا جس میں پروفیسر کرامت علی کرامت، ڈاکٹر بی پی ودیارتھی، ڈاکٹر سید عبدالباری، پروفیسر عبدالمغنی، ڈاکٹر نجم الہدیٰ، ڈاکٹر مظفر اقبال، ڈاکٹر نثار مصطفےٰ، پروفیسر احمد سجاد اور پروفیسر عثمانی نے موضوع زیر بحث کے مختلف پہلوؤں پر اپنے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر منظر شہاب، وحیدالحسن، پروفیسر ناگیشور لال نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے ان مقالوں پر

اپنے ٹھوس اور مفید خیالات کا اظہار کیا اور کچھ اہم نکات کی نشاندہی کی۔

رانچی کالج کے شعبۂ اردو کو یہ امتیاز بھی حاصل رہا کہ 1968 میں اردو کے بلند پایہ نقاد پروفیسر آل احمد سرور نے شعبے کے زیر اہتمام منعقدہ ایک خصوصی جلسے میں ادب میں اظہار و ابلاغ کے موضوع پر ایک فکر انگیز تقریر کی جس کا پورا متن 'مریخ' پٹنہ میں شائع کرا دیا گیا تھا اور سرور صاحب کی کتاب 'نظر اور نظریے' میں بھی یہ تقریر شامل کر لی گئی ہے۔

ن آ: موجودہ ادبی تنقید کی صورت حال پر اپنے خیالات کا اظہار کریں؟

ابوذر عثمانی: پہلے یہ واضح کر دوں کہ ہر ادبی مطالعے کو تنقید کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ تنقید کا زندگی سے بے حد وسیع اور گہرا رشتہ ہے بہ قول ٹی ایس ایلیٹ ''تنقید زندگی کے لیے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی سانس''۔ انسانی زندگی سے تنقید کے اس بنیادی اور وسیع تر رشتے کے پس منظر میں اس کی متنوع شکلوں میں کارفرمائی کا بہ خوبی احساس کیا جا سکتا ہے جنھیں ہم نے الگ الگ نام دے رکھا ہے۔ تنقیدی عمل کے اس تنوع کے باوجود اس کا اصل مفہوم، مقصد اور منصب اپنی جگہ برقرار رہتا ہے جسے بالاتفاق حسن و قبح اور خوب و ناخوب کے درمیان فرق و تمیز کے

عمل سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کی بنیاد پر ہم کسی چیز کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ ہم یہاں ابھی تنقید کی جس مخصوص صورت سے بحث کر رہے ہیں وہ ادبی تنقید ہے جس کی اگرچہ الگ الگ صورتیں ہیں جنھیں ہم رومانی، کلاسکی، اخلاقی، سماجی، عمرانی، مارکسی، نفسیاتی، اساطیری، تاثراتی، ہیئتی، جمالیاتی، متنی، اسلوبیاتی، ساختیاتی، پس ساختیاتی اور اکتشافی وغیرہ مختلف ناموں سے موسوم کرتے ہیں اور انھیں ادبی تنقید کے مختلف نظریوں اور طریقوں کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ادبی تنقید کے مختلف اسالیب اور صورتوں کی نظریاتی (Ideological) اور (Aesthetic) ان دو بنیادوں پر تشکیل کی گئی ہے اور اس طرح دیکھا جائے تو ناقدین ادب عمومی طور پر ادبی تخلیق کے کسی ایک پہلو ہی کی بنیاد پر اپنے مطالعے پیش کرتے ہیں۔ ڈیوڈ ڈشز نے اپنی مشہور و معروف کتاب Critical Approach to Literature میں اس کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ جس کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں رہ جاتا کہ کوئی بھی تنقیدی نظریہ ادبی مطالعے کا کوئی آخری اور حتمی معیار نہیں دیتا اور سب ہی اپنی اپنی حدود میں ادبی و شعری ابلاغ میں معاون ہوتے اور اس میں حتی المقدور اضافہ کرتے ہیں۔

ادبی تنقید کے مختلف نظریات کے جواز کے باوجود مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں جھجک نہیں کہ ہمارے ادبا و ناقدین ادبی تنقید کے اصل مفہوم کو فراموش کر کے آج گروہی عصبیت کا شکار ہو رہے ہیں اور ان کی الگ الگ لابی بن گئی ہے، جس کے نتیجے میں ہمارے بعض ناقدین اور یکتائی (Originality) کے باوجود پس پردہ چلے گئے ہیں۔ فی الوقت اس بحث کو یہیں پر چھوڑتا ہوں اور یہ بتانا زیادہ ضروری سمجھتا ہوں کہ تنقید کا عمل ایک معنی میں جیسا کہ ایف آر لیوس کا خیال ہے ایک مشترک کاوش (Common Pursuit) قرار پاتا ہے جو ناقدین اور ان

کے ادبی مطالعات کے بہ ظاہر فرق واختلاف کے باوجود ادب فہمی کو اس کی وسیع تر شکل میں بروئے کار لاتا ہے۔ جس کا شعور بدقسمتی سے ابھی تک عام نہیں ہوا ہے۔ میں افلاطون و ارسطو اور انگریزی ادب کے ممتاز ناقدین ٹی ایس ایلیٹ، ایف آر لیوس، ہربرٹ ریڈ، لائنل ٹریلنگ، کے لینتھ بروکس، آر ایس کرین، جیمس اسکاوٹ وغیرہ اور اردو کے اہم ترین ناقدین شمس الرحمٰن فاروقی، اسلوب احمد انصاری، آل احمد سرور، احتشام حسین، عبدالمغنی، حسن عسکری، کلیم الدین احمد، محمد حسن اور گوپی چند نارنگ وغیرہ کے مطالعے سے اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ اردو میں ادبی تنقید کی موجودہ صورت حال کا اسی تناظر میں مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہاں اس بابت اپنے اس تاثر کا اظہار کرنا البتہ مناسب سمجھتا ہوں کہ ہمارے یہاں ابھی ادب کے مطالعے میں فنی پہلو پر نسبتاً زیادہ زور دیا جا رہا ہے اور یہی اردو میں ادبی تنقید کا غالب میلان ہے۔ اس باب میں آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی اور وہاب اشرفی بہ شمول ابوالکلام قاسمی کے درمیاں اساسی اعتبار سے بہ مشکل فرق کیا جا سکتا ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے رجحانات ادب کی تعبیر و تفہیم میں فرق و اختلاف کے باوجود (جدیدیت کے زیر اثر ادب کے تنقیدی مطالعے میں وحدت معنی جب کہ مابعد جدیدیت پر مبنی تنقیدی نظریہ میں تکثیر معنی کو اصل اہمیت دی گئی ہے) کے پہلو کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے ان کی جزئیات سے دونوں اساسی طور پر ان کی جزئیات سے قطع نظر ادبی مطالعے کی شکلیں ہیں۔ اس سلسلے میں تفصیلی بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے اخیر میں اس نکتے کی نشان دہی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ادبی تنقید ذاتی پسند ناپسند سے اوپر اٹھ کر ادب کے مطالعے کو ایک واضح نقطۂ نظر اور اصول و معیار کے تابع رکھنے کا تقاضا کرتی ہے۔ جس کے بغیر ادب کا معروضی مطالعہ ممکن نہیں ہے۔ تنقید کو اسی باعث ادب کی جانچ پرکھ کی کسوٹی سے تعبیر کیا گیا ہے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے۔ تنقیدی نظریے جو مختلف النوع شکل میں رائج ہیں۔ ادبی مطالعے کے اس تقاضے کو کہاں تک پورا کرتے ہیں اس پر بجا طور پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے کلیم الدین احمد کے الفاظ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ادبی تنقید اصلاً تقابل و تجزیہ، فرق و امتیاز اور تعین قدر و مقام سے عبارت ہے اور یہی اس کے بنیادی اجزا ہیں۔

ن آ: ہندستانی سطح پر اردو کے مستقبل پر اپنی رائے کا اظہار کریں؟

ہر زبان اپنی ایک لسانی اور قواعدی ساخت رکھتی ہے اور ایک لسانی گروہ کی زبان کی حیثیت سے اپنے الگ وجود سے پہچانی جاتی ہے۔ اس کی یہی خصوصیت دراصل اس کے وجود و بقا کی ضمانت بنتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ کسی زبان کو محض کسی ایک مذہبی فرقے سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس طرح اس کی حد بندی کی جا سکتی ہے۔ بلکہ اس کا عمل مذہبی تفریق اور امتیاز سے اوپر اٹھ کر نسبتاً وسیع تر دائرے میں بروئے کار آتا ہے۔ اردو زبان کے لسانی اور تاریخی ارتقا کو سامنے رکھا جائے تو اس کی تشکیل میں جو مختلف زبانوں اور ان کے صوتی عناصر کی کارفرمائی ہے اس کا واضح ادراک کیا جا سکتا ہے جس نے اسے قومی سطح پر مشترک تہذیبی ذریعۂ اظہار کا روپ دیا اور اسی بنا پر سر تیج بہادر سپرو اسے ہندو مسلم میل جول کی نشانی قرار دیتے ہیں۔

ابوذر عثمانی: ہر زبان اپنی ایک لسانی اور قواعدی ساخت رکھتی ہے اور ایک لسانی گروہ کی زبان کی حیثیت سے اپنے الگ وجود سے پہچانی جاتی ہے۔ اس کی یہی خصوصیت دراصل اس کے وجود و بقا کی ضمانت بنتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ کسی زبان کو محض کسی ایک مذہبی فرقے سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس طرح اس کی حد بندی کی جا سکتی ہے، بلکہ اس کا عمل مذہبی تفریق اور امتیاز سے اوپر اٹھ کر نسبتاً وسیع تر دائرے میں بروئے کار آتا ہے۔ اردو زبان کے لسانی اور تاریخی ارتقا کو سامنے رکھا جائے تو اس کی تشکیل میں جو مختلف زبانوں اور ان کے صوتی عناصر کی کارفرمائی ہے اس کا واضح ادراک کیا جا سکتا ہے جس نے اسے قومی سطح پر مشترک تہذیبی ذریعۂ اظہار کا روپ دیا اور اسی بنا پر سر تیج بہادر سپرو اسے ہندو مسلم میل جول کی نشانی قرار دیتے ہیں۔ ہندستانی زبانوں میں اردو کی یہی امتیازی خصوصیت ہے جو اس کی اندرونی توانائی کا باعث بنی۔ جس نے پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں اسے حقیقتاً زندہ اور فروغ پذیر رکھا ہے۔ اردو کی جڑیں ہندستانی تاریخ و تہذیب کی گہرائیوں میں پیوست ہیں جو اسے رس اور جس فراہم کرتی رہیں گی۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آزادی کی لڑائی میں اردو کا کیا رول رہا۔ ہندستانی زبان میں یہ اردو ہی ہے جس نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا آج یہ نعرہ ہندو مسلمان سب کی زبان پر ہے۔ اس نعرہ نے بھارت واسیوں میں حصول آزادی کا سرفروشانہ جذبہ پیدا کیا اور انھیں وحدت کی لڑی میں پرو دیا۔ اردو کی قومی اور وطنی شاعری اس لحاظ سے اردو شعرا کا طرۂ امتیاز اور ہندستانی ادبیات کا ایک شان دار اور یادگار سرمایہ قرار دی جائی گی۔ اقبال کے ترانۂ ہندی 'سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا' اس پر سونے پر سہاگے کا کام کیا جو اپنی مثال آپ ہے۔

اردو ہندستان کی زبان ہے اور بعض ریاستوں میں بہ شمول جھارکھنڈ اسی آئینی بنیاد پر سرکاری زبان کی حیثیت بھی حاصل ہو چکی ہے پھر بھی اس پر عمل درآمد نہیں رہا ہے۔ اردو تعلیم کی صورت حال پرائمری سطح سے لے کر ثانوی اور اعلا سطح تک متزلزل ہے جس کے بغیر ظاہر ہے اردو زبان کے وجود کو یقینی نہیں بنایا جا سکتا۔ ایسے میں حال میں اردو کے مستقبل کے بارے میں اندیشے اور بے یقینی کا احساس پیدا ہونا فطری ہے مگر میرا خیال ہے کہ اردو کے وجود کو اصل خطرہ خود اردو والوں کی اردو سے بڑھتی ہوئی بے گانگی سے ہے اور یہ یقیناً ایک تشویش ناک امر ہے۔ اردو زبان اقلیتی زبان ہونے کے باوجود قومی و عالمی سطح پر ایک وسیع لسانی اور تہذیبی پس منظر سے جڑی ہوئی ہے۔ اگر اردو والے اس حقیقت کا احساس کر سکیں اور اس زبان کے کلچرل رشتے اور بنیاد سے اپنا رشتہ برقرار رکھتے ہوئے اردو تعلیم سے اس کے ایک جزوی حیثیت سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکیں تو اردو ایک مستقل لسانی گروہ کی زبان کے طور پر اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں یقیناً کامیاب رہے گی اور ایک زندہ زبان کی حیثیت سے دنیا کی کوئی طاقت اسے ختم نہیں کر سکتی۔

اردو کا مستقبل سرکاری سرپرستی سے نہیں ہے خود اردو بولنے والوں سے وابستہ ہے اور وہی اس کے محافظ ہیں۔

ن آ: اردو والوں کو کیا پیغام دیں گے؟

ابوذر عثمانی: اردو کی تعلیم کو اردو والوں میں زور و شور سے پھیلائیں اور اردو کو عوامی سطح پر رائج کرنے کی کوشش جاری رکھیں تا کہ یہاں جھارکھنڈ میں اردو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے اپنا وجود برقرار رکھ سکے۔ جب تک ہم اردو کو اپنے گھروں میں مادری زبان کے طور پر رائج نہیں کرتے۔ اس کے وجود کو یقینی نہیں بنایا جا سکتا۔ اردو جھارکھنڈ کی دوسری سرکاری زبان ہے، اس حیثیت سے بھی سرکاری دفاتر میں اس کے نفاذ کی ضرورت ہے۔ پہلے اردو ہندو مسلمان سب کی زبان تھی، اس روایت کی تجدید کی ضرورت ہے۔ اس پر لازماً توجہ ہونی چاہیے۔ انھیں کوششوں کی بدولت اردو کا عوامی سطح پر فروغ ممکن ہو سکے گا اور اس کا مستقبل ان شاء اللہ تابناک ہوگا۔

■

Naaz Afreen
Research Scholar, Dept of Urdu
Ranchi University
Ranchi - 800008

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY
(A Central University established by an Act of Parliament in 1998)
(Accredited with 'A' Grade by NAAC)

پی۔ایف۔رحمان

اردو یونیورسٹی کا بیس سالہ سفر

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ہندوستان کی واحد مرکزی یونیورسٹی ہے جس کا ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ طویل عرصے کے مطالبات اور مختلف اہم شخصیات کی کوششوں سے جنوری 1998 میں اس کا قیام عمل میں آیا، جو یقیناً ہندوستان میں موجود چھ فیصد سے زائد اردو بولنے والی آبادی کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ یونیورسٹی نے اپنا بیس سالہ سفر مکمل کرلیا ہے۔ یہ پودا اپنے اس بیس سالہ سفر میں مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرچکا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس ادارے کے مقاصد اور ان مقاصد میں اب تک ہونے والی کامیابیوں کا جائزہ لیا جائے۔

اردو ذریعۂ تعلیم سے اعلیٰ تعلیم کا کامیاب تجربہ پہلی بار عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد میں 1918 میں کیا گیا۔ اس کے بعد 1920 میں جب جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تو اس کے ارباب اختیار نے اردو ذریعۂ تعلیم سے تعلیم کی سہولت فراہم کی۔ ان اداروں کے قیام سے قبل فورٹ ولیم کالج، کلکتہ اور دلی کالج میں اردو میں مختلف سماجی و سائنسی علوم کی کتابیں ضرور تیار کی گئی تھیں لیکن اردو کو اعلیٰ سطح پر ذریعۂ تعلیم نہیں بنایا جاسکا تھا۔ ان دونوں اداروں میں اردو ذریعۂ تعلیم کی صورت حال پر غور کریں تو عثمانیہ یونیورسٹی میں ابتدائی دور میں تو اردو ذریعۂ تعلیم نافذ رہا مگر آزادی کے بعد کے حالات کے پیش نظر اردو ذریعۂ تعلیم کو ختم کردیا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک طویل عرصے تک اردو ذریعۂ تعلیم رہی مگر بدلتے حالات اور انگریزی کی اہمیت کے پیش نظر وہاں بھی ذریعۂ تعلیم انگریزی کردیا گیا۔ اس پس منظر میں بیسویں صدی کی آخری دہائی میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تاکہ ادبی، سائنسی اور پیشہ ورانہ علوم کو اردو ذریعۂ تعلیم سے فروغ و ترقی دیا جاسکے۔ اس لیے ایسی منفرد یونیورسٹی کے مسائل اور حصولیابیوں کو جاننا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اردو زبان پر آئینی نقطۂ نظر سے گفتگو کریں تو زبانوں سے متعلق حکومت ہند کی پالیسی میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یہ بات ملک کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی کے مفاد میں ہے کہ ہندی کے علاوہ ملک کی دیگر 22 اہم زبانوں کے فروغ کے لیے لازمی اقدامات کیے جائیں۔ اس سلسلے میں صوبائی حکومتوں کو مرکزی حکومت کے تعاون سے علاقائی زبانوں کے فروغ کی ذمے داری دی گئی۔ چونکہ اردو کسی ایک صوبے یا کسی خاص کمیونٹی کی زبان نہیں تھی، اس لیے اس کی ترقی کی ذمے داری مرکزی حکومت نے لے لی۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام اردو کے فروغ کا ہی ایک حصہ ہے۔

اس سلسلے میں حکومت ہند نے 1972 میں جناب آئی کے گجرال کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی تاکہ یہ کمیٹی حکومت کو مشورہ دے کہ اردو کے فروغ کے لیے کیا کیا اقدامات کیے جائیں اور تعلیمی، ثقافتی اور انتظامی سطح پر اردو بولنے والے افراد کے لیے سہولیات فراہم کرنے کے لیے کن تدبیروں کو عمل میں لانے کی ضرورت ہے۔ سولہ ممبروں پر مشتمل گجرال کمیٹی نے 26 میٹنگوں کے بعد وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کو 1975 میں ایک رپورٹ (گجرال 1975) پیش کی جس میں 187 سفارشات کے ساتھ اردو کے مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی تھی۔ رپورٹ کو کابینہ اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں 1979 میں پیش کیا گیا اور اردو یونیورسٹی کے قیام پر گفتگو بھی ہوئی۔ مگر چند مسائل جیسے یونیورسٹی سطح کی اردو میں کتابوں کی عدم دستیابی، باصلاحیت افراد کی قلت، اردو ذریعۂ تعلیم سے آنے والے طلبا کی تقرریوں میں مشکلات کا سامنا وغیرہ کے مدنظر کمیٹی نے یونیورسٹی کے قیام کی سفارش نہیں کی۔

بعد ازاں نئی تعلیمی پالیسی ایکشن پلان کے تحت وزارت برائے فروغ انسانی وسائل نے اردو یونیورسٹی کے قیام کے لیے جناب عزیز قریشی سابق ایم پی اور سابق گورنر اتراکھنڈ کی سربراہی میں 13 ممبران پر مشتمل ایک کمیٹی (ایم ایچ آر ڈی 1993) تشکیل دی۔ کمیٹی نے کئی میٹنگوں کے بعد اردو یونیورسٹی کے قیام کے متعلق درج ذیل چند اہم سفارشات پیش کی:

- اردو کو ملازمت فراہم کرنے والے کورسیز کے ساتھ جوڑا جائے۔
- یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو ہو۔
- 17 اسکول آف اسٹڈیز بنائے جائیں۔
- سائنسی و سماجی علوم پر ادب کے مقابل زیادہ توجہ دی جائے۔
- روایتی اور فاصلاتی دونوں طرز تعلیم کا نظم کیا جائے۔

- غیر رسمی تعلیم کے لیے اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (IGNOU) کے طرز پر تعلیمی نظام، معیار تعلیم اور اسٹڈی سینٹرس کا نظم ہو، جہاں ووکیشنل ٹریننگ کی بھی سہولت موجود ہو۔
- ہیومنیٹیز، سوشل سائنس، فزیکل سائنس میں تحقیقی کام پر توجہ دی جائے اور این سی ای آر ٹی اور این سی پی یو ایل کے اشتراک سے مختلف سبجیکٹ پر کتابیں شائع کی جائیں۔
- بڑے پیمانے پر ترجمہ نگاری کا نظم ہو۔
- سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو، انگریزی، ہندی یا علاقائی زبان کو لازمی سبجیکٹ کی حیثیت سے پڑھایا جائے۔
- این آئی او ایس کے طرز پر اوپن اسکولنگ کا نظم بھی ہو۔
- مدرسہ ماڈرنائزیشن اسکیم کے تحت اردو یونیورسٹی مدارس کو مالی تعاون دینے اور ان کی اکیڈمک رہنمائی کرنے والی نوڈل ایجنسی ہو۔
- اردو یونیورسٹی کا قیام بالکل نئے سرے سے کیا جائے کسی بھی دوسری یونیورسٹی کو تبدیل کرکے نہیں۔

پھر اسی سلسلے میں پارلیمنٹ ایکٹ کے تحت 1998 میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور اس ایکٹ (MANUU Act, 1996) کے تحت یونیورسٹی کے مندرجہ ذیل مقاصد کا تعین ہوا:

- اردو زبان کی ترویج وترقی۔
- اردو ذریعہ تعلیم سے پیشہ ورانہ، تکنیکی تعلیم اور تربیت فراہم کرنا۔
- اردو ذریعہ تعلیم سے اعلی تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند افراد کو رسمی اور فاصلاتی طرز تعلیم کے ذریعہ اردو میں اعلی تعلیم وتربیت کے مختلف پروگراموں تک رسائی کو ممکن بنانا۔
- تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ دینا۔

اردو یونیورسٹی نے مذکورہ بالا مقاصد کے ساتھ ساتھ اپنا وژن اور مشن لے کر قدم بڑھایا۔ جہاں اردو ذریعہ تعلیم سے معیاری تعلیم کی حصولیابی ممکن بنانا اس کا وژن رہا تو وہیں سماجی، اقتصادی اور تعلیمی طور پر کمزور اردو سوسائٹی کو بااختیار بناکر مرکزی دھارے میں شامل کرنا اس کا مشن بنا، تاکہ یہ سوسائٹی ملک کی سماجی و اقتصادی ترقی میں شریک ہوسکے۔

پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری کے پہلے وائس چانسلر کی حیثیت سے 9 جنوری 1998 کو عہدہ سنبھالنے کے ساتھ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا سفر شروع ہوا۔ ابتدائی دنوں میں حیدرآباد یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس پھر کرایہ کی عمارت سے یونیورسٹی نے اپنا کام شروع کیا۔ اردو یونیورسٹی کے مقاصد کی حصولیابی کے لیے ارباب حل عقد کی آرا اور مشوروں سے واقفیت کی خاطر اس وقت کے وائس چانسلر نے مختلف مقامات پر سمینار وغیرہ کا انعقاد کرکے اردو داں طبقے سے اردو کے فروغ وارتقا کے لیے مشورے طلب کیے۔ ساتھ ہی ساتھ خواتین کی تعلیمی و معاشی ترقی اور اردو اصطلاحات کے استعمال پر بھی اہم شخصیات و ماہرین سے مسلسل رابطہ رکھا اور پھر انھیں آرا اور مشوروں کی روشنی میں یونیورسٹی کے اہداف کا تعین کیا۔ ایک اعلی سطح کی مشاورتی کمیٹی تشکیل دی گئی اور اسی کی سفارشات سے کام شروع ہوا۔

پروفیسر شمیم جیراجپوری نے جنوری 2003 تک وائس چانسلر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس زمانے میں جو ترقی ہوئی اگر ہم ان پر سلسلے وار نظر ڈالیں تو 1998 کے فروری میں انتظامی دفتر کی ابتدا، جولائی میں اردو یونیورسٹی کے لیے 200 ایکڑ زمین کی فراہمی اور اس زمین پر چہار دیواری کی تعمیر، ٹرانسلیشن ڈویژن اور لائبریری کی ابتدا، اگست میں بیچلر آف آرٹس (بی اے) کے ذریعے نظامت فاصلاتی تعلیم کی شروعات، ڈائرکٹوریٹ آف ویمن ایجوکیشن کی ابتدا، پھر دہلی، ممبئی اور پٹنہ میں ریجنل سینٹرس کی شروعات، 1999 میں گچی باؤلی حیدرآباد کیمپس کی تعمیر کا آغاز اور 2000 میں ڈپلوما ان ایجوکیشن کے ذریعے پہلے ریگولر کورس کی شروعات ہوئی۔ 2002 کے فروری میں اردو یونی ورسٹی کا دفتر گچی باؤلی کیمپس میں منتقل ہوا۔ اس مختصر تاریخی پس منظر کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ اب تک اردو یونیورسٹی کو چار وائس چانسلر جن میں تین سابقہ اور ایک موجودہ شامل ہیں، کی خدمات حاصل رہی ہیں۔ جن میں پروفیسر شمیم جیراجپوری کو انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ رہی کہ ایک یونیورسٹی جو صرف پارلیمنٹری ایکٹ کی شکل میں تھی اسے عملی جامہ پہناتے ہوئے کامیابی کے ساتھ زمینی سطح پر اتارا۔

یونیورسٹی کے دوسرے وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان نے جب مارچ 2004 میں عہدہ سنبھالا تو اس وقت یونیورسٹی شروعاتی دور سے گزر رہی تھی۔ انھوں نے مختلف شعبوں، مراکز کے قیام اور پروگراموں کی شروعات سے ترقیاتی دور کا آغاز کیا۔ یونیورسٹی کو نہ صرف حیدرآباد کے صدر مقام پر وسعت دی بلکہ اس کو قومی سطح پر توسیع دے کر متعارف کرایا۔ انھوں نے 6 اسکولز آف اسٹڈیز قائم کیے جن کے تحت اردو، انگریزی، ہندی، ترجمہ، عربی، فارسی، تعلیم نسواں، نظم ونسق عامہ، سوشل ورک، تعلیم و تربیت، کمپیوٹر سائنس وانفارمیشن ٹیکنالوجی، ترسیل عامہ و صحافت، انتظامیہ جیسے 13 شعبہ جات شروع کیے گئے جن میں کئی پیشہ ورانہ پروگرامس بھی شامل ہیں۔ قومی سطح پر پیشہ ورانہ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے حیدرآباد، بنگلور اور دربھنگہ میں آئی ٹی آئی اور پولی ٹکنک کالج (سچر کمیٹی سفارشات کے تحت) قائم کیے۔ اردو میڈیم اساتذہ تیار کرنے کے لیے بھوپال، دربھنگہ اور سری نگر میں کالج برائے تعلیم وتربیت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ فاصلاتی نظام تعلیم کو وسعت دیتے ہوئے دربھنگہ، رانچی، سری نگر، بھوپال، ممبئی، کولکاتہ میں چھ علاقائی مراکز اور جموں، امراوتی، لکھنؤ، سنبھل اور نوح میں پانچ ذیلی علاقائی مراکز قائم کیے گئے۔ حیدرآباد، دربھنگہ اور نوح (ہریانہ) میں ماڈل اسکول بھی قائم کیے گئے تاکہ نوودے ودیالیہ کی طرز پر اردو ذریعہ تعلیم کو فروغ دیا جاسکے۔ لینگویج پروگرام کے تحت لکھنؤ میں سیٹلائٹ کیمپس کا قیام عمل میں آیا جہاں اردو، فارسی، اور عربی میں پوسٹ گریجویشن کی سہولت دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی لائبریری، اوپن ایئر تھیئٹر، گیسٹ ہاؤس، اسٹاف کوارٹرز، طلبا و طالبات کے لیے تین ہاسٹل، دیگر اسکولس آف اسٹڈیز کی عمارتوں کی تعمیر ان کے دور میں ہوئی۔

پروفیسر پٹھان نے کئی خصوصی مراکز بھی قائم کیے۔ اردو میڈیم اساتذہ کو تدریس کے نئے اصول وضوابط اور طریقوں سے واقف کرانے اور تربیت دینے کے لیے مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذہ اردو ذریعہ تعلیم (CPDUMT) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ نصابی مواد کو آڈیو، ویڈیو شکل میں تیار کرنے کے لیے مرکز برائے تدریسی ذرائع ابلاغ (IMC) قائم کیا گیا۔ انھوں نے اردو زبان اور اس سے وابستہ تہذیب وثقافت کو فروغ دینے کے لیے مرکز برائے اردو زبان، ادب اور ثقافت قائم کیا جسے اب مرکز برائے مطالعات اردو ثقافت (CUCS) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یو جی سی اسکیم کے تحت مرکز مطالعات سماجی اخراجیت وشمولیت پالیسی (CSSEIP) اور مرکز برائے فروغ انسانی وسائل (اکیڈمک اسٹاف کالج) کی منظوری حاصل کی۔ اس کے علاوہ سول سرویسز کوچنگ اکادمی، یوجی سی نیٹ کوچنگ اور ریمیڈیل کوچنگ سینٹر کا قیام عمل میں لایا گیا۔ پروفیسر اے ایم پٹھان کے دور میں یونیورسٹی کی نہایت تیزی سے ترقی ہوئی۔

پروفیسر محمد میاں نے مئی 2010 میں اردو یونیورسٹی

کے تیسرے وائس چانسلر کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا۔ انھوں نے کئی سائنسی شعبوں کی شروعات کی۔ان کے دور میں اسکول برائے کمپیوٹر سائنس و انفارمیشن ٹیکنالوجی کی بنیاد رکھی گئی۔ بی ٹیک، ایم ٹیک، ایم سی اے اور کمپیوٹر سائنس میں ریسرچ پروگرام کی ابتدا ہوئی۔ شعبۂ کامرس کی بنیاد رکھی گئی۔ سماجی علوم میں کئی نئے شعبے جیسے سماجیات، اسلامیات، تاریخ، معاشیات وغیرہ کا آغاز ہوا۔ سائنس کے شعبوں میں طبعیات، کیمیا، حیوانیات کے شعبے کھلے اور بی ایس سی اور ایم ایس سی کے علاوہ ریسرچ (ریاضی) کی شروعات کی۔ دکنی ادب کی اہمیت و افادیت کے مد نظر ہارون خاں شیروانی مرکز برائے مطالعات دکن (HKCDS) قائم کیا گیا۔ نئی نسل کو مولانا ابوالکلام کی خدمات سے روشناس کرانے کے لیے آزاد چیئر کی شروعات کی گئی۔ نوح، بیدر، آسنسول، سنبھل اور اورنگ آباد میں کالج آف ٹیچر ایجوکیشن قائم کیے گئے، دلی میں سب ریجنل سینٹر قائم کیا گیا۔ سری نگر، دربھنگہ اور بھوپال میں ایم ایڈ کی شروعات ہوئی۔ کشمیر میں سری نگر کے قریب بڈگام کیمپس (بڈگام) شروع کیا گیا۔ سینٹر فار انفارمیشن ٹکنالوجی کا آغاز ہوا اور پوری یونیورسٹی میں وائی فائی انٹرنیٹ کی سہولت فراہم کی گئی۔

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے اکتوبر 2015 میں چوتھے وائس چانسلر کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا۔ انھوں نے اپنی پہلی ہی تقریر میں اردو یونیورسٹی کو اس کے مقاصد میں کامیابی دلانے اور اسے عالمی سطح کا معیاری ادارہ بنانے کے اپنے عزم کا اعلان کیا، اور ان عزائم کو پورا کرنے کے لیے وہ نہایت سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ اردو میں سائنسی علوم کا فروغ ہو۔ اس سلسلے میں اردو مرکز برائے فروغ علوم کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس کے تحت پہلی بار اردو سائنس کانگریس کا انعقاد بھی کیا گیا۔ اردو میں سائنسی و سماجی علوم کو ترقی دینے کے لیے اس مرکز کے تحت ہر سال اردو سائنس کانگریس اور اردو سوشل سائنس کانگریس کے انعقاد کے ساتھ ہی ریسرچ جرنل بھی شائع کرنے کا منصوبہ ہے۔

وائس چانسلر نے مختلف کمیٹیوں کی سفارشات اور ترجمہ نگاری کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر نظامت ترجمہ و اشاعت کی تشکیل نو کی ہے۔ اس کے تحت مختلف علوم کی نصابی کتابوں کی تیاری اور یونیورسٹی کے مختلف پروگراموں (رسمی و فاصلاتی نظام تعلیم) سے متعلق کتابوں کے ترجمے کا کام تیزی سے جاری ہے۔ طلبا کو سہولیات فراہم کرنے کے لیے کئی اہم اقدامات کیے گئے ہیں جن میں ایک اہم قدم ہاسٹلوں کی توسیع اور تعمیراتی کام کا آغاز ہے۔ اسکول برائے تجارت و کاروباری انتظامیہ اور اسکول برائے کمپیوٹر سائنس و انفارمیشن ٹیکنالوجی کی نئی عمارت کی تعمیر جلد ہی شروع ہونے والی ہے۔ اسکول برائے سائنسی علوم کی عمارت کی تعمیر کا کام بھی شروع کیا جائے گا جس میں سائنس کے تمام شعبے شامل ہوں گے۔ یونیورسٹی کے صدر دفتر کے علاوہ آف کیمپس میں بھی تعمیراتی کام کا آغاز ہو چکا ہے جن میں بھوپال، دربھنگہ اور سری نگر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اسکل ڈیولپمنٹ اور پروفیشنل کورسیز کے فروغ کے لیے کڑپا (آندھرا پردیش) اور کٹک (اڑیسہ) میں دو آئی ٹی آئی اور دو پولی ٹکنک کالجوں کے تعمیری کام کی اجازت یو جی سی سے مل چکی ہے، جو عنقریب شروع ہونے والا ہے۔ان مراکز میں تعلیمی سال 2018-19 سے پروگراموں کا آغاز ہو جائے گا۔

موجودہ وائس چانسلر نے یونی ورسٹی ایکٹ کے مطابق اساتذہ اور دیگر اسٹاف کی تقرری اور طلبا کے داخلے میں اردو کے لزوم کو سختی سے نافذ کیا ہے اور اس کے نفاذ میں کسی بھی طرح کی رعایت یا تساہلی کو نا قابل قبول قرار دیا ہے۔ مدارس سے تعلیم یافتہ طلبا کو مرکزی دھارے سے جوڑنے کے لیے یونیورسٹی نے 218 مدارس کی اسناد کو داخلے کے لیے تسلیم کیا ہے، جس کے تحت مدارس کے طلبا کی بڑی تعداد ریگولر اور فاصلاتی نظام کے تحت تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ مدارس کے طلبا کو سائنس و سماجی علوم کی طرف لانے کے لیے برج کورس برائے سائنس و سوشل سائنس کی بھی شروعات کی گئی ہے تاکہ وہ سائنسی علوم کی طرف راغب ہو سکیں۔

یونیورسٹی نے ڈیجیٹائزیشن اور ای گورننس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے داخلے و امتحانات کے مراحل، انتظامی و مالی امور اور تمام تفصیلات کو آن لائن/ ڈیجیٹائز کر دیا ہے۔

تحقیق کو مزید وسعت دینے کے لیے حال میں شروع ہونے والے شعبوں یعنی حیوانیات، معاشیات، تاریخ، سیاسیات، کامرس، سماجی علوم میں ریسرچ پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی مانو کے سیٹلائٹ کیمپس (لکھنؤ، سری نگر) اور کالج آف ٹیچر ایجوکیشن (دربھنگہ، بھوپال اور سرینگر) میں بھی ریسرچ کی شروعات کی گئی ہے۔

نظامت فاصلاتی تعلیم کے تحت یونیورسٹی نے ملکی سطح پر اردو کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ جس کے لیے نو علاقائی مراکز دہلی، پٹنہ، بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، سری نگر، کولکاتا، ممبئی اور رانچی میں قائم ہیں جبکہ تین ذیلی مراکز جموں، امراوتی و حیدرآباد میں ہیں۔ تمام علاقائی مراکز کے 158 اسٹڈی سینٹرس 17 صوبوں اور مرکز کے زیر انتظام خطوں میں قائم ہیں۔ ماضی میں سعودی عرب میں اگزام سینٹر بھی قائم کیا گیا تھا تاکہ خلیجی ممالک میں اردو کو فروغ دیا جا سکے۔ اس طرح دیکھا جائے تو ہندوستان میں موجود فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت تعلیم دینے والی یونیورسٹیوں میں اندرا گاندھی اوپن یونی ورسٹی، دہلی کے بعد مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا سب سے بڑا نیٹ ورک ہے۔

نظامت فاصلاتی تعلیم کے تحت چلائے جا رہے پروگراموں میں بی اے، بی کام، بی ایس سی (لائف سائنس و فیزیکل سائنس)، ایم اے (اردو، تاریخ، انگریزی، اسلامیات)، ڈپلوما ان ایجوکیشن، ڈپلوما ان میوزیالوجی، ڈپلوما ان ٹورزم مینجمنٹ، ڈپلوما ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن، ڈپلوما ان ٹیچ انگلش، سرٹیفکٹ کورس ان فوڈ اینڈ نیوٹریشن، سرٹیفکٹ کورس ان فنکشنل انگلش، سرٹیفکٹ پروفیشینسی ان اردو بذریعہ انگریزی، سرٹیفکیٹ

پروفیشینسی ان اردو بذریعہ ہندی، سرٹیفکٹ ان کمپیوٹنگ ہیں۔ ان تمام کورسیز میں اس وقت تقریباً 40,000 طلبا نظامت فاصلاتی تعلیم کے تحت رجسٹرڈ ہیں۔

نظامت فاصلاتی تعلیم کے تحت چلائے جارہے پروگراموں سے اب تک تقریباً ڈھائی لاکھ طلبہ نے استفادہ کیا ہے۔ جن میں 45.5 فیصد طالبات بھی شامل ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نظامت فاصلاتی تعلیم کا نظم نہ ہوتا تو شاید وہ خواتین تعلیم یافتہ نہ ہو پاتیں جو مختلف وجوہات کی بنیاد پر گھر سے باہر نکلنے سے قاصر ہیں۔

اردو یونیورسٹی کی کوشش یہ بھی رہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اردو زبان اور اردو میڈیم میں پڑھانے والے افراد تیار کرے تاکہ اردو کو ہر سطح پر ترقی دی جاسکے۔ اسی سلسلے میں رسمی طرز تعلیم کے ساتھ ساتھ نظامت فاصلاتی تعلیم نے اسکول میں پڑھانے والے اساتذہ کو تربیت دینے کے لیے بی ایڈ اور ڈی ایڈ جیسے پروفیشنل کورسیز کا آغاز کیا ہے، جس میں بڑی تعداد میں ملازمت میں موجود اساتذہ داخلہ لے کر اپنی صلاحیت کو نکھارنے کے ساتھ ساتھ بچوں کو اچھی تربیت دینے کے قابل ہو سکے ہیں۔ ابھی تک بی ایڈ (فاصلاتی تعلیم) پروگرام سے تقریباً آٹھ ہزار افراد نے استفادہ کیا ہے جبکہ رسمی طرز تعلیم کے ذریعے تقریباً سات ہزار اساتذہ نے تربیت حاصل کی ہے۔

فی الوقت یونیورسٹی اپنی ترقی کے منازل طے کر رہی ہے۔ اس وقت شہر حیدرآباد میں یونیورسٹی کا 200 ایکڑ پر پھیلا ہوا وسیع کیمپس ہے جو 7 اسکولوں کے تحت 24 شعبہ جات پر مشتمل ہے۔ ریسرچ و ٹریننگ کے لیے کئی خصوصی مراکز بھی ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ صدر دفتر کے علاوہ ملک کے 9 مختلف صوبوں میں پالی ٹکنک کالجز، صنعتی تربیتی ادارے اور مانو ماڈل اسکولوں کے بشمول کل 17 بیرون کیمپس ادارے ہیں۔ صدر دفتر و بیرون کیمپس میں بی اے، بی ایس سی، بی کام، بی ایڈ، بی ٹیک، پوسٹ گریجویشن، ایم فل اور پی ایچ ڈی (لنگویجیز، سماجی علوم، سوشل ورک، ایجوکیشن، سائنسیز، کمپیوٹر سائنس، کامرس، بزنس ایڈمنسٹریشن، کمیونکیشن وجرنلزم) کے علاوہ متعدد ڈپلوما پروگرام جیسے ڈپلومہ ان پولیٹکنک، ڈی ایل ایڈ، اور اردو، عربی، فارسی و ہندی میں ڈپلوما و سرٹیفکیٹ پروگرام چل رہے ہیں۔ ان کے علاوہ فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت چلنے والے کئی پروگرامس ہیں جن کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ اردو یونیورسٹی نے صرف بیس سال کے وقفے میں 62 کورسیز شروع کیے ہیں اور چھ ہزار سے زائد طلبا (بذریعہ رسمی طرز تعلیم) ہر سال یہاں سے استفادہ کر رہے ہیں۔ تمام کورسیز کی فیس نہایت ہی کم رکھی گئی ہے جن میں پیشہ ورانہ کورسیز بھی شامل ہیں۔ جس کی وجہ سے مالی طور پر غریب طلبا کی نوے فیصد تعداد یہاں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

اردو یونیورسٹی نے دو دہائیوں میں مختلف منازل سے گزرتے ہوئے قومی سطح پر اپنی ایک شناخت قائم کرلی ہے۔ 2009 اور 2016 میں NAAC سے اے گریڈ حاصل کر چکی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کو رینکنگ دینے والی نیشنل انسٹی ٹیوشنل رینکنگ۔ فریم ورک (NIRF) کے ذریعے 2017 میں دی گئی رینکنگ میں اردو یونی ورسٹی کو پبلی کیشن میں چوبیسواں اور سائٹیشن میں تیسواں مقام حاصل رہا ہے۔ جملہ کارکردگی کی بنیاد پر دی گئی رینکنگ میں 800 یونی ورسٹیوں میں سے اولین 150 یونی ورسٹیوں میں اپنا نام درج کرالیا ہے۔

موجودہ دور میں عالمی سطح پر یونیورسٹیوں کے درس و تدریس کے طریقۂ کار اور کورسیز میں بڑی تیزی سے تبدیلی آرہی ہے۔ اس لیے اردو کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ اردو یونی ورسٹی مزید تکنیکی، پیشہ ورانہ اور اسکل بیسڈ کورسیز جیسے انجینئرنگ، فائن آرٹس، سائنسز، اپلائڈ سائنسیز پروگرامس شروع کرے۔ اس سے جہاں فارغین خاص کر اردو کا پسماندہ طبقہ ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے گا وہیں اردو میں ان تمام سبجیکٹ میں کام ہو سکے گا۔ اردو میں مختلف مضامین کی کتابیں تیار کرنے کے لیے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (این سی ای آر ٹی) اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جیسے اداروں سے اشتراک کی بھی ضرورت ہے جو اس میدان میں کام کر رہے ہیں۔ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والوں میں بڑی تعداد مدارس کے فارغین کی ہے۔ اس لیے مدارس سے فارغ طلبا کو مرکزی دھارے میں لانے کے لیے مزید اقدامات پر غور کرنا چاہیے۔ اردو یونیورسٹی نے صدر دفتر کے علاوہ قومی سطح پر کئی مراکز قائم کر لیے ہیں۔ اب ضروری ہے کہ ان مراکز کو مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ معیار کو مزید بہتر بنایا جائے۔ اساتذہ کو ریسرچ کی طرف متوجہ کی جائے۔ ریسرچ کے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے اسے مزید وسعت دی جائے۔ اس سے جہاں یونی ورسٹی کو ریسرچ سے پہچان حاصل ہوگی وہیں یونی ورسٹی کی گریڈنگ مزید بہتر ہو سکے گی۔ جدید ٹیکنالوجی سے درس و تدریس میں اہم تبدیلی آئی ہے۔ یونی ورسٹی کے ہر کام میں ٹیکنالوجی کا استعمال بڑھتا جارہا ہے۔ ایسے میں اردو طبقہ اور یونی ورسٹی کو بھی بدلتے حالات کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات

گجرال، آئی کے (1975)، رپورٹ آن کمیٹی پروموشن آف اردو، سمیٹڈ ٹو منسٹری آف ایجوکیشن، گورنمنٹ آف انڈیا 269 صفحات

ایم ایچ آر ڈی (1993)، رپورٹ آف دی کمیٹی آن اسٹیبلشمنٹ آف اردو یونی ورسٹی، ایم ایچ آر ڈی، گورنمنٹ آف انڈیا، 75 صفحات

دی مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی ایکٹ، 1996 (نمبر 2 آف 1997)، آفیشیل گزٹ آف انڈیا

Gural, I.K. (1975). Report on Committee for Promotion of Urdu submitted to Ministry of Education, GOI., 269 pages.

MHRD (1993). Report of the Committee on Establishment of Urdu University, MHRD, GoI, 75 Pages

The Maulana Azad National Urdu University Act, 1996 (No. 2 of 1997), Official Gazette of India.

■

Prof. P.F. Rahman
Head, Dept of Zoology
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad - (Telangana)
Mobile No. 9490105324
Email: rahman_f@rediffmail.com

اردو خطوط نویسی
کی تاریخ، فن اور نمائندہ خطوط نگار

وہاب عندلیب

اردو کی ادبی اصناف نثر میں خطوط نویسی بھی نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ خطوط نویسی کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ کاغذ کی ایجاد سے قبل خطوط درخت کے پتوں، چمڑے، مٹی کی لوحوں اور دھات کی پلیٹوں پر لکھے جاتے تھے۔ خطوط نویسی کا باقاعدہ آغاز سلطنت روم میں سسرو کے زمانے میں ہوا۔ سسرو کے مکاتیب میں اس دور کی معاشرت کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ رومیوں کے مکاتیب کی زبان خطیبانہ اور روزمرہ کی بول چال کے مطابق ہے۔ انگلستان میں خطوط نویسی کا آغاز اطالوی زبان کے ترجموں سے ہوا۔ پندرہویں صدی میں خطوط نویسی کا آغاز ہوا، جیمس ہاؤل (James Hawl) کو انگلستان میں مکتوب نگاری کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے۔ جون ہیرن ٹن (John Heron Tun) (جو ملکہ کے درباریوں میں سے تھا) کے خطوط زندگی آمیز تھے کیونکہ ان میں بلاغت کی چاشنی کم تھی۔ اٹھارہویں صدی کے ادیب ولیم کاؤپر (William Coper) اور مشہور شاعر گرے (Grey) کے خطوط بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ رومانی دور میں چارلس لیمب (Charles Lamb) کیٹس، شیلی (Shelly) اور بائرن کے خطوط انگریزی زبان کا ادبی سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔ لاطینی زبان میں ہورییس اور سسرو انگریزی میں ملٹن، بیکن ملکۂ وکٹوریہ، کاوپر گولڈ اسمتھ، بائرن، لارڈ چسٹر فیلڈ، فرانسیسی میں والیر ورڈیڈو وغیرہ کے خطوط نثر کے بہترین نمونے سمجھے جاتے ہیں۔

جہاں تک اسلامی تاریخ کا سوال ہے۔ پیغمبر اسلام حضور اکرمؐ نے خود حکومت کے سربرآوردہ اصحاب کو خطوط لکھے تھے۔ حضور اکرمؐ سے قبل بھی پیغمبروں میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا خط بادشاہ مصر کے نام، حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ملکہ سبا بلقیس کے نام (992 تا 924) ق م کا پتہ چلتا ہے۔ مسلمانوں کے دور میں فن خطوط نویسی کو فروغ حاصل ہوا۔ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ نے ایک مستقل محکمۂ انشا کی بنیاد ڈالی۔ خلافتِ امیہ و خلافت عباسیہ دونوں نے فنِ خط نویسی کو ترقی دی، خلافت عباسیہ کے بعد اسلامی ایشیا میں جب مغلوں کی حکومت قائم ہوئی تو عربی کے بجائے فارسی کو دفتری زبان کا درجہ حاصل ہوا تو خطوط بھی عربی کے بجائے فارسی میں لکھے جانے لگے۔ رقعات ابوالفضل، رقعات عالمگیر، انشا مادھورام، فائق، میر بہار نجم وغیرہ فارسی کے مکاتیب ہیں جو ہندوستان میں تحریر کیے گئے۔ اقبال بلگرامی کی تحقیق کے مطابق فارسی خطوط نگاری ایران سے زیادہ ہندوستان میں پروان چڑھی۔ جب اردو میں خط نویسی شروع ہوئی تو اس پر فارسی خطوط کا گہرا اثر تھا۔

دیگر اصناف ادب کی طرح خط نویسی کے اولین نمونے دکن ہی میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللطیف اعظمی کے غیر مطبوعہ مقالے 'اردو مکتوب نگاری' کے حوالے سے اردو کا پہلا خط 6 دسمبر 1822 میں تحریر کیا گیا تھا جس کے کاتب، والا جاہ بہادر نواب کرناٹک کے صاحب زادے حسام الملک بہادر تھے جنھوں نے اپنی بھابی نواب بیگم کے نام خط لکھا تھا۔ اردو مکتوب نگاری: ایک جائزہ (1800 تا 1950) کی مصنفہ ڈاکٹر لیس۔ نسیم بانو نے ایک اور اردو کے پہلے خط مرقومہ 1803 کا ذکر کیا ہے جو فقیر بیگم مرزا مغل کا لکھا ہوا ہے۔ (ص 59)

اردو کے قدیم ترین خطوط نظم کی ہیئت میں بھی ملتے ہیں۔ 1806 سے قبل شیر محمد خاں ایمان نے نامہ منظوم لکھا۔ منظوم خطوط 1761 سے قبل دو آصف جاہی منصب دار مرزا علی یار بیگ اور میر ابراہیم جیو کے بھی دریافت ہوئے ہیں، یہ خطوط ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد کی قلمی بیاض 130 میں محفوظ ہیں۔ (تذکرہ مخطوطات جلد 5، ص 289)

خط عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لکیر، سطر یا تحریر کے ہیں۔ یہ لفظ مکتوب اور نامہ کے طور پر بھی مستعمل ہونے لگا۔ بقول خورشید الاسلام ''خط حسنِ اتفاق کا نام ہے اور حسنِ اتفاق ہی سے یہ ادب کی ایک صنف ہے۔'' خطوط نگاری یقیناً ایک فن ہے، ایسا فن جس کے ذریعے ہم خط نویس کی شخصیت اور اس کے مزاج سے آشنا ہوتے ہیں۔ یہ فن نزاکت اور تصنع و آرائش سے پاک ہوتا ہے۔ خط دراصل دو افراد کے درمیان ترسیل و ابلاغ کا اہم وسیلہ ہے۔ خط دو اشخاص کے درمیان دوری کو قربت میں بدل دیتا ہے جیسے کہہ رہا ہو

خود اپنے سے بھی چھپایا ہے مدتوں جس کو
قریب آؤ کہ تم سے وہ بات کہتا ہوں

(حرمت الاکرام)

خط دراصل ہجر میں وصال کی لذتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ خطوط نویسی سے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی شخصیتوں میں باہمی ربط فروغ پاتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے اسے دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ قرار دیا ہے۔ خطوط کے مطالعے سے خط نویس کی شخصی زندگی اور نجی حالات سے آگہی ہوتی ہے بقول ندا فاضلی

دیوار و در سے اتر کر پرچھائیاں بولتی ہیں
کوئی نہیں بولتا جب تنہائیاں بولتی ہیں

اس کے علاوہ ہم ان خطوط سے اس دور کے سماجی و سیاسی حالات، اصلاحی تحریکوں اور ادبی سرگرمیوں سے باخبر ہوتے ہیں۔ خطوط کا انحصار خط نویس کی صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔ دلچسپ خطوط وہ ہوں گے جن میں غیریت و اجنبیت کا پردہ نہ ہو بلکہ بے تکلفی اور اپنائیت کی فضا پائی جائے۔ خط کی زبان خشک، نامانوس اور مقفّٰی و مسجع نہ ہو بلکہ عام فہم اور رواں دواں ہو۔ خط نویس کو چاہیے کہ وہ گفتگو کی زبان کو اپنائے کیونکہ یہی خوبی خط نویسی کا فن ہے۔ ان ہی گوناگوں خصوصیات کے باعث رشید احمد صدیقی نے خط نویسی کو فنون لطیفہ میں شامل کیا ہے۔ کامیاب خطوط فلسفیانہ مباحث اور استدلال سے مبرا ہوتے ہیں۔ ان میں چھوٹی چھوٹی سی باتیں رنگارنگی اور تنوع سے معمور ہوتی ہیں۔ ایک کامیاب خط نویس جزو کو کل بنانے کے ہنر سے آشنا ہوتا ہے۔ خط کی نزاکت، کاری گری، اختصار و وسعت کے باب میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے یہ الفاظ سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

''خط نویسی بڑا ہی نازک فن ہے۔ یہ کاری گری بھی ہے اور آئینہ سازی بھی، یہ مختصر اور محدود بھی اور وسیع و بیکراں بھی ہے۔ یہ حد سے زیادہ شخصی بھی ہے مگر اس کے باوجود آفاقی اور اجتماعی بھی۔ اس میں دانش بھی ہے اور بینش بھی، یہ لکھنے والے کے لیے تو محض عرض سخن مگر پڑھنے والے کے لیے گنجینۂ فن بھی ہوسکتا ہے۔''

ابتدا میں اردو خطوط نویسی فارسی خطوط نویسی سے متاثر رہی اس لیے اسلوب بیان میں صنائع بدائع کی کثرت مقفّٰی و مسجع عبارتوں کی بہتات، تشبیہوں اور استعاروں کی بھرمار، القاب و آداب کی طوالت ان خطوط کا جزو بنی رہی۔ مکتوب احمدی و محمدی، رقعات عنایت علی، انشا اردو سرور وغیرہ اردو کے ابتدائی خطوط کے مجموعے ہیں۔ ہماری زبان میں خط نویسی کی باقاعدہ ابتدا غالب سے ہوتی ہے۔ حالی نے بھی یادگار غالب میں 1850 کو اردو خط و کتابت کا ابتدائی سال مانا ہے۔ غلام امام شہید، غلام غوث بے خبر اور قتیل جو غالب ہی کے ہمعصر تھے مگر ان کا اسلوب، غالب سے جداگانہ تھا یعنی وہ پرانی روش پر قائم تھے۔ غالب سے پہلے ایک نام رجب علی بیگ سرور کا بھی ہے۔ رجب علی بیگ سرور کے مجموعہ مکاتیب انشائے سرور کو مرزا احمد علی نے 1886 میں لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔ ان مکاتیب میں کہیں سادگی تو کہیں مقفّٰی و مسجع عبارت کی فراوانی ہے۔ غلام غوث بے خبر کے دو مجموعہ ہائے مکاتیب ایک 'فغان بے خبر' اور دوسرا 'انشائے بے خبر' کا پتہ چلتا ہے۔ اول الذکر ناپید ہے آخر الذکر 1960 میں علی گڑھ سے شائع ہوا۔ ان خطوط پر بھی فارسی کی گہری چھاپ ہے مگر ان میں سادگی اور روانی بھی ہے۔ اس دور میں جبکہ اردو خطوط نویسی پر فارسیت کا غلبہ تھا، عربی، فارسی کے مشکل و غیر مانوس الفاظ و تراکیب مقفّٰی و مسجع عبارت آرائی، پرپیچ اسلوب بیان اور طویل القاب کا استعمال عام تھا۔ مرزا غالب کے ساتھ ساتھ سرسید، حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، مہدی افادی، علامہ اقبال، نیاز فتح پوری، مولانا آزاد، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی وغیرہ کے خطوط کی وجہ سے خطوط نویسی میں غیر معمولی تبدیلی و ترقی عمل میں آئی۔ ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کا تاریخی، سیاسی و سماجی نظریہ کیا تھا۔ یوں تو غالب سے لے کر تا حال کئی ادیبوں کے خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ راقم الحروف یہاں چند ایسے خطوط نگار اور ان کے خطوط کے امتیازات کا ذکر کر رہا ہے جو اردو ادب میں نمائندہ خطوط نویس سمجھے جاتے ہیں۔ ابتدا مرزا غالب سے کی جارہی ہے۔

مرزا غالب

مرزا غالب کے متعدد خطوط کے مجموعے شائع ہوچکے ہیں ان میں مہر غالب (مرتبہ عبدالغفور 1862)، انتخاب غالب (1866)، عود ہندی (مرتبہ منشی علی خاں 1868)، اردوئے معلّٰی (مرتبہ حکیم غلام رضا خاں 1869)، مکاتیب غالب (مرتبہ امتیاز علی عرشی 1937)، خطوط غالب (مرتبہ مہیش پرشاد 1941)، خطوط غالب (مرتبہ: غلام رسول مہر 1951) غالب کے خطوط (مرتبہ خلیق انجم 1984)، اہمیت کے حامل ہیں۔ غالب کے یہ خطوط 1829 سے 1848 تک کا احاطہ کرتے ہیں۔ مولانا حامد حسین قادری نے غالب کے اردو خطوط کی تعداد تقریباً 825 بتائی ہے جبکہ کاظم علی خاں کے مطابق ان خطوط کی تعداد 873 ہے۔ جن خطوط نویسوں کو خط نویسی میں منفرد و اعلیٰ مقام حاصل ہوا ان میں غالب سرفہرست ہیں۔ ان کے خطوط تکلف سے برتر، تصنع سے بے نیاز اور مبالغے سے پاک ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریر کو تقریر کا آئینہ اور مراسلے کو مکالمہ بنادیا۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ خلیق انجم کے ان الفاظ سے غالب کی خط نویسی اس کی رنگارنگی اور تنوع کا پتہ چلتا ہے۔

''غالب کے خطوط میں تجربات و احساسات کی رنگارنگی ہے۔ اجتماعی تجربے بھی ہیں اور ذاتی وارداتیں بھی۔ ایک فرد کی آواز بھی ہے اور پورے عہد کی گونج بھی۔ خطوط غالب اس عہد کے ہندوستان کی تاریخ میں رونما ہونے والی اہم ترین سیاسی، سماجی اور تہذیبی، فکری اور جذباتی تبدیلیوں کا ردعمل بھی ہیں اور ایک فرد کی مایوسیوں، شکستوں اور ناکامیوں کی داستان بھی۔''

سرسید احمد خاں (1817 تا 1898)

اردو نثر کو آسان اور رواں دواں بنانے میں سرسید کے مضامین اور خطوط بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے خطوط کے مجموعوں میں سرسید احمد خاں کے خطوط (مرتبہ وحیدالدین)، انتخاب مکاتیب (مرتبہ راس مسعود)، انتخاب مکاتیب (شیخ اسماعیل پانی پتی) اور مکاتیب سرسید احمد خاں (مرتبہ مشتاق حسین) کو خصوصیت حاصل ہے۔ سرسید کے خطوط ان کے اخلاق و عادات، اعتقادات و نظریات اور تحریکات کا خزانہ ہیں۔ ان کے خطوط میں سادگی، سلاست اور جامعیت ملتی ہے۔ انھوں نے غالب کی طرح وقت گزاری یا دوستوں سے گفتگو کے لیے خطوط نہیں لکھے بلکہ اپنے مقصد، اعتقادات، نظریات و تحریکات کو دوسروں تک پہنچانے کے مقصد سے خطوط لکھے۔ وہ اپنے خطوط میں قوم کی نااہلی پر افسوس کرتے ہیں۔ گھر میں اولاد کی تعلیم و تربیت باقاعدہ نہ ہونے پر نالاں نظر آتے ہیں۔ اپنی قوم کو راہ راست پر لانے کی بات کرتے ہیں۔ لوگوں کی جانب سے ان پر الزام آرائی کے باوصف ان کی دل سوزی و محبت جو قوم سے تھی اس میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ خواجہ احمد فاروقی نے بجا کہا ہے۔

''خطوط سرسید، مرحوم کی تمام زندگی اور ان کی عملی جدوجہد کے بھی آئینہ دار ہیں۔ سرسید کو اپنی درماندہ قوم سے بڑی محبت تھی اور ان کا کوئی لمحہ اصلاح و درستگی کے خیال سے علاحدہ نہیں ہوتا تھا۔''

الطاف حسین حالی:

مولانا الطاف حسین حالی کے فرزند خواجہ سجاد حسین نے دو مجموعہ ہائے خطوط 1925 میں شائع کیے تھے۔ حالی کے خطوط کا ایک اور مجموعہ اسماعیل پانی پتی نے مکاتیب حالی کے عنوان سے شائع کیا۔ اس میں (111) اردو (38) عربی و فارسی خطوط شامل ہیں۔ بیشتر خطوط قرابت داروں اور عزیزوں کے نام، چند خطوط دوستوں اور ہم عصروں کے نام بھی ہیں۔ بعض خطوط ادبی نوعیت کے ہیں۔ حالی کے مکاتیب میں غالب اور شبلی کے مکاتیب کی طرح رنگینی اور شوخی نہیں ملتی بلکہ سرسید کی تحریروں کی طرح

سادگی اور قطعیت (Clarity) نظر آتی ہے۔ سرسید اور ان کے رفقا علی گڑھ تحریک (اصلاحی تحریک) سے وابستہ تھے۔ ان لوگوں نے نظم نثر کو قومی اصلاح کا ذریعہ بنایا، اس لیے حالی کے خطوط اصلاحی پہلو لیے ہوئے ہیں۔ حالی کی سیرت و شخصیت کا عکس ان کے مکاتیب میں دکھائی دیتا ہے۔ حالی کی طرز نگارش کے بارے میں عبدالقوی دسنوی یوں رقمطراز ہیں:

''حالی سادہ دل تھے اسی لیے ہمیشہ قلم کے بھی سادہ رہے۔ ان کی ہر نگارش میں سادگی اور خلوص کی جھلک ملتی ہے۔''

شبلی نعمانی:

مکاتیب شبلی کو اپنے ایجاز و اختصار، تازگی و شگفتگی اور عالمانہ وقار کی بنا پر غیر معمولی اہمیت حاصل ہے ان کے خطوط کے دو مجموعے مکاتیب شبلی اور خطوط شبلی کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ مکاتیب شبلی، شبلی کی زندگی میں ترتیب دیا گیا لیکن 1914 میں شبلی کی وفات کے بعد دو جلدیں شائع ہوئیں۔ دونوں جلدیں سید سلیمان ندوی کی ترتیب دی ہوئی ہیں۔ مکاتیب شبلی میں سرسید، حبیب الرحمٰن خاں، پروفیسر عبدالماجد دریابادی، ابوالکلام آزاد اور مہدی افادی کے نام خطوط شامل ہیں۔

'خطوط شبلی' میں بمبئی کی روشن خیال خواتین زہرا بیگم اور عطیہ بیگم کے نام خطوط ہیں۔ شبلی ایک زبردست عالم دین، مورخ، نقاد ہونے کے علاوہ باکمال شاعر اور انشا پرداز بھی تھے۔ اسی لیے ان کے مکاتیب میں بھی ان کی شخصیت کے مختلف رنگوں کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ شبلی القاب و آداب کی پرواہ کیے بغیر اکثر بلا تمہید اپنا مدعا شروع کر دیتے تھے۔ مولانا ہر شخص سے اس کے مذاق اور تعلقات کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے خطوط میں سادگی، بے ساختگی اور عالمانہ تمکنت کے ساتھ شوخی گفتار اور طنز و مزاح کے عناصر بھی موجود ہیں۔ دلکشی اور عالمانہ شکوہ کے باعث ان کے خطوط کا شمار ادب پاروں میں ہوتا ہے۔ قاری فارسی اور اردو اشعار سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ عبداللطیف اعظمی نے لکھا ہے کہ اردو زبان میں بہترین خطوط وہ ہیں جو شبلی نے زہرا بیگم و عطیہ بیگم کو لکھے ہیں۔ یہ وہ خطوط ہیں جو 'خطوط شبلی' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ عطیہ بیگم سے خط و کتابت کا سلسلہ فروری 1908 سے 1911 تک جاری رہا اور زہرا بیگم سے مراسلت اکتوبر 1914 یعنی شبلی کی وفات سے ایک ماہ پہلے تک جاری تھی۔ عطیہ بیگم کے خطوط میں بہ نسبت زہرا بیگم کے کچھ بے تکلفی کا احساس زیادہ ہے۔ زہرا بیگم کے خطوط شوخی اور بے تکلفی سے مبرا تھے۔ الغرض شبلی نعمانی کے وہ خطوط جو عطیہ فیضی، زہرا بیگم کے علاوہ اپنے ہم عصروں مولانا ابوالکلام آزاد، مہدی افادی اور حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام لکھے گئے، ان میں خلوص و محبت کا جذبہ کارفرما ہے۔ بقول مہدی افادی ''ان کی شستہ اور نہایت پاکیزہ تحریروں میں یہ رنگ اور نکھر جاتا تھا۔ شراب محبت تھی جو کھنچ کھنچا کے دو آتشہ ہو جاتی ہے۔''

مہدی افادی:

اردو ادب میں مہدی افادی 'افادات مہدی' اور 'مکاتیب مہدی' کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اول الذکر ان کے مضامین کا مجموعہ اور دوسرا ان کے خطوط کا۔ مہدی کی وفات کے بعد ان کی بیگم نے دو خطوط کے مجموعے شائع کیے۔ پہلا مجموعہ 'مکاتیب مہدی افادی' 1938 میں شائع ہوا اور دوسرا 1961 میں۔ احباب کے علاوہ انھوں نے اپنی اہلیہ کے نام بھی کافی خطوط لکھے۔

مہدی افادی شبلی کے رنگ کے مداح اور انھیں کے پیرو تھے۔ ان کے ہر خط میں ادبیت کی چاشنی موجود ہے۔ ان کے خطوط میں سادگی کے ساتھ شوخی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ ان کے خطوط ادب پارہ بھی ہیں اور اپنے زمانے کی ادبی تاریخ کا حصہ بھی۔ ان کے خطوط دلی جذبات، احساسات اور کیفیات سے پر ہیں۔ ان کے خطوط میں ان کی شخصیت پوری طرح جلوہ گر ہے۔ ان کے خطوط کے مطالعے سے ان کے مزاج اور ان کی پسند و ناپسند اور ان کی دلچسپیوں کا بھی بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔

بقول احمد سرور ''مولویوں کے سامنے رندانہ وضع اور رندوں کی محفلوں میں سنجیدگی کے تیور یہ عجیب و غریب اجتماع مہدی کے ہاں ملے گا۔''

بیسویں صدی میں اردو خط نویسی ایک نئے رجحان اور اپنے ترقی پسند نظریات سے متاثر کرتی ہے۔ اس صدی کے نمائندہ خط نویس علامہ اقبال ہیں۔

علامہ اقبال

علامہ اقبال نے اردو ادب میں خطوط کی شکل میں نثری تحریرات کا وسیع ذخیرہ چھوڑا ہے۔ اقبال کی ادبی زندگی کے چالیس سال میں کئی خطوط منظر عام پر آ چکے ہیں۔ 1942 سے 1989 تک چودہ مجموعہ ہائے مکاتیب منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں دو انگریزی زبان میں بھی ہیں۔

(1) شاد اقبال (مرتبہ: ڈاکٹر محی الدین قادری زور)، 1942

(2) اقبال نامہ حصہ اول (مرتبہ: شیخ عطاء اللہ)، 1945

(3) خطوط اقبال بنام عطیہ فیضی (انگریزی)، 1947

(4) اقبال نامہ حصہ دوم (مرتب: شیخ عطاء اللہ)، 1951

(5) مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خاں، 1954

(6) مکتوبات اقبال، بنام سید نذیر بناری، 1957

(7) انوار اقبال (مرتبہ: بشیر احمد ڈار)، 1967

(8) لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال (انگریزی) مرتبہ بشیر احمد ڈار، 1967

(9) مکاتیب اقبال مرتبہ عبداللہ قریشی، 1929

(10) نوادر اقبال بنام مہاراجہ کرشن پرشاد، مرتب: عبداللہ قریشی، 1975

(11) خطوط اقبال، مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی، 1972

(12) جہان دیگر، مرتبہ: فرید الحق 1972

(13) روح مکاتیب: محمد عبداللہ قریشی، 1977

(14) کلیات مکاتیب اقبال: سید مظفر حسین برنی، 1989

علامہ اقبال کے اردو مجموعہ ہائے مکاتیب کی تعداد ایک درجن ہے اور مکاتیب کی تعداد ایک ہزار تین سو سے متجاوز ہے۔ ان کے مکاتیب کا کوئی مجموعہ ان کی حیات میں شائع نہیں ہوا۔ وہ اپنے خطوط کی اشاعت نہیں چاہتے تھے کیونکہ اکثر خطوط عجلت اور رواداری میں لکھے جاتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ نظر ثانی کے بغیر ان کی اشاعت نہ ہو۔ اقبال اپنے خطوط کے جواب پابندی سے دیا کرتے تھے، اس خصوص میں ممتاز حسن لکھتے ہیں: ''مجھے کسی ایسے شخص کا علم نہیں جس نے اقبال کو خط لکھا ہو مگر جواب سے محروم رہا۔''

اقبال کا پہلا خط احسن مارہروی کے نام 28 فروری 1899 کا ہے۔ ان کی خطوط نویسی کا سلسلہ وفات سے ایک روز پہلے تک بھی جاری رہا۔ ان کے مکتوبات (39) برسوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اقبال نے اپنے خطوط میں علمی، تاریخی، معاشی، فلسفیانہ، قرآن، حدیث، فقہ، تصوف، دین و شریعت کی باتیں کی ہیں۔ تحریکوں پر تبادلہ خیال، اپنے کلام کی وضاحت، نظریہ خودی، نوجوانوں سے خطاب، شاہین کا تصور، جہاد زندگی پر مفصل اور مدلل بحث کی ہے۔ ان کے خطوط سادگی اور عالمانہ شان سے پر ہیں۔ انھوں نے بے جا تکلف اور حشو و زوائد سے اجتناب برتا ہے۔ وہ صرف اپنے مطلب کی بات علمی عبارت میں ادا کرتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر عبدالحق ''ان کے خطوط میں مختلف علمی، ادبی، فکری اور مذہبی موضوعات زیر بحث آئے ہیں اور ایسے موضوعات بھی جو اقبال کے تحت الشعور میں تو تھے مگر شاعری میں کسی مناسب عنوان سے ظاہر نہ ہو سکے وہ بھی خطوط میں موجود ہیں۔''

مولانا آزاد:

مولانا آزاد کے خطوط اردو ادب کی تاریخ میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ مولانا آزاد کے حسب ذیل

خطوط کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں: (1) کاروانِ خیال، (2) غبارِ خاطر، (3) مکاتیب ابوالکلام آزاد، (4) نقشِ آزاد، (5) تبرکاتِ آزاد، (6) میرا عقیدہ

ابوالکلام آزاد کے خطوط کی ابتدا ان کے مجموعے 'کاروانِ خیال' سے ہوتی ہے۔ 1940 میں خطوط لکھے گئے۔ ان خطوط میں دوستوں سے رفاقت، خلوص و عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ بعض خطوط سے غالب کی یاد تازہ ہوتی ہے مثلاً ''بے اختیار جی چاہتا ہے کہ آپ سے ملاقات ہو اور دو گھڑی بیٹھ کر اپنے ذوق وطبیعت کی چار باتیں کرلوں۔'' ایک دوسرے خط کا یہ اقتباس:

''ہر چند چاہتا ہوں قلم کو روکوں مگر روک نہیں سکتا۔ دماغ سنیما کا پردہ بن گیا ہے۔ ایک تصویر ہٹتی ہے تو دوسری نمودار ہوجاتی ہے۔ جی چاہتا ہے محبت ختم نہ ہو۔ ایک ذکر ختم ہوجائے تو دوسرا چھیڑدوں۔''

مولانا آزاد کے ملنے جلنے والے اصحاب کا حلقہ وسیع تھا۔ ان کے ملاقاتیوں میں دوست و احباب کے علاوہ سیاست داں، ادبا و شعرا بھی تھے، ان خطوط کی مدد سے مولانا کے سوانح نگار، سیاست داں، اہلِ علم، مورخین وناقدین اپنے زاویہ نگاہ سے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

غبارِ خاطر مولانا آزاد کے آخری مکتوبات کا مجموعہ ہے جو قلعہ احمد نگر کے زمانہ اسیری 1942 تا 1945 کے عرصے میں تحریر کیے گئے۔ یہ خطوط مولانا نے اپنے دوست مولانا حبیب الرحمٰن خاں کے نام لکھے تھے۔ غبارِ خاطر کے خطوط دیگر مجموعوں میں شامل خطوط سے مختلف ہیں۔ غبارِ خاطر کے خطوط کا شمار انشائیوں میں ہوتا ہے۔ غبارِ خاطر کی تحریروں میں مولانا آزاد ایک تاریخ داں، انشاپرداز اور ماہر نفسیات نظر آتے ہیں اور مختلف مسائل پر آزاد کی بے ریا کارانہ رائے کا اظہار بھی ملتا ہے۔ اصحابِ علم وقلم نے اس کی قدر و قیمت کا اعتراف کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے تنقید وتعریض کا نشانہ بنایا، کسی نے مضامین کا دفتر کہا تو کسی نے انشائیوں کا مجموعہ قرار دیا۔ کسی نے خود کلامی سے تعبیر کیا تو کسی نے اس میں روزنامچے کی خصوصیات تلاش کیں۔ لیکن مجموعی طور پر 'غبارِ خاطر' مولانا آزاد کے خوبصورت خیالات اور اندازِ فکر کا گلدستہ ہے اس میں مولانا آزاد نے نثر میں شاعری کی ہے۔ بلاشبہ آزاد کی کتاب اردو ادب میں منفرد مقام کی حامل ہے۔ بقول عبدالقوی دسنوی:

''یہ حقیقت ہے کہ غبارِ خاطر مولانا آزاد کے خطوط کا نہ صرف خوبصورت مجموعہ ہے بلکہ اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔''

مولوی عبدالحق

مولوی عبدالحق ادیب، نقاد، ماہر دکنیات، ادبی، صحافی، خاکہ نگار، تبصرہ نگار کے علاوہ اردو تحریک کے علم بردار رہے۔ برصغیر کی زبان وادب کی تاریخ میں مولوی عبدالحق ایک کامیاب خط نویس کی حیثیت سے بھی ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کے مکاتیب کے مجموعے حسب ذیل ہیں: (1) مکتوبات بابائے اردو بنام حکیم محمد امام امامی (2) اردوئے مصطفےٰ (3) مکاتیب عبدالحق (4) مکتوبات بابائے اردو بنام حسام الدین راشدی (1964)، (5) خطوط عبدالحق۔ اکبرالدین صدیقی (1967)، (6) عبدالحق کے خطوط عبدالحق کے نام مرتبہ افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق (7) خطوط عبدالحق بنام عبداللہ چغتائی مرتبہ عبارت بریلوی۔

مولوی عبدالحق ایک زود نویس خط نویس ہیں جن کے مکاتیب کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ مولوی صاحب کے خطوط کے مطالعہ سے ان کے عادات واطوار اور اشغال کے بارے میں معلومات ہوتی ہیں۔ تو دوسری طرف ان کے افکار و خیالات، جذبات و احساسات، رجحانات ومیلانات اور اردو زبان سے ان کی محبت ولگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے خطوط میں اختصار پایا جاتا ہے وہ خطوط میں صرف کام کی بات کرتے ہیں۔ البتہ دوستوں کے نام خطوط میں بے تکلف نظر آتے ہیں۔ سادگی، شگفتگی، بے تکلفی اور برجستگی ان کے خطوط کا نمایاں وصف ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''وہ کثرت سے خط لکھتے ہیں اور اچھے لکھتے ہیں۔ ان کا ہر خط اپنی سادگی اور بلاغت کے لحاظ سے ایک ادب پارہ ہوتا ہے۔ ان کے خطوط خالص پیغامی اور کاروباری ہونے کے باوجود ادبی شان رکھتے ہیں۔''

ان چند منتخب خط نویسوں کے احاطے کے بعد ایک دو اور مجموعوں کی جانب توجہ مبذول کرنا چاہوں گا۔ سجاد ظہیر اردو کے ممتاز ناول نگار ہیں۔ قومی وانقلابی تحریکوں کی وجہ سے اکثر قید و بند کی زندگی گزارتے رہے۔ ایام اسیری (1940-1942) میں انھوں نے اپنی بیوی رضیہ سجاد ظہیر کو خطوط لکھے ان کا مجموعہ 'نقوشِ زنداں' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان خطوں میں انھوں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ 'نقوشِ زنداں' میں ہجر و رفاقت اور سچی محبت اپنی ساری شرافتوں اور متانتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ گویا 'نقوشِ زنداں' ایک شوہر کا اپنی بیوی سے والہانہ محبت کا اظہار ہے۔ 'نقوشِ زنداں' کے برخلاف 'زیرِ لب' اور 'حرفِ آشنا' صفیہ اختر کے مجموعۂ مکاتیب اپنے شوہر جاں نثار اختر کی محبت سے لبریز ہیں۔ ہم اسے نقوشِ زنداں کا دوسرا رخ کہہ سکتے ہیں۔ یہ خطوط 1943 سے 1952 کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان خطوط کے ذریعے صفیہ اختر نے اپنے شوہر جاں نثار اختر کی محبت کا دم بھرنے کا انمٹ اور انمول شاہکار چھوڑا ہے۔ جو عورتوں کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ یہ خطوط ہمیں واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط کی یاد دلاتے ہیں۔ تنگیِ وقت کے باعث چند اور اہم خطوط نویسوں کا احاطہ نہیں کیا جاسکا جیسے محمد حسین آزاد، اکبر الہ آبادی، سلیمان ندوی، حسرت موہانی، داغ دہلوی، رشید احمد صدیقی، نیاز فتح پوری، خواجہ حسن نظامی، محمد علی جوہر، عبدالماجد دریابادی، عابد حسین، فراق گورکھپوری، جگر مراد آبادی، شاد عارفی، محمد علی ردولوی وغیرہ جن کے خطوط بھی ہمارا قیمتی ادبی سرمایہ ہیں۔

آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے خط نویسی کی روایت کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ ان دنوں ترسیل وابلاغ کے نئے ذرائع کمپیوٹر، انٹرنیٹ، فیکس، موبائل فون وغیرہ منظرِ عام پر آنے سے بھلے ہی لوگ خط نویسی سے اجتناب برت رہے ہوں مگر خط جو دراصل دو افراد کے درمیان ایک خوشگوار تحریری وسیلہ ہے، اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ مولوی عبدالحق نے اس ضمن میں خط نوازوں کی صحیح ترجمانی کی ہے۔

''ادب میں کئی دل کشیاں ہیں۔ اس کی بے شمار ادائیں ہیں اور ان گنت گھاتیں ہیں لیکن خطوط میں جو جادو ہے اس کی کسی ادا میں نہیں۔''

ان دنوں ترسیل و ابلاغ کے ترقیاتی وسائل کے باعث خط نویسی کی رفتار سست بلکہ انحطاط کا شکار ہے لیکن دو اصحاب کے درمیان خط نویسی میں جو چاشنی ہے وہ اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم اپنی روش پر قائم رہیں خطوط لکھتے رہیں اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کریں۔ بقول حسرت موہانی:

پڑھ کر تیرا خط مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطراب شوق نے اک حشر برپا کردیا

کتابیات

تنقیدیں: خورشید الاسلام، ادبی تبصرے: عبدالحق، اردو خط نگاری: سید عبداللہ، مطالعہ خطوط غالب: عبدالقوی دسنوی، خطوط اقبال: رفیع الدین ہاشمی، مہدی حسن افادی: عبدالقوی دسنوی، نقشِ آزاد: غلام رسول مہر، غبارِ خاطر: مولانا آزاد، خطوط مشاہیر: عبدالماجد دریابادی، تحقیقات و تاثرات: پروفیسر محمد علی اثر، اردو مکتوب نگاری: ڈاکٹر یس۔ نسیم بانو، مشاہیر خطوط کے حوالے سے: رؤف خیر۔

■

Wahab Andaleeb
'Kunj-e-Naseem' 1-29/35, KHB Colony
behind Dist Counts
Gulbarga - 585102 (KS)
Mob.:09880872386

احمد سہیل

انتشار کا شاعر اور نقاد ٹی ایس ایلیٹ

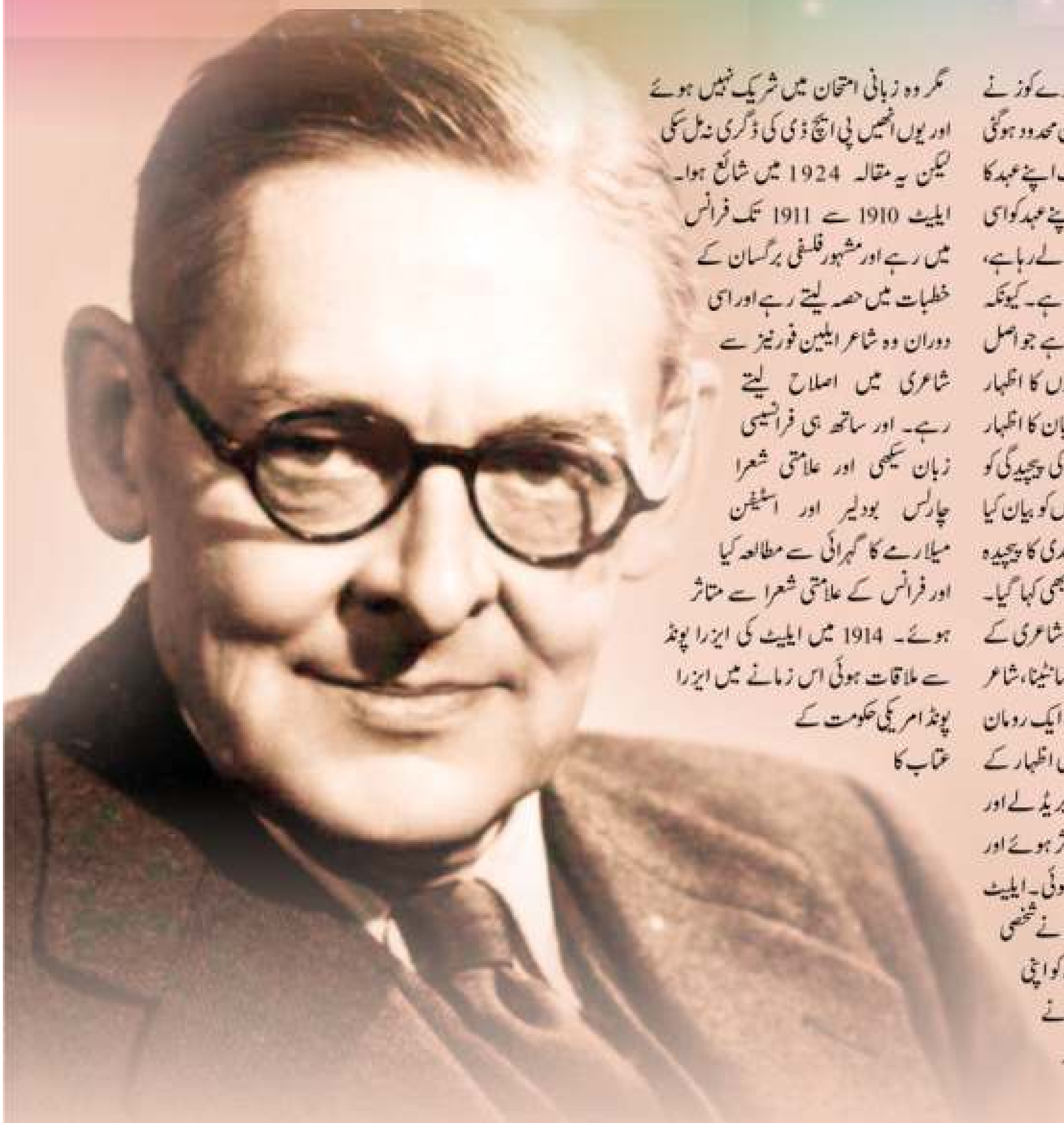

ٹی ایس ایلیٹ کی موت پر رابرٹ کرے گوز نے لکھا تھا کہ "ایلیٹ کے مرنے کے بعد زمین محدود ہو گئی ہے۔" اس میں دو رائے نہیں کہ ٹی ایس ایلیٹ اپنے عہد کا ایک عظیم شاعر اور ادبی نقاد تھا۔ انھوں نے اپنے عہد کو اسی زبان میں پیش کیا جس ماحول میں فرد سانسیں لے رہا ہے، جس میں فرد کی روح کشمکش اور ہیجان کا شکار ہے۔ کیونکہ معویتی آفاق میں ایک 'بنجر دھرتی' پر رہ رہا ہے جو اصل میں بیسویں صدی کی جدید تہذیبی پیچیدگیوں کا اظہار ہے۔ جو عقائدی حوالے سے ایک پیچیدہ زبان کا اظہار بھی ہے۔ کیونکہ اس زبان میں انسانی بحران کی پیچیدگی کو انھوں نے جن معاملات، مزاجوں اور تبدیلیوں کو بیان کیا ہے وہ اس زبان میں ہے جیسا کہ بیسویں صدی کا پیچیدہ معاشرہ تھا۔ ان کی شاعری کو 'عالمانہ' شاعری بھی کہا گیا۔ ان کا شعری لہجہ، لفظیات، معنیات انگریزی شاعری کے لیے بالکل نئی تھی۔ ایلیٹ شروع میں جارج سانتینا، شاعر اور نقاد مارفنگ ربٹ سے متاثر تھے۔ ربٹ ایک رومان شکن شاعر تھے۔ ایلیٹ نے بھی اپنے شعری اظہار کے لیے یہی رویہ اپنایا اور بعد میں وہ ایف ایچ بریڈلے اور ٹی ایچ ہیلمے کے تصورات اور افکار سے بھی متاثر ہوئے اور یوں ان کی رومان شکنی کے مزاج کی توسیع ہوئی۔ ایلیٹ رومانیت کے سخت مخالف تھے اور انھوں نے شخصی گریزیت اور معروضی تلازمے کے نظریات کو اپنی شاعری میں نئی حسیت کے ساتھ برتا۔ ایلیٹ نے 1916 ایف ایچ بریڈلے کی آگاہی اور تجربے کے فلسفے پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا مگر وہ زبانی امتحان میں شریک نہیں ہوئے اور یوں انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری نہ مل سکی لیکن یہ مقالہ 1924 میں شائع ہوا۔ ایلیٹ 1910 سے 1911 تک فرانس میں رہے اور مشہور فلسفی برگسان کے خطبات میں حصہ لیتے رہے اور اسی دوران وہ شاعر ایلین فورنیز سے شاعری میں اصلاح لیتے رہے۔ اور ساتھ ہی فرانسیسی زبان سیکھی اور علامتی شعرا چارلس بودلیر اور اسٹیفن میلارمے کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور فرانس کے علامتی شعرا سے متاثر ہوئے۔ 1914 میں ایلیٹ کی ایزرا پونڈ سے ملاقات ہوئی اس زمانے میں ایزرا پونڈ امریکی حکومت کے عتاب کا

شکار تھے کیونکہ وہ امریکہ دشمن سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ انھوں نے اٹلی جا کر موسولینی کی فاشسٹ حکومت کے سائے میں پناہ لی اور اٹلی کے سرکاری ریڈیو پر امریکی حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ کیا کرتے تھے اور دوسری جنگ عظیم کے دوران انھوں نے فاشسٹ حکومت کا پرچار بھی کیا۔ ایلیٹ کو ایزرا پونڈ کی شاعری پسند تھی مگر انھوں نے ایزرا پونڈ کے سیاسی نظریات سے کبھی کوئی سروکار نہیں رکھا لیکن 1946 میں ایلیٹ نے ایزرا پونڈ کی نظم (Poetry: Amagzine of Verse) شائع کی۔

ٹی ایس ایلیٹ کا اپنا اشاعتی ادارہ تھا۔ جب یہ کتاب Inventions of a March Har شائع ہوئی تو کھلبلی مچ گئی۔ بہت سارے دانشوروں اور تنقید نگاروں نے اپنے ہاتھ ہوا میں لہرائے اور ایلیٹ صاحب کی بے لگام عریانی کی مذمت کی۔ انتھونی جولیس نے بطور خاص ایک تنقیدی مقالے میں یہ الزام لگایا کہ ایلیٹ کی فحش شاعری میں یہودیوں کی تضحیک کا پہلو نمایاں ہے جس کی مثال انھوں نے ان منظومات سے لی جن میں سیاہ فام لوگوں کی شہوانی بڑائی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ سنجیدہ شاعری کے ساتھ ساتھ اس قسم کی شاعری کا اندراج بھی اپنی نوٹ بک میں کرتے رہتے تھے۔ بعض اوقات وہ ان صفحات کو پھاڑ کر اپنے دوست اور مشہور زمانہ شاعر ایزرا پونڈ کو بھجواتے تھے، جو ایلیٹ صاحب کی عریاں شاعری کے بے حد مداح تھے۔ ان میں سے چند ایک نظمیں نیویارک کے ایک وکیل کو سوڈالر کی حقیر رقم میں بیچ دی گئیں اور ان سے حلف لیا گیا کہ یہ نظمیں کبھی اشاعت پذیر نہ ہوں گی۔ انھوں نے لکھا کہ ''اب یہ کلام تمہارے ہاتھ میں ہے، میں التجا کرتا ہوں کہ اسے اپنے آپ تک رکھیں اور کبھی شائع نہ کریں۔''

ایلیٹ کے شاعرانہ اور تنقیدی نظریات نے انگریزی زبان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام ادب و نقد کو متاثر کیا جس میں انھوں نے روایت کا نیا تصور پیش کرتے ہوئے اسے ذہنی اور تاریخی شعور بتایا۔ انھوں نے نقادوں اور شعرا کے لیے 'ہدایت نامہ' بھی لکھا۔ مثلاً نقاد کے کیا فرائض ہونے چاہیے۔ ایلیٹ نے رومانیت کو رد کیا۔ شاعری میں سے انفرادی شخصیت کو باہر نکال پھینکا، وہ فن پارے کو ایک شے کی طرح سمجھتا ہے جسے سوچ سمجھ کر، ناپ تول کر سلیقے اور محنت سے تعمیر کیا جاتا ہے اور جس کا مقصد ایک مخصوص اثر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ اثر فن کار کے سامنے پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ فن کی شکل میں جذبات کے اظہار کا واحد طریقہ یہ ہے کہ معروضی

ٹی ایس ایلیٹ

پیدائش: 26 ستمبر 1888، سینٹ لوئیس، مزروی، امریکہ۔

وفات: 4 جنوری 1965، کنسینگٹن، لندن، انگلستان

ادبی سرگرمیاں: شاعری، ڈرامہ، ادبی انتقادات، مدیر اور ناشر

قومیت: 1927 تک امریکی شہرت، بقیہ عمر برطانوی شہری کی حیثیت سے گزاری۔

تعلیم: بی اے

تعلیمی ادارے: مارٹن کالج آکسفورڈ، ہارورڈ یونیورسٹی، امریکہ۔

ادبی تحریک: جدیدیت

انعامات اور اعزازات: ادبیات کا نوبل انعام (1948)، آڈر آف میرٹ (1948)

تلازمات (Objectove Correlatives) تلاش کیے جائیں یعنی اشیا کو اس طرح ترتیب دیا جائے، موقع و محل اور واقعات کے سلسلوں کو اس طور پر جمایا جائے کہ جب خارجی واقعات حسی تجربوں کے ذریعے ظاہر ہوں تو وہ مخصوص جذبات ابھر آئیں جو نظم لکھنے سے پہلے شاعر کے پیش نظر تھے۔ اس تخلیقی عمل کو ایلیٹ معروضی تلازمات کا نام دیتا ہے جسے اس نے ہیملٹ والے مضمون میں بیان کیا ہے۔ ایلیٹ رومانیت کے خلاف ہے اور مابعد الطبیعیاتی ادراک کو اصل شاعری کہتا ہے ڈون اور اس کے مکتبہ فکر کے دوسرے شعرا اسی لیے اصل شاعرانہ ادراک کے حامل ہیں جسے ملٹن اور ڈرائیڈن نے خراب کر دیا ہے اور دو سو برس تک انگریزی شاعری نراجیت کا شکار رہی۔ ایلیٹ کا ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ شاعری میں اخلاقی اور سماجی اثر ممکن ہے مگر شاعری اپنی جگہ اس نوع کے سب اثرات سے بالاتر ہے شاعری بھی ایک قسم کی مذہبی رسم ہے اور اس کا اثر بھی وہی ہونا چاہیے جو مذہبی رسم کا ہوتا ہے یعنی وہ عقائد و اخلاق کو درست کرے اور ایک اعلی آگاہی پیدا کرے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اس کی تنقیدی فکر کا میدان محدود ہونے لگتا ہے وہ عوام سے انکار کرتے ہیں نشاۃ الثانیہ کی ثقافت کے منکر ہیں۔ تمام رومانیت کو مسترد کرتے ہیں ایلیٹ قدیم مذہب اور اس سے پیدا ہونے والے تمدن کا ایک نظریہ بھی پیش کرتے ہیں اور اس دبستان کا بنیاد گذار اور وقیع نمائندے کی صورت میں ابھر کر سامنے آئے، جس کو ادبی تنقیدی نظریے میں 'ہیئت پسندی' (Formalist) کہا جاتا ہے۔ ویسے تو ایلیٹ کے مضامین میں 'شاعری اور ڈراما' کلاسیک کیا ہے 'تنقید کا منصب' مذہب اور ادب 'شاعری کی تین آوازیں' کئی مضامین نہایت وقیع اور قابل توجہ ہیں لیکن یہاں اس کے دو مضامین 'روایت اور انفرادی صلاحیت' اور 'شاعری کا سماجی منصب' سے اس کی فکر کے چند بنیادی پہلو مکمل طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ اب آپ ان مضامین کو پڑھیے اور خود دیکھیے کہ وہ ہم سے کیا کہتے ہیں؟ 'نصابی تنقید' کے زہریلے اثرات نے ہماری فکر کو کند اور ہمارے احساس و ادراک کو محدود کر دیا ہے۔ ان ترجموں کے مطالعے سے یقیناً آپ اس حصار کو توڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے' نصابی تنقید' کے اثرات کے سلسلے میں میں نے لکھا تھا کہ:

''اس تنقید کا ایک زہریلا اثر تو یہ ہوا ہے کہ آج کا طالب علم اور قاری کسی اور بیجل تصنیف کے بارے میں اپنا کوئی تجربہ نہیں رکھتا۔ اسے ادب پاروں سے کوئی گہری دلچسپی نہیں ہے بلکہ نصابی نقادوں کی رائیں ادب پاروں کا بدل بن گئی ہیں۔ اس زہریلے اثر نے سوچنے کی صلاحیت کو مردہ کر دیا ہے اور ادب پاروں کے ساتھ ذہنی سفر کو ایک بے معنی چیز بنا دیا ہے۔ نصابی نقادوں کی آرا کی بیساکھیاں نوجوانوں کے پاس ہیں اور ادبی فیصلوں کے کیپسول ان کے ذہن کے خانوں میں رکھے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنی ساری ضروریات پوری کر لیتے ہیں۔ جعلی دستاویزیں نقلی مہروں کے ساتھ اصل کی جگہ لے رہی ہیں۔ ایلیٹ نے معروضی تلازمے کا شعری نظریہ پیش کیا ہے اور استعارے پر مدلل بحث کی۔ حیات سے علیحدگی کو

ایلیٹ کے شاعرانہ اور تنقیدی نظریات نے انگریزی زبان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام ادب و نقد کو متاثر کیا جس میں انہوں نے روایت کا نیا تصور پیش کرتے ہوئے اسے ذہنی اور تاریخی شعور بتایا. انہوں نے نقادوں اور شعرا کے لیے ' ہدایت نامہ' بھی لکھا. مثلا نقاد کے کیا فرائض ہونے چاہیے. ایلیٹ نے رومانیت کو رد کیا. شاعری میں سے انفرادی شخصیت کو باہر نکال پھینکا, وہ فن پارے کو ایک شے کی طرح سمجھتا ہے جسے سوچ سمجھ کر, ناپ تول کر سلیقے اور محنت سے تعمیر کیا جاتا ہے اور جس کا مقصد ایک مخصوص اثر پیدا کرنا ہوتا ہے. یہ اثر فن کار کے سامنے پہلے سے موجود ہوتا ہے.

اختیار کرتے ہوئے مابعد الطبیاتی شاعری کی تفہیم نو کی، جو انگریزی شاعری کے مابعد الطبیاتی مکتبہ فکر سے ابتدا ہوتی تھی جو انگریزی شاعر جان ڈون سے ہوئی تھی۔ ٹی ایس ایلیٹ کا خیال ہے کہ "زمانی اور لازمانی ہونے کا شعور، شاعر کو روایت کا شاعر بناتا ہے، اور اسی سے، اس کے زمانی مقام کا، تعین ہوتا ہے۔ ایلیٹ کے نزدیک، لافانیت کو سمجھنے کے لیے، روایت کا شعور، شرط لازم ہے۔ تاہم وہ روایتی شعرا کے کلام کو، نقالی نہیں سمجھتا۔ یہ شعور شعرا کو، مجبور کرتا ہے کہ وہ لکھتے وقت اپنے عہد ہی کو پیش نظر نہ رکھیں بلکہ گزشتہ سے آج تک کے ادب کو اور اپنے ملک کے سارے ادب کو اپنا ہم عصر تصور کریں۔

ایلیٹ نے مروجہ شعری حسیت اور اظہار سے بغاوت کی اور شاعری میں شاعرانہ نظریہ سازی کی۔ انھوں نے اپنی نظم 'بنجر دھرتی' (Waste Land) لکھ کر اپنے جذباتی جوش کے ساتھ کچھ امیدوں کو اس نظم میں شامل کیا۔ جو اصل میں خواہش پرستی تھی۔ اور پھر اس کی ناکامی کو دیکھ کر کیتھولک عقائد میں اپنے خوابوں کی جنت بسائی۔ ایلیٹ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ عیسائیت میں ڈوبتے رہے۔ جس نے ان کی شاعری کی فکریات کو تبدیل کر کے رکھ دیا اور مخصوص نظام اشاریت کے سبب ان کی نظموں میں التباس کا سحر بکھر گیا، جو ایک طرح کی نفی دانش تھی جو انھوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران محسوس کیا اور یوں شعری تجربات میں اخلاقیات، موت، فن کے آثار پر ثقافتی ماضی کا نوحہ لکھا۔ ایلیٹ نے ماضی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے روحانیت سے بھرا ہوا 'فن' پیش کیا۔ جو فلسفے اور منطق کا متبادل تھا جس میں نئی زبان اور لفظیات کی لاشعوریت کو ایک الگ راہ پر ڈال دیا۔ جس نے یقیناً ڈرامہ، موسیقی، اور شاعری پر گہرے اثرات ثبت کیے۔ ایلیٹ کی شاعری نے بھی کئی کروٹیں لیں۔ اپنی شاعری میں دانشورانہ جمالیات اور جذباتی شعری مکالمہ شد ومد کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایلیٹ تا حیات اپنی ذاتی شعوریت کی روش پر جیتے رہے۔ ان کی شاعری میں 'عاجزی' کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ جو فکری سطح پر ایک تطہیر/تزکیہ ہے۔ جس میں قاری ذہنی طور پر یورپ کے تہذیبی زوال کا سانحہ اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے۔ نظم 'بنجر دھرتی' میں ایلیٹ نے اپنے وقت کے مسائلی موضوعات مثلاً باغ، پانی، شہر، سیڑھیاں، مرنے کے بعد کی زندگی، پیدائش نو، کے علاوہ محبت، خواتین کی جانب معاشرتی رویوں کے نفسیاتی اور مابعد الطبیعاتی، جمالیاتی سطح پر دانستہ کے لغوی، تمثیلی، اخلاقی اور لامذہبیت کے رویوں سے بحث کی ہے۔ جس میں انفرادی تعلقات کے ٹیلینٹ کی روایت کا قوی احساس ملتا ہے۔ ایلیٹ کی شروع کی شاعری روایتی نوعیت کی تھی۔ ان کی شاعری میں ایک بڑی تبدیلی ان کی نظم 'جے الفیڈ پروفلاک کا نغمہ محبت' کی صورت میں سامنے آئی۔ یہ نظم جدید انگریزی کا تازہ ترین شعری لہجہ تھا۔ اس نظم کو ادبی جریدے پوئٹری (Poetry)، کی مدیرہ مس منرو نے ایک سال تک نہیں چھاپا کیونکہ وہ یہ

فیصلہ نہیں کر پائی تھیں کہ یہ نظم ہے بھی کہ نہیں... اس کے بعد انھوں نے ایک تجرباتی نظم Alun Espento لکھی جس کا ہیرو 'پروفلاک' کی طرح باغی ہے۔

اردو میں ٹی ایس ایلیٹ پر خاصا لکھا گیا ہے اور بحث و مباحثے بھی ہوتے رہے۔ ترقی پسند نظریات ایلیٹ کے نظریات سے میل نہیں کھاتے تھے۔ اردو کے ترقی پسند ادب ایلیٹ کی فکریات، شعریات اور تنقیدی نظریات سے ہمیشہ خائف رہے اور اسے بیاریت شکن تصورات سمجھتے ہیں۔ پھر بھی اردو کے ترقی پسند چند نقادوں، جیسے علی عباس جلالوی، احتشام حسین اور ممتاز حسین نے ایلیٹ کا مثبت انداز میں مطالعہ کیا۔ اردو کے جدید نظم کے شعرا مثلاً میراجی، ن م راشد، تصدق حسین خالد مختار صدیقی اور مجید امجد وغیرہ کی شاعری پر ایلیٹ کا اثر پایا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں حلقہ ارباب ذوق کی نشستیں ایلیٹ کا تذکرہ ہوئے بغیر نامکمل تصور کی جاتی تھیں جہاں بحث ادب سے نکل کر معاشرتی اور مذہبی مخاطبے کی طرف مڑ جاتی تھی۔ غالباً محمد حسن عسکری نے اپریل 1944 میں ایلیٹ پر اردو میں پہلا مضمون لکھا۔ پھر اردو میں ایلیٹ پر بحث و مباحثہ شروع ہوا۔ جس میں افتاب احمد، احتشام حسین، آل احمد سرور، عبادت بریلوی، پطرس بخاری، سجاد ظہیر، ممتاز مفتی، محمد حسن، شمس الرحمان فاروقی، ظہیر کاشمیری، شاد عارفی، عارف عبدالمتین، ضیا جالندھری، مظفر احمد سید، جمیل جالبی، وحید قریشی، سلیم احمد، قمر جمیل، حنیف رامے، صدیق کلیم، ناصر کاظمی، سجاد باقر رضوی، مختار صدیقی، اور انتظار حسین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایلیٹ کے اردو مترجمین میں جمیل جالبی، کشور ناہید، حبیب حق، وحید اختر، صدیق کلیم، رحمٰن مذنب، فاخر حسین، رحم علی الہاشمی، اسمٰعیل رفیقی شامل ہیں۔ ایلیٹ پر لیوناز وگر کے لکھے ہوئے کتابچے کو قیوم نظر نے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ ایلیٹ پر اردو میں کتابیں بھی لکھی گئیں۔ جن میں ایلیٹ کے ادبی کارناموں پر اچھے مباحث ملتے ہیں جن میں ملک اختر کی 'تنقیدی نظریے'، سجاد باقر رضوی کی 'مغرب کے تنقیدی اصول' سید محمد عبد اللہ کی 'اشارات تنقید'، محمد ہادی کی 'مغربی شعریات'، جمیل جالبی کی 'ارسطو سے ایلیٹ تک'... 'ایلیٹ کے مضامین'، محمد احسن فاروقی کی 'تاریخ ادب انگریزی'، کے نام ذہن میں آتے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ کے کچھ ڈراموں کا بھی اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ناصر کاظمی نے 'سر کی چھایا'، جعفر طاہر نے 'کیوپڈ اور سائیکی'، توصیف تبسم نے 'دست حنا بستہ'، انور عظیم نے 'دائرہ اور نکون'، عارف عبدالمتین نے 'بلیدان'، قرۃ العین حیدر نے 'کلیسا میں قتل'، اور سراج الحق نے 'کاک ٹیل پارٹی' کے معرکے کے ترجمے کیے ہیں۔ عتیق اللہ نے ایلیٹ کے ڈراموں کے تعارف کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنا مضمون 'بیسویں صدی میں منظوم ڈرامے کا فن اور ایلیٹ' پر لکھا۔ ایلیٹ کے ڈرامے نظم معری میں ہوتے تھے۔ جو زیادہ تر مذہبی، انگلیکل اور یونانی اساطیر کے موضوعات کا احاطہ کرتے تھے۔ اردو کی نثری شاعری پر ایلیٹ کے شعری نظریات اور اسلوب کا گہرا اثر ہے۔

■

Ahmed Sohail
225, Trail Hollow Lane
Palestine, TX 75801 (USA)
Cel: 9037290786

عشرت ناہید

زلیخا بیگم

مولانا ابوالکلام آزاد ایک جید عالم، عظیم خطیب، زبردست صحافی، دانشور، ماہر سیاستداں، مفسر قرآن، صاحب فکر وفن، قومی رہنما، وطن پرست، انسان دوست شخص تھے۔ اس عظیم المرتبت شخصیت کی زندگی کے کچھ اور پہلو بھی ہیں۔ ان کی ذاتی زندگی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو ایک بیٹے، ایک بھائی ایک شوہر اور ایک باپ کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ ان کا ہر روپ ان کی زندگی کے ایک الگ چہرے کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ ان سب رشتوں میں اہم رشتہ رفیقہ حیات کا ہے۔ ان کی زندگی ان کی ذات کے اسی پہلو کی مناسبت سے ان کی نصف بہتر زلیخا بیگم سے وابستگی کو موضوع بنایا ہے۔ گو کہ مولانا آزاد نے اپنی زندگی کے اس پہلو کو دبیز پردوں میں چھپا کر رکھا تھا لیکن زلیخا بیگم کی رحلت کے بعد لکھے گئے خط نے ان پوشیدہ جذبوں کو ہلکا سا ہی سہی عیاں کر ہی دیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی شادی آفتاب الدین صاحب کی صاحب زادی زلیخا سے ہوئی۔ آفتاب الدین بغداد کے ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیرالدین کے مریدوں میں سے تھے۔ ان کے یہاں چار بیٹیاں تھیں جب پانچویں بیٹی تولد ہوئی تو انہوں نے نومولود بچی کو بڑی عقیدت کے ساتھ اپنے پیر و مرشد کے قدموں میں ڈال دیا مولانا خیر الدین نے فرط محبت سے بچی کو اٹھایا پیار کیا اور اس کا نام زلیخا رکھا۔ زلیخا بیگم نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ ابھی وہ کمسن ہی تھیں کہ مولانا آزاد سے ان کا عقد کر دیا گیا۔ شادی کے وقت مولانا آزاد کی عمر 19 برس تھی اور زلیخا بیگم کی چھ یا آٹھ برس۔

اس کمسن بچی نے جب شباب کی منزل پر قدم رکھا تو ان کا جو رنگ روپ نکھر کر سامنے آیا اس کا قلمی خاکہ حمیدہ سلطان نے جنہوں نے زلیخا بیگم کو بہت قریب سے دیکھا تھا کچھ یوں کھینچا ہے:

''نرگسی آنکھیں، دراز پلکیں، جٹی بھویں، پگھلے ہوئے سونے کا سا رنگ، بیضوی چہرہ، مائل بہ گداز دلآویز جسم، سفید کالی کنی کی سوتی باریک ساری بے پروائی سے لپیٹے، مشرقی حیا آمیز اداؤں کا قافلہ اپنے جلو میں لیے ہوئے میں نے اسی دنیا کی حور کو دیکھا ہے۔''[1]

زلیخا بیگم نہ صرف حسن و جمال میں یکتا تھیں بلکہ گھر داری کے امور سے بھی بخوبی واقف تھیں۔ ساتھ ہی وہ انتہائی خوش اخلاق بھی تھیں ان کی مہمان نوازی کے سبب عزیز واقارب ان سے بے حد خوش رہتے تھے۔ وہ تمام رشتوں کو نباہنے کا ہنر جانتی تھیں۔

شوہر کی خدمت اور ان کی دلجوئی کو انھوں نے زندگی کا سب سے بڑا فریضہ تصور کیا ہوا تھا صبر و قناعت ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ ان کی طرف سے مولانا آزاد کو ہمیشہ سکون اور محبت ہی ملی۔ ملکی، ملی، سیاسی اور ادبی کاموں کی مصروفیت میں وہ کبھی رکاوٹ نہیں بنیں بلکہ ہر قدم پر مددگار ہی ثابت ہوئیں۔

ان کی خدمت گزاری اور ایثار کا نمونہ تفسیر قرآن کے موقع کا ہے جس کا ذکر حمیدہ سلطان کچھ اس طرح کرتی ہیں:

''ایک دن صبح جو ہم پہنچے تو بیگم آزاد کی نرگسی آنکھوں میں ڈورے دیکھ کر والدہ نے مسکرا کر کہا 'کیا بات ہے۔'؟ انھوں نے جواب دیا 'آج کل مولانا قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ رات کے دو بجے اٹھ بیٹھتے ہیں جتنی دیر وہ لکھتے ہیں پنکھا کھینچتی رہتی ہوں، موسم بے حد گرم ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ جاگیں اور محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں۔''[2]

مولانا آزاد کی فطرت میں خودداری بہت زیادہ تھی یا یہ کہیے کہ ایک استغنا تھا جس نے انھیں اپنے والد کی زمین و جائداد میں موروثی حصہ تک نہیں لینے دیا۔ انھوں نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا جبکہ مولانا آزاد کی مالی حالت ایک لمبے عرصے تک اچھی نہیں رہی۔ زلیخا بیگم نے ان نامساعد حالات میں بھی پوری ہمت و استقامت کے ساتھ مولانا آزاد کا ساتھ دیا۔ ناخوشگوار حالات برداشت کیے۔ مولانا آزاد کی انانیت اور خودداری کی وجہ سے زلیخا بیگم کو بھی ایسی زندگی بسر کرنا پڑی جو ان کے شایان شان نہ تھی لیکن وفا شعار بیوی کبھی کلمہ شکایت لب پر نہ لائیں اور کسمپرسی کے عالم میں زندگی بسر کرتی رہیں۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ مولانا آزاد زلیخا بیگم سے محبت نہیں کرتے تھے انھیں ان سے الفت تھی مگر یہ محبت و الفت ثانوی حیثیت رکھتی تھی کیونکہ مولانا کی اولین محبت ان کے اپنے سیاسی وادبی مشاغل تھے جن پر انھوں نے کبھی زلیخا بیگم کو ترجیح نہیں دی اور ان کے یہ مشغلے جو انھیں وقتاً فوقتاً کبھی طویل تو کبھی مختصر اسیری کے تحفے دیا کرتے تھے اس نے زلیخا بیگم سے ایک بیوی کے تمام شوق چھین لیے تھے ان کی زندگی سے خوشیاں دور ہوگئی تھیں۔ انھوں نے اپنے ذاتی آرام و آسائش کو ترک کر دیا تھا یہ بات ان کی اپنے آپ کی طرف سے لاپرواہی سے عیاں ہوتی ہے۔ ایک بار جب مولانا آزاد کی بہن ان سے ملنے کے لیے گئیں تو انہوں نے زلیخا بیگم کے بکھرے بالوں اور سونی کلائیوں کو دیکھ کر شکوہ کیا تو اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ

''ان کے بار بار جیل جانے سے میری طبیعت خفقانی سی ہوگئی ہے کہ چوئی گوندھنے سے دل گھبراتا ہے۔''[3]

اپنے آپ کو سجا سنوار کر رکھنے سے بیزاری کے

باوجود زلیخا بیگم یہ قطعی نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے رویے سے یا خود سے بے نیاز رہنے پر کسی کی ہلکی سی بھی دل آزاری ہو۔ چنانچہ نند کے شکوے کا تدارک کرنے کے لیے اگلے ہی ہفتے وہ ان سے ملنے کے لیے گئیں تو خاصے رکھ رکھاؤ کے ساتھ لیکن اس میں بھی سادگی کا دامن نہ چھوٹا۔ حمیدہ سلطان آگے لکھتی ہیں:

''دوسرے ہفتے وہ خود ملنے کے لیے آئیں۔ تو پشت پر چوٹی لہرا رہی تھی، چکن کا خوبصورت بلاؤز پہنے تھیں اور ہلکی دھانی ریشمی ساری زیب تن تھی، ہاتھوں میں سونے کی دو چوڑیاں تھیں، کانوں میں بندے، اچھے لباس اور ہلکی سی آرائش نے ان کی من موہنی صورت کو اور بھی دلربا کر دیا تھا۔''[4]

مولانا آزاد کے پیش نظر ایک عظیم مقصد حیات تھا، انھوں نے اپنی زندگی سیاست، ادب اور ملک وقوم کے لیے وقف کر دی تھی اور زلیخا بیگم نے اپنی زندگی مولانا آزاد کے لیے۔ مولانا آزاد نے زندگی کا ہر لمحہ صرف اور صرف قوم، سیاست اور ادب کی امانت بنا دیا تھا تو زلیخا بیگم نے اپنی ہر سانس مولانا کی امانت۔ لیکن دونوں کے مزاج میں بہت فرق تھا، مولانا آزاد خود دار، انا پرست تھے، زندگی کا جو مقصد متعین کر چکے تھے اس سے لمحہ بھر کو بھی غافل نہ ہوئے، اس کی راہ میں ہلکی سی بھی رکاوٹ انھیں منظور نہ تھی، زلیخا بیگم ایثار، قربانی اور وفا شعاری کا نمونہ تھیں لیکن ان کے مولانا کے لیے جو جذبات تھے ان پر وہ خول چڑھانے میں ناکام تھیں جبکہ مولانا کسی بھی قسم کی جذباتی صورت حال کو گوارا نہ کرتے تھے۔ بیوی کی محبت کی بیڑیاں کہیں ان کے آہنی ارادوں میں حائل نہ ہو جائیں۔ اس کا وہ خاص خیال رکھتے تھے۔ 17، اپریل 1916 میں جب پہلی مرتبہ انھیں گرفتار کیا گیا تب زلیخا بیگم پر شدید اضطراب کی کیفیت طاری ہوئی جذبات کی شدت اس طرح غالب ہوئی کہ مولانا کے سامنے وہ اس کا اظہار کر بیٹھیں۔ مولانا اپنے مقصد میں ان کو اس طرح حائل دیکھ کر ناخوش ہوئے ان کی یہ ناراضگی ایک عرصے تک برقرار رہی۔ مولانا آزاد اپنے مزاج کی اس سختی کا ذکر غبار خاطر کے خط نمبر 21 میں اس طرح کرتے ہیں۔

''1916 میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصے تک اس سے ناخوش رہا تھا۔''[5]

مولانا آزاد کے اس رویے نے زلیخا بیگم کو جذبات پر قابو پانے کے ہنر سے واقف کروا دیا تھا، اس کے بعد کبھی انھوں نے مولانا کی گرفتاری پر آزردگی کا اظہار نہیں کیا دل کو کتنی ہی تکلیف پہنچ رہی ہو زبان پر بیان یا چہرے پر عکس نہ آنے دیا۔ مولانا آزاد ان کی اس تبدیلی کو بطور خوبی بیان کرتے ہیں، زلیخا بیگم کی زندگی کو اگر مولانا آزاد کے اس خط کی روشنی میں دیکھا جائے جو انھوں نے صدیق مکرم کو 11 اپریل 1943 کو لکھا تھا تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس وفا شعار بیوی نے اس عظیم انسان کے مقصد کے حصول میں کبھی اپنی ذات کو حائل نہ ہونے دیا، ساری تکلیفیں صبر وضبط کے ساتھ برداشت کرتی رہیں اور ان کے مزاج کے مطابق خود کو ڈھال کر جیتی رہیں۔ مولانا آزاد کو ان سے کوئی تکلیف نہ پہنچے اس خیال سے نہ صرف انھوں نے اپنے جذبات پر قدغن لگائی بلکہ اپنی بیماری کا احوال بھی کبھی مولانا کو نہیں لکھا۔ جبکہ مولانا آزاد جب بھی جیل میں ہوتے وہ پابندی سے انھیں خط لکھا کرتی تھیں۔

زلیخا بیگم اس وقت کی سیاست سے نابلد نہیں تھیں وہ خود بھی وطن کی آزادی کی جدو جہد میں شریک رہیں انھیں آزادی کے لیے کی جا رہی کاوشوں میں مولانا آزاد کے کردار کا بخوبی علم تھا، اور وہ ان کی غیر موجودگی میں پارٹی کے کام دیکھنے کی بھی خواہش مند تھیں، جب مولانا آزاد کو 1942 میں کلکتہ کی عدالت نے ایک سال قید کی سزا سنائی تو انھوں نے مہاتما گاندھی کو خط لکھا کہ:

''میرے شوہر مولانا ابوالکلام آزاد کے مقدمے کا فیصلہ سنا دیا گیا، انھیں صرف ایک سال قید سخت کی سزا دی گئی۔ یہ نہایت تعجب انگیز طور پر اس سے بدر جہا کم ہے جس کے سننے کے لیے ہم تیار تھے اگر سزا اور قید قومی خدمات کا معاوضہ ہے تو آپ تسلیم کرینگے کہ اس معاملے میں بھی ان کے ساتھ ناانصافی برتی گئی، یہ تو کم سے کم بھی نہیں ہے، جس کے وہ مستحق تھے میں پہلے چار سال تک ان کی نظر بندی کے زمانے میں اپنی ایک ابتدائی آزمائش کر چکی ہوں اور میں کہہ سکتی ہوں اس دوسری آزمائش میں بھی پوری اتروں گی۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ ان کی سزایابی کے بعد مجھے اپنی ناچیز ہستی کو ادائے فرض کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ میں آج سے بنگال صوبائی خلافت کمیٹی کے تمام کاموں کو اپنے بھائی کی اعانت سے انجام دونگی۔''[6]

یہ حوصلہ تھا اس عظیم مجاہدہ کا جو گھر کا ٹیلیفون اس وجہ سے کہ کسی نامحرم سے بات نہ ہو جائے نہ اٹھاتی تھیں ان کا ملک کی خدمت کا جذبہ قابل ستائش تھا۔

مولانا آزاد کی زندگی کا ایک طویل عرصہ اسیری میں

گزرا، مولانا آزاد اور زلیخا بیگم کا ایک بیٹا بھی تھا جو کہ بے حد خوبصورت تھا اس وجہ سے اس کا نام حسین رکھا گیا تھا مگر یہ بچہ صرف چار سال زندہ رہا۔[7]

بیٹے کی فرقت مولانا آزاد کی مصروفیتیں زلیخا بیگم کی زندگی کو بے حد تنہا کر گئیں تھیں۔ مالی حالات بھی خراب تھے باوجود ان سب کے زلیخا بیگم اپنے حوصلے اور استقلال پر قائم حالات کا مقابلہ کرتی رہیں، زلیخا بیگم بظاہر جذباتی اعتبار سے سرخرو رہیں مگر جذبات کی تیز تر جنگ کا ساتھ جسم ناتواں اس حوصلے کے ساتھ نہ دے پایا جس کی ضرورت تھی۔ اندرونی خلفشار نے باہر نکلنے کا راستہ نہ پا کر دق اور دمہ جیسے موذی مرض کا سہارا لے لیا، وہ اس کے شدید حملوں کا مقابلہ نہ کر سکیں، اور دن بہ دن کمزور ہوتی چلی گئیں۔ یہی وہ وقت تھا کہ ملک کی تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی مولانا آزاد کی سیاسی مصروفیات اتنی بڑھ چکی تھیں کہ وہ خود اپنے وجود کو بھی فراموش کر بیٹھے تھے صرف اور صرف وطن عزیز کی آزادی ہی ان کے پیش نظر تھی اور ہوتا بھی یہی ہے کہ عظیم مقاصد بڑی بڑی قربانیاں اپنے جلو میں سمیٹے ہوتے ہیں۔ مولانا آزاد جیسے آزادی کے متوالے کے پاس اتنی مہلت ہی نہ تھی کہ وہ ایک خاموش مجاہد پر کچھ توجہ دے پاتے اور انہیں اس مرض کی گرفت سے آزاد کرانے کی خود بھی کوئی سعی کر پاتے، یا محض دلجوئی کے دو لفظ بھی کہہ پاتے۔

وہ لکھتے ہیں کہ:

''جولائی کی آخری تاریخ تھی میں تین ہفتے کے بعد کلکتہ واپس ہوا اور چار دن کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لیے روانہ ہو گیا یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف امنڈ نے لگے تھے، حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائے گا۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صورت حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کیے میں اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی اور جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے، اس لیے وہ بھی خاموش تھی، لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی، ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھ رہے تھے، 3 اگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آیا تو 13 اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا کچھ نہ کہا لیکن اگر وہ کہنا چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشک بار تھا''[8]

جنگ آزادی کی تحریک اپنی کامیابی کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہی تھی تو دوسری طرف زلیخا بیگم کی بیماری۔ کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد مولانا آزاد کو قلعہ احمد نگر کی جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔ جہاں کچھ عرصے کے بعد سے ہی انھیں زلیخا بیگم کی بیماری کی اطلاع ملتی رہی۔ وہ خود تو نہ بتاتی تھیں مگر عزیزوں کے خطوط سے ان کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا پھر اخبارات میں بھی ان کی بیماری کے متعلق خبریں آنے لگیں، جسے جان کر وہ مضطرب ہوتے رہے، لیکن ان کی خود ساختہ انانیت نے ان کی شخصیت کے اس پہلو کو جسے خاوند کہا جاتا ہے پوری طرح اپنی آہنی گرفت میں لے رکھا تھا جس کا خول بہت مضبوط تھا اور اسے توڑنے کی خود انھوں نے کبھی ہلکی سی بھی کوشش نہیں کی۔

ان کی انا ہر رشتے کو قربان کر دینے کے لیے انھیں آمادہ کر چکی تھی، غالبا یہی وجہ رہی کہ جب زلیخا بیگم کی شدید علالت کی خبریں آنے لگیں تب جیل سپرنٹنڈنٹ نے ان سے کہا کہ وہ حکومت سے اس سلسلے میں بات کریں تو مولانا آزاد نے سختی سے منع کر دیا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ، جواہر لال نہرو اور دیگر رفقا نے بھی چاہا مگر انھوں نے حکومت سے اس ضمن میں التجا کرنا گوارا نہیں کیا اور ادھر زلیخا بیگم کی مولانا سے ملنے کی حسرت شدید ہوتی جا رہی تھی اور اس نے انھیں زندگی کے آخری دن تک ان کا منتظر رکھا۔ وہ ملنے والوں سے کہا کرتی تھیں ''بس خدا کے لیے مجھے ایک مرتبہ مولانا کو دکھا دو'' لیکن ان کی یہ حسرت ناتمام پوری نہ ہو پائی۔ مولانا آزاد زبردست طریقے سے اپنی انا اور دماغ سے کیے گئے فیصلے پر عمل پیرا رہے انھوں نے اپنی زندگی کے معمولات میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آنے دیا کہ کہیں ان کے جذبات کسی پر عیاں نہ ہو جائیں۔ اس سوچ کے بارے وہ خود لکھتے ہیں:

''میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر داریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں، جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لیے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامن صبر و قرار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا دھبہ نہ لگ جائے۔''[9]

بالآخر 9، اپریل 1943 کو زلیخا بیگم اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ مولانا کی زندگی کا ایک باب جو چھتیس سالہ رفاقت پر مبنی تھا بند ہو گیا۔

لیکن ایک وقت مولانا کی زندگی میں ایسا آیا کہ ان کی زندگی کا وہ رخ جو پوری طرح پردہ خفا میں نہ سہی مگر عیاں بھی نہ تھا، زندگی کا وہ جذبہ محبت جو دل کے نہاں خانے میں کہیں تھا بالآخر اس نے روزن ڈھونڈ ہی نکالا اور وہ ایک بلند و بالا عمارت جو امام الہند کے نام سے تھی وہ اس وقت ڈھے ہی گئی جب وہ زلیخا بیگم کے مزار پر گئے، آنسوؤں نے ضبط کا دامن چھوڑ دیا مولانا سر جھکائے کافی دیر تک اس عظیم مجاہد کی قبر پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتے رہے۔

مولانا آزاد کی زندگی کا یہ پہلو سوچ کے کئی در وا کرتا ہے۔ ان کے مزاج اور فکر کے بھی کئی زاویے روشن کرتا ہے۔ اور بلاشبہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کی شخصیت سازی میں جہاں ان کی والدہ کا اہم رول رہا وہیں اس کو بنائے رکھنے میں زلیخا بیگم نے مضبوط کردار ادا کیا۔

حواشی:

1: بحوالہ مولانا ابوالکلام آزاد کی وفا شعار شریک حیات زلیخا بیگم: مناظر عاشق ہرگانوی، ایوان اردو آزاد نمبر۔ دسمبر 1988 ص 94
2: ایضا
3: ایضا
4: ایضا
5: غبار خاطر: ابوالکلام آزاد، ص 237
6: بحوالہ مولانا ابوالکلام آزاد کی وفا شعار شریک حیات زلیخا بیگم: مناظر عاشق ہرگانوی، ایوان اردو آزاد نمبر۔ دسمبر 1988 ص 97
7: بحوالہ کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں، مالک رام، ص 39
8: غبار خاطر: ابوالکلام آزاد، ص 235-236
9: غبار خاطر: ابوالکلام آزاد، ص 40

■

Dr. Ishrat Naheed
Asst. Professor, Maulana Azad National Urdu University, Lucknow Campus, C-9, H-Park
Mahanagar Extn,Behind Neera Hospital
Lucknow (U.P.) 226 006
Mob.:0959898772

جمیل مظہری کی نظموں میں رومانیت

زرنگار یاسمین

اس سے قبل کہ میں علامہ جمیل مظہری کی ان نظموں کا تذکرہ کروں جن میں رومانیت کے عناصر موجود ہیں، چند جملے ان کی نظم نگاری کے سلسلے میں کہنا چاہتی ہوں۔ ان کے بیشتر ناقدوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ جمیل مظہری فلسفی بالکل نہیں بلکہ اظہار کی پہلی سطح پر شاعر اور دوسری سطح پر مفکر ہیں۔ اور مفکر بھی ایسے کہ زندگی کے بیشتر حصے میں کسی نہ کسی حد تک بہ یک وقت اسلام، اشتراکیت اور قوم پرستی کے جذبوں سے نہ صرف متاثر رہے بلکہ اپنی الگ الگ نظموں میں اس کا اظہار بھی کرتے رہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام 'نقش جمیل' جو 1953 میں منظر عام پر آیا اس میں صرف نظمیں ہی ہیں۔ مگر ان کے الگ الگ رنگ و آہنگ کا اندازہ شاید مجموعے کے مرتب رضا نقوی واہی کو بھی تھا۔ اس لیے انھوں نے مجموعے کو کل پانچ ابواب میں تقسیم کیا اور ان پر حسب ترتیب 'تفکرات و تاثرات'، 'سیاسیات و عمرانیات'، 'رومانیات اور شبابیات'، 'متفرقات' اور 'باقیات' جیسی سرخیاں لگائیں۔ ظاہر ہے کہ آخری دو عنوانات کے تحت جو نظمیں شریک اشاعت ہیں وہ بھی رومان کے بعض پہلو اپنے اندر رکھتی ہیں چونکہ یہ ایک وسیع لفظ ہے لیکن میں فی الحال ان ہی ایک درجن نظموں کے مطالعے تک خود کو محدود رکھوں گی جو 'رومانیات اور شبابیات' کے تحت پیش ہوئی ہیں کیونکہ اردو میں رومان کا لفظ کم و بیش ان ہی معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔

اس حصے کی پہلی نظم 'نالۂ سحر' 1931 کی ہے جو کل چودہ بندوں پر مشتمل ہے۔ محبت کی ایک زیریں لہر جو یاد ماضی سے عبارت ہے مناظر قدرت کے پیرہن میں پیش ہوئی ہے۔ ابتدائی دو تین بند ایک فضا کی تشکیل کرتے ہیں جس میں صبح کی آمد کا بیان ہے۔ اس مرحلے میں جواں مرگ شاما محبت کی ایک علامت کے طور پر ابھرتی ہے۔ شاعر کو اس کے حوالے سے ماضی کی بہت ساری باتیں یاد آتی ہیں، مثلاً اس کا باغ کی سیر کو جانا، ندی میں نہانا، آم کے درخت پہ جھولا جھولنا، مندر میں پوجا کرنا اور گھنی جھاڑیوں میں شاعر کے ساتھ بیٹھنا۔ ظاہر ہے کہ اب وہ نہیں ہے تو سارے منظر اداس ہیں اور شاعر کا دل بھی افسردہ ہے۔ شاعر کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا جسم خاکی جل کر راکھ ہو چکا ہے۔ پھر بھی اس کے دل کی بات زبان پر آجاتی ہے۔

ترے جلوے میہماں ہیں اب تک نظر میں
پریشاں ہیں آہیں تلاش اثر میں
اس اجڑے ہوئے دل میں ترا تصور
کہ چھٹکی ہوئی چاندنی ہے کھنڈر میں
ادھر آ تجھے لے کے صحرا کو جائیں
چنیں پھول اور جن کی مالا بنائیں

دوسری نظم 'دوشیزہ بنگال' ایک بنگالی دوشیزہ کے حسن کی کہانی ہے جس کے مختلف بندوں میں تشبیہات اور ترکیبات کا حسن نمایاں ہے۔ اپنے دل کی تمناؤں کا بھی اظہار ہے اور آخر میں یہ نصیحت بھی کہ۔

چلنے نہ دے آنکھوں کے افسون تماشا کو
خوددار نگاہوں سے ٹھکرا دے تمنا کو

تیسری نظم 'نقوش ماضی' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں فطرت کے خوب صورت مناظر کا بیان ہے جو ایک جوگن کے ستار بجانے اور گانے کے سبب زیادہ دلکش معلوم ہو رہے ہیں۔

نظر میں شاعر کے پھر رہا ہے ہرا بھرا پُر بہار جنگل
وہ صبح رنگیں وہ کیف منظر وہ دامن کوہ بندھیا چل
ہوا جو شانہ ہلا رہی تھی، تو موجیں ہشیار ہو رہی تھیں
طیور کے مست زمزموں سے فضائیں بیدار ہو رہی تھیں
یہ کیفیت تھی اور ایک جوگن ستار بیٹھی بجا رہی تھی
مگر وہ جنگل کی شاہزادی، بہار کے گیت گا رہی تھی

مذکورہ بالا اشعار کو پڑھتے ہوئے یہ مطلع خود بخود ذہن میں ابھرتا ہے۔

نظر جھکائے عروس فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارہ ہے زلزلے میں افق کی لو تھرتھرا رہی ہے

زمیں اور بحر بھی ایک ہے اور منظر بھی وہی یعنی آمد صبح کا اعلان ایک ہی موضوع یا جذبہ الگ الگ طرز اظہار کی وجہ سے کس طرح بدل جاتا ہے اس پر بہت کچھ بات پیش نظر اشعار کے حوالے سے ہو سکتی ہے۔

میرے خیال سے نظم 'حسینوں کی عید' عمومی نوعیت کی ہے اور بعض شوخ بیانات کے علاوہ اس میں نہ تو منظر نگاری کا کوئی نمونہ ہے نہ جذبات و احساسات کی دل سوزی و گدازی کے اظہار کی زیادہ مثالیں ہیں۔ اس طرح کے اشعار کسی بھی موقع کے لیے کہے جا سکتے ہیں، ان کو عید اور وہ بھی حسینوں کی عید سے زیادہ تعلق نہیں۔

سامنے آئینہ ہے محو خود آرائی ہیں
خود تماشا بھی ہیں اور خود ہی تماشائی ہیں
عید اور عید کے دن شوخی گفتار کا لطف
کیوں نہ ہو خندۂ انکار میں اقرار کا لطف

اب تین ایسی نظموں کا نام آتا ہے جن کے سبب علامہ کی رومان پسندی کا چرچا ہوا۔ میری مراد' کہتے ہیں اسی کو پیا

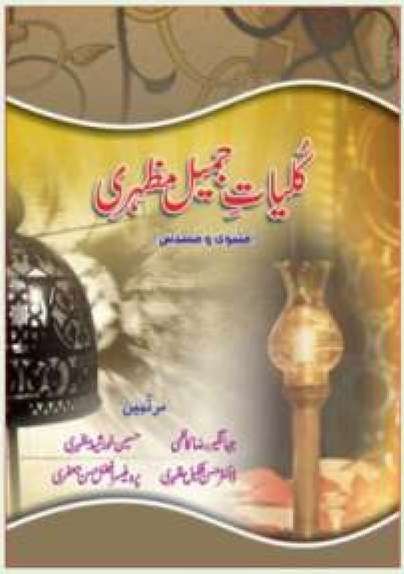

محبت'، 'یہ کیا ہوا تم کو' اور 'ڈرو خدا سے ڈرو' سے ہے۔ اگر ان تینوں نظموں کا ایک تسلسل کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ پہلی نظم میں خود کلامی ہے، دوسری میں شاعر کی جانب سے اظہار محبت اور تیسری میں محبوبہ کی طرف سے احساس محرومی یا ندامت کے ساتھ ساتھ معذرت۔ پہلی نظم کا آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے۔

آئینے میں دیکھو اپنی صورت
نظروں میں جھجک زباں میں لکنت
پندار میں بے خودی کی حالت
کہتے ہیں اسی کو کیا محبت
سینے میں اک آگ سی لگی ہے
اک ہوک سی دل میں اٹھ رہی ہے
اک درد ہے اور اس میں لذت
کہتے ہیں اسی کو کیا محبت

اور اختتام اس طرح ہوتا ہے۔

تم پاس ہو اور سکوں نہیں ہے
یہ کیا ہے اگر جنوں نہیں ہے
لعنت مجھ پر خدا کی لعنت
کہتے ہیں اسی کو کیا محبت

درمیان میں بہت کچھ ہے جو اُن واردات کی تفصیل ہے جن کا شاعر کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ماضی میں معشوق سے ملاقاتوں کے منظر، اس کے اشاروں کی شائستگی مگر دل فریبی، اس کی خوب صورتی، اس کی نگاہوں سے جھلکتی ہوئی محبت، کبھی کبھی اس کی جسارت، کبھی اس کی کم گوئی اور کبھی شگفتہ بیانی، شوخی میں حیا اور حیا میں شوخی کی صورت کے علاوہ خود شاعر کی لحہ بہ لحہ بدلتی ہوئی کیفیات کو خوب صورت تخلیقی اظہار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ دوسری نظم 'یہ کیا ہوا تم کو' میں شاعر نے جرأت سے کام لیتے ہوئے اپنی محبت کا براہ راست اظہار کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ احساس کی شدت کے باوجود تہذیب کے تقاضے اپنی جگہ ہیں۔ اس لیے عشق کے والہانہ پن کو ضبط کا پیرایہ دینے کی کوشش نمایاں ہے۔ ابتدائی بندوں میں ہی، محبوبہ کا ماضی اس کا نام اور بدلتا ہوا رویہ بھی کچھ سامنے آجاتا ہے۔

یہ کیا ہوا مری عذرا یہ کیا ہوا تم کو
نظر اٹھاؤ خدارا یہ کیا ہوا تم کو
یہ کیوں بدل گئی دنیا یہ کیا ہوا تم کو
مری نظر سے اب آنے لگی حیا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو
تمھاری آنکھوں سے بیگانگی ٹپکتی ہے
نیاز و ناز سے اک بے دلی ٹپکتی ہے
رخ اس طرف ہے مگر بے رخی ٹپکتی ہے
وہ کیا کرے گا جو پا کر نہ پا سکا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

اس کے بعد شکوہ وشکایت کا طویل سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ شاعر بار بار ماضی سے حال کی طرف سفر کرتے ہوئے اپنی محبوبہ کو گزرے ہوئے دن کی یاد دلاتا ہے اور ان کے لوٹ آنے کی تمنا بھی کرتا ہے مگر اسے اپنی بے خودی کے باوجود یہ احساس ہے کہ گذرے ہوئے دنوں کا واپس آنا محال ہے۔ اس لیے وہ آخر کار یہ کہہ کر رخصت ہوتا ہے۔

لبوں پہ مہر سہی ابروؤں سے کام تو لو
میں جا رہا ہوں مرا آخری سلام تو لو

اس دوران بے حد سادہ رومانی طرز اظہار کے کئی نمونے سامنے آتے ہیں۔ یہ زبان و بیان پہ شاعر کی قدرت کا ثبوت ہیں۔ صرف ایک مثال پیش کرتی ہوں۔

زبانِ شوق و لب مدعا سے برہم ہو
مری نگاہ سے اپنی ادا سے برہم ہو
سرک گیا ہے جو آنچل ہوا سے برہم ہو
کسی نے یوں نہیں دیکھا کبھی خفا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

ان اشعار کا ایک سرسری مطالعہ بھی جذبوں کی صداقت کے ساتھ ساتھ طرز اظہار کی سلاست کا احساس دلاتا ہے۔ یہ از دل خیزد... کا مطالعہ ہے مگر یہ انداز تخلیقی بھی ہے چونکہ اس میں صرف محبت کا اظہار نہیں شاعری بھی ہے اور کمال فن یہی ہے کہ بیان خواہ جو بھی ہے مگر شاعری بن جائے۔

ظاہر ہے کہ 'خود کلامی' کی بھی زبان ہوتی ہے مگر جب اظہار براہ راست ہو جائے تو جواب دینا لازمی ہو جاتا ہے اور یہی ہوا۔ شاعر کے دل کی آواز جب محبوبہ کے کانوں تک پہنچی تو اس کا جواب آنا ہی تھا اور آیا۔ اب میرے خیال میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ نوجوان شاعر کے اظہار محبت میں ضبط کے باوجود جو شدت تھی اس کے جواب میں اس مجبور و لاچار عورت کا جواب حیرت انگیز ہے جس کی دوسرے مرد کے ساتھ شادی ہو چکی ہے اور وہ بھی غالباً کسی عمر رسیدہ مرد کے ساتھ۔ اس پہلو کی تفصیل بھی وقت چاہتی ہے جس کا یہاں موقع نہیں مگر دیکھنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس عورت کا جواب بھی حقیقت سے کس قدر قریب ہے۔ آزادی سے قبل کے ہندوستانی اور وہ بھی اسلامی معاشرے کی صورت حال سامنے رہے تو علامہ جمیل مظہری کی قادر الکلامی، صداقت اظہار اور طبقۂ نسواں سے جذبۂ ہمدردی سبھوں کی مثال سامنے آجاتی ہے۔ دیکھیے صرف دو بند۔ ابتدائی بند یہ ہے۔

ہوس کی آگ بجھاؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے نہ یاد کرو
سنو جمیل سنو! تم سے یہ گذارش ہے
یہ آرزو نہیں دل سے نظر کی سازش ہے
سمجھ لو یہ کہ محبت بھی ایک خواہش ہے
اسے جنوں نہ بناؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے نہ یاد کرو

اور یہ درمیانی صورت حال ہے۔

(الف)

اِدھر اُدھر نظر اٹھے تو سامنے تم ہو
ہلیں ہوا سے جو پردے تو سامنے تم ہو
کروں خدا کو جو سجدے تو سامنے تم ہو
نماز میں نہ ستاؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو

(ب)

جو پاس چولہے کے اماں کے ڈر سے جاتی ہوں
تو خود بھی جلتی ہوں سالن کو بھی جلاتی ہوں
نمک سمجھ کے شکر دال میں ملاتی ہوں
نہ یوں دوانہ بناؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو

تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں اشارے کافی ہیں جو جمیل مظہری کے تصور عشق پر بھی روشنی ڈال سکتے ہیں۔

آخر میں تین اور نظموں کا سرسری طور پر تذکرہ کرنا چاہتی ہوں۔ ایک 'کہانی' جو حسرت موہانی کی غزل 'چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے' کی یاد دلاتی ہے۔ اس میں ماضی کی یادیں بھی ہیں اور حال کا شکوہ بھی۔ دوسری 'سلام ماضی' جس میں تخلیقی اظہار اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا ہے۔ ویسے تو بیشتر بند قابل ذکر ہیں مگر صرف تین بند جو اسلوب کی دلکشی اور توانائی کے ساتھ جذبوں کی صداقت کا نمونہ ہیں، یہاں پیش کرتی ہوں۔

اک اجڑی سیج پہ چادر کی سوگوار شکن
اور اس شکن کی حکایت سلام کہتی ہے

اک آستیں پہ وہ کاجل کے جا بہ جا دھبّے
وہ آنسوؤں کی امانت سلام کہتی ہے
کسی قمیض کے ادھڑے ہوئے گریباں پر
تمھارے ہاتھ کے ٹانکے سلام کہتے ہیں
ابھر گئے تھے جو تکیوں پہ بن کے نقش و نگار
تمھارے دل کے وہ جذبے سلام کہتے ہیں
سلام تم پہ ہو عذرا تمھارے ماضی کا
جو دور ہوتی ہو مجھ سے تو دور ہوتی جاؤ
مگر حیات گذشتہ کے ان مزاروں پر
جلا کے دل کا دیا تھوڑی دیر روتی جاؤ

ابتدائی دو بند اگر محبت کے تخلیقی اظہار کا نمونہ ہیں تو تیسرا بند روایت کی پاسداری کے سبب شاعر کی بے بسی کی مثال ہے۔

تیسری نظم 'اسے بھول جا بھلا دے' ہے، جس میں کم وبیش وہی جذبات واحساسات بیان ہوئے ہیں جو اس سے قبل کی نظموں میں پیش ہوتے رہے ہیں۔

بارہ نظموں کی فہرست 'اعتراف' اور 'عشق نا تمام' کے ساتھ مکمل ہوتی ہے لیکن ان دونوں نظموں میں بھی موضوع یا طرز اظہار کی سطح پر ایسا کچھ نہیں ہے جس کے بارے میں الگ سے کچھ لکھنا ضروری ہو۔ اس لیے میں فی الحال انھیں چھوڑتی ہوں۔

اب چند باتیں جمیل مظہری کی رومانی نظموں کے امتیازات سے متعلق عرض کرتی ہوں: ظاہر ہے کہ جن نظموں کا میں نے تجزیہ کیا ان پر مختلف ناقدوں نے بار بار تبصرہ کیا ہے اور بجا طور پر یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ ان میں جذبات واحساسات کی جو صداقت ہے وہ اردو کے گنے چنے رومانی شاعروں کے یہاں ملتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ فارسی شاعری کی روایت سے استفادے کے سبب ہمارے قدیم شاعروں بلکہ جوش اور فراق تک کے شاعروں کے یہاں محبوب کی تصویر خاصی دھندلی نظر آتی ہے۔ اسے امرد پرستی نہ بھی کہیں تو کبھی محبوب عورت کی شکل میں ابھرتا ہے اور کبھی مرد کی شکل میں، جس سے خاصا کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔ مگر جمیل مظہری ان چند شاعروں میں سے ایک ہیں جن کا محبوب تمام تر نسوانی خدوخال کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ان کی رومانی نظموں کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ ان میں خیال آرائی کی جگہ سچائی اور تخیل کی جگہ جذبے کی شدت نمایاں ہے۔ اردو شاعری کی عمومی روایت پر نگاہ رکھیں تو تخیل کی کارفرمائی کبھی کبھی بیانات کو ماورائیت کی حد تک لے جاتی ہے۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر شاعر کا مدعا کیا ہے۔ جمیل مظہری کی رومانی نظمیں اس اعتبار سے بے حد شفاف ہیں کہ ان میں عاشق اور معشوق دونوں کا رویہ فطری ہے۔ ان کی رومانی نظموں کا تیسرا امتیاز میری نظر میں ایک معیاری اور منفرد اسلوب ہے۔ ان کے یہاں اظہار عشق میں بھی ایک سلیقہ ہے جس کا سبب اگر ایک طرف شاعر کا فکر انگیز یا فکر آمیز مزاج ہے تو دوسری طرف اس کا شائستہ تہذیبی رویہ جو اسے کسی بھی معاملے میں ایک خاص سطح سے نیچے جانے نہیں دیتا۔

اس سلسلے میں زبان و بیان کی ان باریکیوں کا بھی تذکرہ کیا جا سکتا ہے جو جمیل مظہری کے اسلوب کا حصہ تھیں۔ دوسری طرف اس عہد کے اثرات کا بھی ذکر ہو سکتا ہے جو اختر شیرانی، احسان دانش وغیرہ اہم شاعروں کا عہد تھا اور جس میں رومانیت بمعنی Romanticism کا فروغ ہو رہا تھا۔ مگر یہاں تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں۔ بہر حال جمیل کی نظموں کا اسلوب متوازن ہے۔ ایک اور قابل غور نکتہ یہ ہے کہ جمیل مظہری دوسرے پسماندہ طبقوں کی طرح عورت کی مظلومیت پر بھی صدائے احتجاج بلند کرتے رہے ہیں۔ انھیں اس بات پہ سخت حیرت اور ندامت ہوتی ہے کہ نام نہاد مہذب سماج میں عورتوں کی حیثیت ایک گڑیا یا کھلونے کی ہے جس کے کسی عمل میں خود اس کا دخل نہیں۔ یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب نسائی حسیت اور تانیثیت وغیرہ کے موضوعات اردو میں عام نہیں تھے۔ مگر جو دردمندی اور احساس کی شدت ان کے دل میں عورتوں کے لیے تھی اس کا عکس کہیں نہ کہیں ان نظموں میں بھی مل جاتا ہے جن کو ہم سرسری طور پر رومانی نظمیں کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ یہاں ایک بار پھر 'ڈرو خدا سے ڈرو' کے یہ بند نقل کرتی ہوں۔

کہاں رکھوں دل خانہ خراب کی میت
کنوارے پن کے پر ارمان خواب کی میت
میں خود اٹھاؤں گی اپنے شباب کی میت

جمیل مظہری کی نظموں میں جو رومانیت جلوہ گر ہے جو احساس کی شدت کے باوجود سطحیت کے قریب نہیں جاتی۔ اس میں جو عشق کا اظہار ہے، خواہ مرد کی طرف سے ہو یا عورت کی جانب سے اس میں فطرت سے قربت اور صداقت کا عکس ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح ان کی رومانی نظمیں گرچہ ان کی فکری اور فلسفیانہ شاعری کے سبب زیادہ مشہور نہ ہو سکیں، پھر بھی ایک امتیازی شان کی مالک ہیں۔

نہ ہاتھ اپنے لگاؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے نہ یاد کرو اور ...

جو بجھ رہا ہو سرشام وہ دیا ہوں میں
تبسم لب مایوس مدعا ہوں میں
حیا کے دوش پہ اک میت وفا ہوں میں
مرے قریب نہ آؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے نہ یاد کرو

یہ اس عورت کی بے بسی، لاچاری اور مجبوری کا بیان ہے جس کے دل میں ارمان بھی زندہ ہیں اور احساسات بھی مگر زمانے کی پہرہ دار نگاہیں اسے حیاداری کا پردہ اوڑھ کر دھیرے دھیرے سلگتی ہوئی چتا بن کر آخر کار راکھ ہو جانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں، نہ شادی سے پہلے نہ اس کے بعد، نہ زندگی گزارتے ہوئے نہ موت کے قریب جاتے ہوئے۔ جمیل مظہری کی یہ نظم پڑھتے ہوئے ان کے ناولٹ 'فرض کی قربان گاہ' کا مرکزی تصور خود بخود ذہن میں آ جاتا ہے جو احتجاج کے اسی جذبے سے عبارت ہے۔

مجموعی طور پر جمیل مظہری کی نظموں میں جو رومانیت جلوہ گر ہے جو احساس کی شدت کے باوجود سطحیت کے قریب نہیں جاتی۔ اس میں جو عشق کا اظہار ہے، خواہ مرد کی طرف سے ہو یا عورت کی جانب سے اس میں فطرت سے قربت اور صداقت کا عکس ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح ان کی رومانی نظمیں گرچہ ان کی فکری اور فلسفیانہ شاعری کے سبب زیادہ مشہور نہ ہو سکیں، پھر بھی ایک امتیازی شان کی مالک ہیں۔

■

Dr. Zarnigar Yasmeen
New Azimabad Colony (West)
Sector: D, P.O: Mahendru
Patna-800006 (Bihar)
Email:-zarnigaryasmeen@gmail.com

منشی نول کشور اور ان کا مطبع

عبداللہ عثمانی

''منشی نول کشور عالی دماغ اور بلند حوصلہ شخص اور پبلشر کی حیثیت سے بالکل بے تعصب ہیں۔ ان کے مطبع میں اسلامی مذہبی کتابیں کثرت سے طبع ہوتی ہیں لیکن وہ برہمن اور بدھ مت والوں کی کتابیں بھی ایسی مستعدی سے شائع کرتے ہیں جس مستعدی سے اسلامی کتب اور رسالے کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔ مطبع نول کشور حضرت گنج بخش کے متعلق بے شمار عمارتیں ہیں جو ایک وسیع رقبہ کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اور صدہا آدمی اپنے کام میں مصروف نظر آتے ہیں مطبع میں نہ صرف ہندوستان بلکہ، ترکی، افغانستان، عرب اور یوروپ سے فرمائش آتی ہیں۔ اس مطبع کا رقبہ اس قدر بڑا ہے کہ یوروپ میں اس کی قیمت پانچ لاکھ ڈالر سے کم نہ ہوگی، منشی نول کشور ایک ایسے ہوشیار شخص ہیں کہ ولایت سے ٹائپ تک نہیں منگواتے بلکہ حروف ڈھالنے کا ایک ایسا فن سیکھ لیا ہے کہ خود تیار کرالیتے ہیں۔ اس بڑے کارخانے کا بڑا کام پتھروں سے ہوتا ہے پریسوں کے چلنے کے متعدد کمرے ہیں۔ میں نے ایک کمرے میں اکسٹھ پریس شمار کیے جو ہاتھوں سے چلائے جاتے ہیں اور ہر شخص کو اپنے اپنے کام میں مصروف پایا، پتھروں کی تعداد بے شمار تھی، جن کے چالان جرمن وغیرہ سے برابر چلے آتے ہیں۔ المپائن واقع پریس کے کارخانے کی طرح کارخانہ نول کشور میں تصنیف وتالیف کا بہت بڑا کام کارخانے کے اندر ہوتا ہے اس کارخانے کا گودام عجائبات میں سے ایک ہے اس مطبع میں بارہ سو آدمیوں (ملازمین) سے کم نہیں ہیں۔''

(صحیفۂ زریں ص 4 بحوالہ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ 461)

مذکورہ بالا تصویر (عبارت) ایک امریکی صحافی نے 1884 میں لکھنؤ میں واقع مطبع نول کشور کے معائنے کے وقت قلم بند کی تھی جو واقعتاً قیمتی دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔

برصغیر میں نول کشور پریس کی اشاعتی خدمات سے کون انکار کرسکتا ہے علمی، دینی، ادبی، وطبی غرض ہر فن کے اعلیٰ معیاری تراجم ولٹریچر کی چھپائی میں منشی نول کشور کی صلاحیتوں اور ذوق طبع کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اردو زبان کی ترویج وترقی میں بھی منشی جی کے جذبے کو سدا یاد رکھا جائے گا۔ ہندوستان میں پریس کی ابتدا کو چار صدیاں بیت چکی ہیں جس کی ٹیکنک اور استعمال میں اب انقلاب آچکا ہے ہندوستان میں چھاپہ خانہ نے جہاں ایک طرف عوامی اظہار خیال کو مشتہر کیا وہیں مذہبی ادبی تاریخی لٹریچر کو بھی عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کولکاتہ، مدراس ممبئی وغیرہ میں انیسویں صدی کی ابتداء تک متعدد چھاپہ خانے تھے جس میں سرکاری دستاویز یا اخبارات چھپتے تھے، انیسویں صدی تک ملک بھر میں بہت سے مطابع میدان میں آچکے تھے ان میں مطبع مصطفائیہ دلی، مطبع رضوی میرٹھ، مفید عام پریس آگرہ قابل ذکر ہیں۔ انیسویں صدی 1830 میں لیتھو طباعت کا پہلا پریس کانپور میں مسٹر آرچر نے قائم کیا اور کچھ برس بعد اودھ کے نواب نصیر الدین حیدر کے حکم سے لکھنؤ میں ایک پریس کا اجراء ہوا، 1841 میں پہلی مرتبہ سائنس سے متعلق ایک کتاب شائع ہوئی جو لارڈ برہم کی کتاب کا اردو ترجمہ تھا، لکھنؤ کے لیتھو پریس میں جو کتاب پہلی بار چھپی وہ 'شرح الفیہ' تھی اس کے بعد فارسی اردو اور عربی کی متعدد کتابیں منظر عام پر آتی گئیں۔ صرف لکھنؤ میں 1848 تک قریب ایک درجن مطابع قائم ہوچکے تھے جن میں سلطان المطابع، مطبع سلطانی، مطبع مصطفائی، نامی پریس خصوصی طور پر صحت اور صفائی طباعت میں معروف تھے دلی میں مطبع احمدی اور مجتبائی کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

اسلامی علوم کی نشر واشاعت میں ان چھاپہ خانوں نے انقلاب برپا کردیا تھا نیز آج بھی صحاح ستہ اور دیگر درسی کتابوں کے ناشران کتابوں کی روشن کتابت اور صحت کے اعتبار سے ان قدیم پریسوں کے مرہون منت ہیں اس سلسلے میں ایک روشن اور تابندہ نام ہے، ''مطبع نول کشور لکھنؤ'' اس مطبع کے مالک آنجہانی منشی نول کشور (1836 تا 1895) اپنے عہد کے یگانہ وممتاز پبلشر تھے بقول رام بابو سکسینہ، اس ''مطبع نے زبان اردو کی بڑی خدمت کی اور اس کی ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا اور نادر قدیم کتابوں کی اشاعت، مشہور کتب فارسی وعربی کے تراجم جدید کتابوں کی پبلک مذاق کے موافق تیاری نیز اسکولی کتابوں کی تیاری سے اردو ادب پر بہت بڑا احسان کیا۔''

منشی نول کشور ذاتی طور پر نہایت واقف کار اور تجارت کی بہترین قابلیت کے حامل تھے وہ مذہبی رواداری کا بھی نمونہ تھے انھوں نے اپنے مطبع سے جس پیمانے پر اسلامی علوم کی اشاعت کی وہ سنہری لفظوں میں درج ہے۔ علاوہ ازیں ملازمین مطبع نے دینی کتابوں کی کتابت وپرنٹنگ میں جو احترام واہتمام کیا اس کی نظیر بھی ملنا دشوار ہے۔ قرآن وحدیث کی لکھائی وچھپائی میں کارکنان کو باوضو رہنے کی بھی منشی جی کی تاکید تھی، منشی نول کشور اپنے عہد کے سینئر صحافی بھی تھے، ابتداء میں آپ منشی ہر سکھ رائے کی زیر نگرانی لاہور سے چھپنے والا معروف جریدہ 'کوہ نور' سے وابستہ رہے جنگ 1857 میں یہاں سے نوکری چھوڑ کر لکھنؤ آگئے 1858 میں مطبع نول کشور کا اجراء کیا جس میں انھوں نے اپنی صلاحیتوں اور تجربات کا بھرپور استعمال کیا نتیجتاً نول کشور پریس ایسا مقبول عام وخاص ہوا کہ ہندو بیرون ہند میں بھی اس کی کتابوں کی دھوم مچ گئی نیز ترکی، ایران، افغانستان عرب اور کئی یوروپین ممالک میں یہاں کی مطبوعات کے آرڈر آنے لگے، منشی جی کے اخلاص اور مصنفین ومترجمین کے ساتھ معاملات نے خاص پہچان بنائی تھی انھوں نے زر کثیر خرچ کرکے نہ صرف نامور قلمکاروں اور علماء دین سے بعض نادر کتابوں کے ترجمے کرائے بلکہ قیمتی نادر مخطوطات خریدے اور ان کو نئی ترتیب ونئی زبان اردو میں شائع کیا جن سے عوام کو بڑا فائدہ پہنچا۔ 1858 میں قیام مطبع کے ساتھ منشی جی نے 'اودھ اخبار' شروع کیا جو اپنے مضامین کی انفرادیت انتخاب اور حسن طباعت کے لیے دور دور تک مقبول تھا اور

قریب نوے برس کی طویل مدت طے کرنے کے بعد اودھ اخبار 1950 میں بند ہوگیا۔ منشی جی کے پریس سے چھپنے والی کتابوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس ادارے نے اسلامی علوم سے لے کر تاریخ فقہ، طب، عملیات قصے کہانی اردو وفارسی ادب کے علاوہ ہندو مذہب کی جملہ کتب کے فارسی اردو ایڈیشن چھاپے، غرض علم وادب کی بے مثال خدمات انجام دیں چناں چہ قریب قریب سبھی موضوعات کا احاطہ کیا اس مطبع کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ قدیم شعراء کے نادر وضخیم دواوین اور تحریروں کی اشاعت بھی ہوئی ہے، 'تاریخ ادب اردو' مصنف رام بابو سکسینہ کے حاشیے میں محترم تبسم کاشمیری نے نول کشور پریس سے چھپنے والی اساطیری کتابوں میں 'داستان امیر حمزہ' کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی اشاعت منشی نول کشور کا سب سے عظیم کارنامہ ہے۔ کل داستان کا ترجمہ 46/ ضخیم جلدوں میں ہے۔ ہر جلد کے اوسطاً صفحات ایک ہزار ہیں اس طرح کل داستان تقریباً 46/ ہزار بڑے سائز کے صفحات پر مشتمل ہے، یہ کتاب عہد اکبری میں ابوالفضل فیضی نے اکبر کی تفریح طبع کے لیے تیار کی تھی اس ضخیم کتاب کے اردو مترجمین تصدق حسین، محمد حسن جاہ، اور احمد حسین قمر ہیں۔

اب ہم مذکورہ مطبع سے چھپنے والی چند اہم کتب کا تذکرہ کریں گے، قرآن مجید کے مختلف تراجم اور تفاسیر، درس نظامی کی اہم کتابیں وترجمے، فقہ اسلامی کی بنیادی کتاب فتاویٰ عالمگیری کا 'فتاویٰ ہندیہ' کے نام سے اردو ترجمہ ہدایہ، کا 'عین الہدایہ' کے نام سے مکمل اردو ترجمہ اور تفسیروں میں سب سے ضخیم اردو تفسیر تفسیر مواہب الرحمٰن، ان تینوں کتابوں کے مترجم، مفسر سید امیر علی ملیح آبادی ہیں، علاوہ ازیں تاریخی کتب میں تاریخ فرشتہ 2/ جلدیں، آثار الصنادید 3/ جلدیں، حیات الحیوان 2/ جلدیں، اکبر نامہ 2/ جلدیں، آئین اکبری 3/ جلدیں، طبقات اکبری 7/ جلدیں، حدیقۃ الاقالیم، تزک جہانگیری، مفتاح التواریخ، شاہنامہ فردوسی، قصص الانبیاء، فتح الشام والمصر 2/ جلدیں، جامع التواریخ، سیر المتاخرین 2/ جلدیں، عجائب القصص، خزینۃ الاصفیاء 2/ جلدیں، روضۃ الصفا 7/ جلدیں، سیر الاقطاب، گنجینۂ سروری، دبستان مذاہب، تاریخ اودھ، وغیرہ فن طب میں فصول بقراطی، خلاصۃ التجارب، مجربات اکبری، مکشیف الحکمت، کفایہ منصوری، ضیاء الابرار، مجربات رضائی، دستور العلاج، میزان طب، طب اکبر، مفرح القلوب، ام العلاج، طب یوسفی، قرابادین قادری، علاج الامراض، مخزن ادویہ، ناصر المعالجین، مفردات ناصری، مجربات بوعلی سینا، اختیارات بدیعی، ترجمہ قانون، علاج الغرباء، معدن الشفا، سکندر شاہی وغیرہ علاوہ بریں وقائق الاخیار تصنیف امام غزالی کا اردو ترجمہ، صبح کا ستارہ، تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ، عود ہندی، دیوان غالب، اردوئے معلی، نظم پروین، اعجاز رقم، قطعات الجواہر، ارژنگ چین، کنز الحسین، نافع الخلائق، مجربات دیربی، لغات کشوری، غرض ہر فن اور ہر موضوع پر ان گنت کتابوں کی اشاعت اور قدیم عربی فارسی کتابوں کے اردو فارسی تراجم اس مطبع کے روشن نقوش ہیں جو اپنی وقعت اور معیار کے اعتبار سے بے حد مقبول ہوئے۔ احقر کی لائبریری میں قریب چار درجن مختلف موضوعات پر مطبع نول کشور کی مطبوعہ کتابیں موجود ہیں۔ ان میں چند اہم کتابوں کا مختصر تعارف مع سنہ طباعت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ راقم الحروف کے کتب خانے میں منشی جی کے مطبع کا سب سے قدیم نسخہ 'مجربات رضائی' ہے۔ اس کی طباعت کا سنہ 1863 ہے۔ مصنف سید رضا حسن جعفری ہیں یہ فن طب میں ہے زبان فارسی، صفحات 70/ اور سائز کلاں ہے، 'مجربات اکبری' مصنف حکیم سید محمد اکبر ارزانی، اردو ترجمہ حکیم واحد علی موہانی کا ہے۔ سنہ طباعت 1867 صفحات 150، سائز کلاں، ترجمے کا اسلوب اردو کے ابتدائی طرز کا نمونہ ہے قرابادین قادری، بہ زبان فارسی یہ بھی حکیم محمد اکبر ارزانی کی مقبول ترین تالیف ہے صفحات 448، 1869 طباعت کا سال ہے سائز بڑا ''مجربات بوعلی سینا معروف بہ تحفۃ العاشقین، سنہ طباعت 1870 یہ کتاب شیخ بوعلی سینا اور دیگر معروف اطباء کی کتب کے افادات کا مجموعہ ہے صفحات 185، سائز کلاں، ترجمہ اردو مخزن ادویہ، دو جلدیں بڑا سائز 25x30 یہ ضخیم کتاب حکیم محمد حسین کی تصنیف ہے جس کو حکیم مولوی نور کریم نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے جلد اوّل تیرہ فصلوں کے بعد حروف تہجی کے لحاظ سے حروف صاد تک عربی، فارسی، یونانی وغیرہ دواؤں کے نام ماہیت، طبیعت، افعال وخواص نہایت محققانہ انداز میں لکھے ہیں، ضخامت جلد اوّل 326/ سنہ طباعت 1879 جلد دوم حروف ضاد سے شروع ہوکر حروف یا مع واؤ تک شامل ہے۔ آخر میں حروف تہجی کے مطابق فرہنگ شامل ہے اس جلد کی ضخامت صفحات 286، اور سنہ اشاعت 1880 ہے، وقائق الاخیار، تصنیف حجۃ الاسلام امام غزالی اور ترجمہ صبح کا ستارہ کے نام سے مولانا محمد عباس بن ناصر علی نے کیا ہے ضخامت صفحات 58، سائز بڑا سنہ طباعت 1873 اردو ترجمہ اپنے زمانے کے لحاظ سے نہایت شگفتہ اور رواں دواں ہے۔ فن خطاطی پر نادر تصنیف قطعات الجواہر 'خط نسخ' پر لاجواب کتاب جو اپنے عصر کے ممتاز خطاط محمد حامد علی نبیرۂ منشی نعمت اللہ لاہوری نے منشی جی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ اس کتاب کا ایک ایک حرف گہر نایاب ہے۔ سنہ اشاعت 1884 صفحات 96 سائز بڑی تقطیع کا ہے۔ فتح الشام والمصر، علامہ واقدی کی معروف اسلامی عربی تاریخ ہے فتح الشام کا یہ اردو ترجمہ 1874 میں سید عنایت حسین نے کیا تھا ضخامت صفحات 418/ بڑی تقطیع، اسی کے ساتھ فتوح المصر ہے جس کا اردو ترجمہ سید مہدی حسین نے کیا ہے، صفحات 103/ مہابھارت اردو، المعروف سری رام کرت مہابھارت، سنسکرت سے اردو، یہ کتاب آدی پرب تا اودیوگ پرب تک مکمل مہابھارت کا سلیس اردو ترجمہ ہے مترجم نامور مصنف وگیانی منشی سری رام کائستھ ماتھر دہلوی ہیں صفحات بڑی تقطیع کے 528، سنہ اشاعت 1913 اس کتاب کے ابتداء میں ایک چارٹ چاروں یگوں کا مع مدت ہر ایک کے شامل ہے، علاوہ ازیں ایک طویل فہرست مع مختصر تفصیل دلی شہر کے راجاؤں کی جو راجہ جدھشٹر سے برٹش گورنمنٹ 1902 تک نہایت تحقیق کے ساتھ درج ہے، اس کتاب کے ٹائٹل کی دونوں جانب اندرونی حصے پر اسی موضوع پر اہل ہنود کی قریب دوسو کتابوں کے نام شامل ہیں جن میں اکثر اردو تراجم ہیں مہابھارت کا یہ اردو ترجمہ اب نایاب ہے، مطبع منشی نول کشور کی مطبوعات کی کوئی مکمل فہرست دستیاب نہیں مختلف کتابوں کی پشت یا ٹائٹلوں پر جن کتابوں کی لسٹ ملتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پریس نے برصغیر میں علمی شمع کس درجے پر روشن کی تھی ایک اندازے کے مطابق منشی جی کے پریس نے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں سبھی علوم وفنون کی کتابیں شائع کی تھی، تاریخ اودھ، احقر کے کتب خانے میں اس کی جلد دوم ہے نامور مورخ ومصنف مولانا حکیم نجم الغنی رام پوری کی مایۂ ناز تصنیف ہے سائز 20x26 صفحات 311 سنہ اشاعت 1919 ہے 'تاریخ اودھ' لکھنؤ کے نوابوں کی تفصیلی وتحقیقی تاریخ پر مبنی ہے جو غالباً چار جلدوں میں مکمل ہے منشی نول کشور پریس کے ایڈیشنز کی ایک خوبی وامتیاز یہ بھی ہے کہ ان کتابوں کی کتابت ہندوستان کے نامور خطاطوں نے کی ہے جو اپنے فن وآرٹ کے لحاظ سے بے نظیر تھے اور چھپائی موتیوں جیسی۔ راقم کی لائبریری میں مذکورہ مطبع کی دیگر کتابیں بھی ہیں جن کا تذکرہ اس مضمون میں کرنا ممکن نہیں۔

■

Abdullah Usmani
4/16, Gaddi Wara
P.O.: Deoband - 247554 (UP)
Mob.:09837680287

امتیاز احمد الائی

حسرت موہانی کی صحافت

اردوئے معلیٰ کے حوالے سے

ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ اردو اخبارات کے تذکرے کے بغیر ادھوری ہے۔ پہلی جنگ آزادی سے لے کر ہندوستان کی آزادی تک اردو صحافت کے کردار کو ہمیشہ سنہری الفاظ میں لکھا جائے گا۔ اردو صحافت نے نہ صرف انقلاب کی داغ بیل ڈالی بلکہ مظلوم عوام کی آواز کو سامراجی حکمرانوں تک پہنچانے کی سعی کی جس سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ اخبارات و رسائل نے عام انسانی زندگی کے خوابیدہ تاروں کو ہمیشہ چھیڑا اور دبے احساسات و جذبات کو بیدار کرنے میں زبردست رول ادا کیا۔ دنیا کے کسی گوشے میں کسی طرح کے انقلابات و تغیرات رونما ہوئے تو اخبارات نے ان کو دوسرے خطوں کے باشندوں تک پہنچانے نیز ان میں انقلابی روح پھونکنے میں جو خدمات انجام دی ہیں، وہ تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہیں۔ اردو صحافیوں نے اخبارات کے ذریعے عام انسان کے سوتے جذبات کو ابھارا اور ان کے ذہن کو انقلابی بنایا۔ اردو اخبارات، رسائل اور جرائد نے نہ صرف انسانی ذہن کی تربیت کی بلکہ ایوان حکومت کے در و دیوار ہلا کر رکھ دیے۔

تحریک آزادی کی تاریخ میں اہم رول ادا کرنے والوں میں حسرت موہانی کا نام بھی ہے جن کا ذکر کیے بغیر اردو صحافت کی تاریخ نامکمل ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ میں حسرت کا نام روشن اور تابندہ ہے۔ مولانا حسرت موہانی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ صف اول کے عالم مجاہد آزادی، انقلابی سیاست داں، خطیب، مدبر اور خوش فکر شاعر تھے۔ متذکرہ صفات کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے صحافی تھے۔ ان کی تحریروں نے پورے ہندوستان کو متاثر کیا اور ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرنے اور صداقت کا پرچم بلند کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ حسرت موہانی نے عوام کے دل و دماغ میں حب الوطنی اور ایکتا کے ذریعے آزادی حاصل کرنے کا ولولہ پیدا کیا۔ سامراجی طاقتوں کے خلاف طوفان بن کر ٹوٹ پڑے ان کی قومی شاعری نے کروڑوں عوام کے دل جیت لیے اور ان کی حب الوطنی کے جذبے کو جلا بخشی ان کی تحریروں سے انگریزوں کے بھی دل ہل گئے اور انگریز ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

فضل الحسن نام، حسرت تخلص، 1875 میں یوپی کے ایک قصبہ موہان میں پیدا ہوئے۔ اسی مناسبت سے حسرت موہانی کہلائے۔ حسرت موہانی کے والد کا نام سید اظہر حسین تھا۔ ابتدائی تعلیم اس زمانے کے مطابق مدرسے اور مکتب میں ہوئی۔ اس کے بعد قرآن شریف اور فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ 1894 میں مڈل کا امتحان دیا۔ 1899 میں گورنمنٹ ہائی اسکول فتح پور سے انٹرنس کا امتحان دیا۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ آئے اور یہیں سے 1903 میں بی اے کیا۔ شعر و ادب کے علاوہ سیاست کی طرف مائل ہوئے۔ علی گڑھ کی مقامی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ علی گڑھ سے ہی رسالہ 'اردوئے معلیٰ' نکالا اور یہیں سے حسرت موہانی کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ حسرت کو وکٹوریہ کالج گوالیار میں ریاضی اور عربی کے پروفیسر کی نوکری ملی مگر انھوں نے اس کو ٹھکرا دیا۔ اس طرح ملازمت کو چھوڑ کر صحافت کے پیشے کو ترجیح دی۔ حسرت کا مطالعہ وسیع تھا۔ ان کے کلام میں اساتذہ کا رنگ جھلکتا ہے۔ اردو کے علاوہ فارسی کے شعراء کے کلام کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا۔ حسرت موہانی نے اپنے دور میں اپنی قابلیت اور ذہانت کا لوہا منوایا۔ چنانچہ سید سجاد حیدر یلدرم نے لکھا ہے کہ:

''بلا کے ذہین اور طباع تھے۔ درس کی کوئی انگریزی کتاب شاید انھوں نے دوسری مرتبہ نہیں پڑھی اور اس بارے میں مخالفین تعلیم انگریزی اور ان میں اتنا ہی فرق تھا کہ جہاں وہ انگریزی پڑھنے کو کفر سمجھتے تھے۔ یہ کسی صیغۂ فرنگ پر دوسری مرتبہ نظر ڈالنا گناہ جانتے تھے۔ اس لیے ان کو کبھی انگریزی پڑھنا یا لکھنا نہ آیا۔ حقیقت میں ان کا میلان طبع اردو اور فارسی میں تھا۔ سائنسی علوم سے

> تحریک آزادی کی تاریخ میں اہم رول ادا کرنے والوں میں حسرت موہانی کا نام بھی ہے جن کا ذکر کیے بغیر اردو صحافت کی تاریخ نامکمل ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ میں حسرت کا نام روشن اور تابندہ ہے۔ مولانا حسرت موہانی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ صف اول کے عالم مجاہد آزادی، انقلابی سیاست داں، خطیب، مدبر اور خوش فکر شاعر تھے۔ متذکرہ صفات کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے صحافی تھے۔

بھی ان کی طبیعت بے گانگی سی تھی اور گو ایک امر اتفاق سے مجبور ہو کر انھوں نے بی اے میں ریاضی پڑھی۔''

(بحوالہ اردو صحافت اور تحریک آزادی، ڈاکٹر مسیح احمد ص 122)

حسرت نے نظمیں بھی لکھیں اور مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی مگر اصلاً وہ غزل کے شاعر تھے۔ جب انھوں نے شاعری کی دہلیز پر قدم رکھا تو غزل کے بارے میں طرح طرح کے اعتراضات کیے جاتے تھے اور غزل کا مستقبل زیادہ روشن نظر نہیں آتا تھا۔ آخر انھوں نے غزل کے میدان میں قدم رکھا جس کا انھوں نے برملا اعلان کیا:

''راقم الحروف کی طبیعت نے اپنے لیے اصناف سخن میں غزل کو اپنے حسب حال پاکر منتخب کرلیا۔'' اس بات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ایک شعر میں لکھا ہے:

لکھتا ہوں مرثیہ نہ قصیدہ نہ مثنوی
حسرت غزل ہے صرف میری جان عاشقاں

حسرت نے 'اردوئے معلیٰ' نمبر 3 جلد 9 بابت ستمبر 1907 کے صفحہ 48 میں ایک سیاسی غزل شائع کر کے تہلکہ مچایا۔ غزل چھپتے ہی ہر ہندوستانی فرد کی زبان پر چڑھ گئی۔ غزل کے چند شعر یہ ہیں:

رسم جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے
حُب وطن مست خواب دیکھیے کب تک رہے
تا بہ کجا ہو دراز سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھیے کب تک رہے
پردۂ اصلاح میں کوشش تخریب کا ر
خلق خدا پر عذاب دیکھیے کب تک رہے
خدمت باطل میں ہے فرقۂ زرم آ جکل
حق سے اُسے اجتناب دیکھیے کب تک رہے
حسرت آزاد پر جور غلامان وقت
از رہ بغض عتاب دیکھیے کب تک رہے

حسرت موہانی کا شمار اردو کے صاحب طرز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کی نثر رواں اور برجستہ ہے۔ حسرت نے انگریز کے سامنے مکمل آزادی کا ریزولیشن پیش کیا۔ ان کی زندگی قلندرانہ شان کی ایک مثال تھی۔ صحافت میں بالکل جداگانہ روش اختیار کی اور اپنی سادہ نثر سے لوگوں کے دل جیت لیے۔ مولانا حسرت کی طبیعت میں بغاوت ابتدا سے ہی تھی۔ جنگ آزادی میں ان کا نام گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ حسرت موہانی کو تنقید نگاری کا بڑا شعور تھا۔ اپنے رسالہ میں حسرت نے اپنے معاصر شعراء کے کلام پر بے لاگ تبصرے شائع کیے اور ان کی خامیوں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ان کا ازالہ بھی کیا۔ مولانا الطاف حسین حالی کی تحریر بھی حسرت کے تنقیدی نشتر سے نہ بچ سکی۔ حالی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بعض اخباروں کی رائے ہے کہ حالی کی زبان کی لغزشوں پر ان کی قومی خدمات کے لحاظ سے اعتراضات نہیں کرنے چاہئیں لیکن مشکل یہ واقع ہوئی ہے کہ ہندوستان کا ایک بڑا حصہ بدقسمتی سے ان کے کمال شاعری کا قائل ہے اور ان کی پیروی کو قابل فخر سمجھتا ہے اور جو کچھ خواجہ صاحب کے قلم سے نکلتا ہے اسے جائز قرار دیتا ہے۔ اسی حالت میں اگر ان سے زبان کی کوئی غلطی سرزد ہو ان سے چشم پوشی کرنا گویا دیدہ و دانستہ ایک حصہ ملک کی زبان خراب کرنا ہے۔''

(اردوئے معلیٰ فروری 1904)

اردو زبان کی ترقی وترویج میں حسرت موہانی کے رسالہ 'اردوئے معلیٰ' میں ان تمام باتوں کا خاص خیال رکھا گیا جس سے اردو زبان کو روز بہ روز فروغ حاصل ہوا۔ اس رسالے میں اس دور کے اہم شعرا کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ ادبی واقعات بھی شائع ہوتے تھے۔ اردو کے مایہ ناز شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور اہل علم حضرات کا بھرپور تعاون حاصل ہوگیا تھا۔ شاد عظیم آبادی، مولانا الطاف حسین حالی، امداد امام اثر، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ شبلی، سجاد حیدر یلدرم اور کشن پرشاد کول وغیرہ کے مضامین اور شاعری اسی رسالے کے ذریعے منظر عام پر آتے تھے۔ بعض اہم کتابیں قسط وار شائع ہوتی تھیں۔ اس اخبار میں مجاہدین آزادی کا حوصلہ بڑھانے کے لیے شاعری کی گئی۔ 'اردوئے معلیٰ' نے زبان کی خدمت کے ساتھ قوم اور ملک کی خدمت کا بھی حق ادا کیا اور اپنی تحریر و تقریر میں حق وانصاف اور آزادی وطن کے لیے جان کی بازی لگانے کی تلقین کی۔ حسرت نے 'اردوئے معلیٰ' میں ایسی تحریریں پیش کیں جن سے تحریک آزادی کو تقویت ملی۔ وہ اپنے ملک میں سامراجی اقتدار سے کس قدر نالاں تھے اس کا اندازہ 'اردوئے معلیٰ' کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

''خوابیدہ براعظم ایشیا میں بھی ہندوستان کے سوا کوئی بڑا ملک اس وقت آزادی کی نعمت سے محروم نہیں ہے۔ پس عقل سلیم کسی طرح باور نہیں کرسکتی کہ تمام عالم میں صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک باقی ہے جس کی قسمت میں محکومی دوام کی ذلت لکھ دی گئی ہے۔''

(بحوالہ اردو صحافت مسائل اور امکانات، ڈاکٹر ہمایوں اشرف 2006)

مولانا حسرت نے 'اردوئے معلیٰ' کا اجراء جولائی 1903 میں کیا۔ یہ مارچ 1924 تک جاری رہا۔ مئی 1908 سے 1909 تک اس کی اشاعت بند رہی اور علی گڑھ میں اس کا پہلا دور جون 1913 میں ختم ہوا۔ 'اردوئے معلیٰ' کے ساتھ ساتھ 'تذکرۃ الشعراء' اور ایک اخبار 'مستقل' اپنی صحافتی زندگی میں شائع کیا۔ حسرت نے 'اردوئے معلیٰ' کے ذریعے مکمل آزادی کا برملا مطالبہ کیا اور پہلے ہی شمارے میں ملک کے لیے کامل آزادی کا مجاہدانہ نعرہ لگایا۔ انھوں نے صرف نعرہ ہی نہیں لگایا بلکہ اس کے لیے جہاد بھی کیا جبکہ اس زمانے میں سامراجی حکومت 'آزادی' اور 'جہاد' لفظ برداشت نہیں کرتی تھی۔''

بقول عبدالسلام خورشید:

''براعظم میں Passive Resistence کا نعرہ اور تصور سب سے پہلے حسرت موہانی نے دیا۔ اس کے لیے انھوں نے 'مزاحمت دفاعی' کی اصطلاح ایجاد کی۔ اسی تصور نے بعد میں 'ستیہ گرہ' کا نام پایا۔''

(بحوالہ اردو صحافت، انور علی دہلوی ص 100)

'اردوئے معلیٰ' نے صحافت کے معیار کو بلند کیا۔ غلامی سے تنگ مظلوم عوام کا ترجمان بن گیا اور اس رسالے نے عوام میں آزادی کی روح پھونک دی۔ وطن پرستی کی جوت ملک کے اس کونے سے اُس کونے تک جگادی۔ وہ صور پھونکا کہ مردہ دل زندہ ہو گئے۔ لوگوں نے اس انقلابی آواز کو بڑی توجہ سے سنا، جس کی وجہ سے ان کے دلوں سے خوف کا کانٹا نکل گیا۔ عوام میدان کارزار میں نکل آئے۔ ہزاروں ہندوستانی مرد میدان بن گئے اور غلامی کو توڑنے کے لیے کمربستہ ہوگئے۔ اس سے انگریزی حکومت بھی حواس باختہ ہوگئی۔ وہ جہاد حریت اور قومی یکجہتی کو ملک کو آزاد کرنے کے لیے لازم وملزوم سمجھتے تھے۔ حسرت نے اپنے رسالے کے ذریعے حکومت کی بے جا خوشامد پسندی کو بے نقاب کیا۔ ہندوستان کے غفلت شعار لوگوں کو غلامی سے نجات دلانے اور انگریزوں کے ظلم وستم سے آزاد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

حسرت موہانی کا شمار اردو کے صاحب طرزادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کی نثر رواں اور برجستہ ہے۔حسرت نے انگریزکے سامنے مکمل آزادی کا ریزولیشن پیش کیا. ان کی زندگی قلندرانہ شان کی ایک مثال تھی .صحافت میں بالکل جداگانہ روش اختیار کی اور اپنی سادہ نثر سے لوگو ں کے دل جیت لیے۔ مولانا حسرت کی طبیعت میں بغاوت ابتدا سے ہی تھی۔

'اردوئے معلیٰ' میں شائع ہونے والے مضامین میں سنجیدگی اور پختگی ہوتی تھی اور تحریروں میں ایسی خوشبو ہوتی تھی جو دل ودماغ کو معطر کرتی تھی ساتھ ہی ان تحریروں سے دلکشی اور جاذبیت بھی جھلکتی تھی۔ جس کی وجہ سے 'اردوئے معلیٰ' بہت جلد سب سے مقبول رسالہ ہوگیا جس کی تصدیق حسرت نے خود کی:

''ادبی حیثیت سے لاریب اردو کا کوئی رسالہ 'اردوئے معلیٰ' کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

(اشتہار اردوئے معلیٰ، مئی 1912)

'اردوئے معلیٰ' کے بارے میں آل احمد سرور نے حسرت کے دعوی کی تصدیق ان لفظوں میں کی ہے:

''جن رسالوں کے کارنامے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں ان میں 'دلگداز'، 'مخزن'، 'اردوئے معلیٰ'، 'زمانہ' اور معارف ممتاز ہیں۔ ان میں 'اردوئے معلیٰ' کئی جہتوں سے سرفہرست ہے۔''

('اردو ادب' حسرت نمبر 1، ص 168)

'اردوئے معلیٰ' میں ملکی سیاست، عالمی سیاست، ادب، ثقافت، سائنس، جغرافیہ، پولیٹکل سائنس، بائیلوجی، سوشیالوجی اور کھیل سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس لیے قارئین ذوق وشوق سے اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ اس میں اکثر مضامین انگریزی زبان سے ترجمہ کیے ہوتے تھے۔ کانگریس کے سالانہ اجلاسوں کی روداد کے ترجمے بھی ضخیم ضمیموں کی شکل میں شائع کیے۔

حسرت موہانی نے 'اردوئے معلیٰ' کو اسی مقصد سے جاری کیا تا کہ صحافت کے معیار کو بلند کیا جائے۔ یہ رسالہ مظلوم عوام کا ترجمان بن گیا اور عوام میں آزادی کی روح پھونک دی۔ لوگ اس کی انقلابی آواز کو بڑی توجہ سے سنتے تھے۔ رسالے کو جاری رکھنے کے لیے انھیں کئی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے بار بار ضمانتیں طلب کی گئیں۔ پریس ضبط ہوا۔ ایم او کالج کے طلباء نے حسرت کے رسالے کا بائیکاٹ کیا۔ ان چیزوں کی پروا کیے بغیر صاف لفظوں میں اعلان فرمایا کہ:

'اردوئے معلیٰ' کسی کے سہارے پر نہیں اللہ کے سہارے پر نکالا گیا۔ اسی لیے انشاءاللہ بند نہیں ہوسکتا۔''

('اردوئے معلیٰ' مارچ 1904، ص 3)

حسرت کو 'اردوئے معلیٰ' میں لکھے ہوئے ایک مضمون 'مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی' کی بدولت گرفتار کیا گیا کیونکہ اس مضمون نے حکومت کے کان کھڑے کیے۔ جس کی وجہ سے حسرت کو دو سال قید اور پانچ سو جرمانے کی سزا سنائی۔ یہ مضمون حسرت نے خود نہیں لکھا بلکہ کسی دوسرے طالب علم نے لکھا تھا، لیکن

حسرت باغیانہ ذہن کے مالک تھے۔ انھوں نے جرأت مندانہ طریقے سے سامراجی حکومت کو اپنے قلم کی طاقت سے ہلا کے رکھ دیا اور ہندوستان کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ 'اردوئے معلیٰ' نے اردو ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اس رسالے کو بند ہوئے بہت عرصہ گزرا مگر ہندوستان کے سیاسی، سماجی، ادبی اور صحافتی آسمان پر اس کی خدمات کاستارہ روشن ہے۔

حسرت کی خودداری نے اجازت نہ دی کہ وہ مضمون نگار کا نام ظاہر کریں۔ مولانا نے جرمانہ ادا نہیں کیا۔ اس کی وصولیابی ان کے کتب خانے سے کی گئی۔ کتب خانے کی ساری کتابوں کو محض ساٹھ روپے میں نیلام کیا گیا جس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا:

''اس جرمانہ کی بدولت کتب خانہ 'اردوئے معلیٰ' کی جو حالت ہوئی اس کا بیان نہایت دردناک ہے جن کتابوں کو راقم الحروف نے معلوم نہیں کن کن کوششوں اور دقتوں سے بہم پہنچایا تھا۔ جن کتابوں میں ایسے نادر و نایاب اور قلمی نسخے اور دواوین شعراء کے تھے جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی ان سب کو پولیس کے جاہل جوان تھیلوں میں اس طرح بھر بھر کے لے گئے جس طرح لوگ لکڑی اور بھس لے جاتے ہیں۔ ان کتابوں کی فہرست بنانا تو درکنار کسی نے ان کو شمار تک نہ کیا۔ اس کے بعد ان کتابوں پر کیا گزری اس کا ذکر کرتے ہوئے ہمارا دل دکھتا ہے۔ اس جبر وظلم کا انصاف خدا کے ہاتھ ہے۔''

اس کے علاوہ بھی مولانا کو کئی مرتبہ قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن اس خوددار مدیر نے کبھی انگریزوں کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے اور مالی وجسمانی اذیت تنہا برداشت کرتے رہے۔ حسرت کے ساتھ قید خانہ میں سیاسی مجرم کے بجائے اخلاقی مجرم جیسا سلوک کیا گیا۔ وہاں وہ جیل کی چکی پیستے اور شاعری کے ذریعے اپنا پیغام سناتے ہیں:

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت سے جیل میں گیہوں پسوایا جاتا تھا اور ہر روز کنویں سے پانی کھنچوایا جاتا تھا۔ رمضان کے مہینے میں بھی ان کو ایک من گیہوں پیس کر دینا پڑتا تھا۔ بغیر سحری اور افطاری روزے رکھتے تھے اور جیل کی مصیبت بھری زندگی بھی گزارتے تھے۔ جس کا اظہار انھوں نے اس شعر میں کیا ہے:

کٹ گیا قید میں ماہ رمضان بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

جیل سے رہا ہوتے ہی دوبارہ قوم کی خدمت کرنے لگے اور مکمل آزادی کا نعرہ دینے لگے اور ملک کو سامراجی اقتدار سے آزاد کرانے کے لیے پیش پیش رہے۔

1909 میں حسرت نے دوبارہ اردوئے معلیٰ کو جاری کیا۔ دوبارہ تین ہزار کی ضمانت طلب کی گئی اور رسالہ بند ہوگیا۔ اس کے بعد 1915 کو سہ ماہی رسالہ 'تذکرۃ الشعرا' جاری کیا۔ اس کا ڈکلریشن داخل نہیں کیا گیا اس لیے اس کو کتاب کا ہی نام دیا گیا۔ 'تذکرۃ الشعرا' جولائی 1915 کے شمارے میں لکھا:

''1913 میں حکومت نے اردو پریس سے تین ہزار کی ضمانت طلب کی جو ادا نہیں کی جاسکی اس لیے اردو پریس کا خاتمہ ہوگیا اور اس کے ساتھ 'اردوئے معلیٰ' بھی بند ہوگیا سیاسی حیثیت سے 'اردوئے معلیٰ' اپنا فرض پورا کر چکا تھا۔ چنانچہ اس کا اظہار آخری شمارے میں کر دیا گیا ہے۔ البتہ ادبی حیثیت سے اس کے بہت سے مقاصد ناکام رہے تھے جن کی تکمیل کے لیے تذکرہ کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔''

حسرت باغیانہ ذہن کے مالک تھے۔ انھوں نے جرأت مندانہ طریقے سے سامراجی حکومت کو اپنے قلم کی طاقت سے ہلا کے رکھ دیا اور ہندوستان کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ 'اردوئے معلیٰ' نے اردو ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اس رسالے کو بند ہوئے بہت عرصہ گزرا مگر ہندوستان کے سیاسی، سماجی، ادبی اور صحافتی آسمان پر اس کی خدمات کا ستارہ روشن ہے۔ حسرت نے ادبی اعتبار سے جو خدمات انجام دی ہیں وہ اردو ادب میں بے مثال اور ناقابل فراموش ہیں۔

کتابیات

1. کلیات حسرت موہانی: حسرت موہانی، مکتبہ معین ادب لاہور 1976
2. اردوئے معلی کے شمارہ حسرت موہانی، مکتبہ معین ادب لاہور 1976
3. اردو صحافت: انور علی دہلوی، اردو اکادمی دہلی 1987
4. اردو صحافت: مسائل اور امکانات: ڈاکٹر ہمایوں اشرف، عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی 2006
5. اردو صحافت اور تحریک آزادی: ڈاکٹر مسیح احمد، ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز 2009، نئی دہلی 2

رسالہ 'شیرازہ'، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز سری نگر، جلد 28، جون 1989 شمارہ 6

Imtiyaz Ahmad Alie
S/O Mohamad Ismail Alie
Ied Gaha Dooru Anantnag- 192211
Mob.: 9419068866, 9796573474
Emil: alieimtiyaz@gmail.com

قرۃ العین حیدر کا خاندانی پس منظر

مہتاب عالم فیضانی

قرۃ العین حیدر اپنے آپ میں ایک دبستان ہیں۔ ان کی فکر، ان کی شخصیت دوسرے تمام ادیبوں سے مختلف ہے۔ قرۃ العین حیدر کی ہمہ گیر شخصیت کے پیچھے جہاں ایک طرف ان کی اپنی محنت و جستجو کارفرما ہے وہیں دوسری طرف ان کی شخصیت کو ابھارنے اور نکھارنے میں ان کے خاندان، گھریلو ماحول اور والدین کی پرورش بہت ہی مددگار ثابت ہوئی ہے۔

ہر انسان محنت و مشقت کر کے خود کو باصلاحیت بناتا ہے، لیکن اگر اس شخص کا گھرانہ علمی اور ادبی دولت سے مالا مال ہو تو اس کا اثر بھی لازمی طور پر اس انسان کی شخصیت پر پڑتا ہے۔ یہی حال قرۃ العین حیدر کے ساتھ بھی رہا۔

ہم ماضی میں قرۃ العین حیدر کے اجداد پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کے اجداد وسطِ ایشیا سے ایک طویل سفر کر کے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ قرۃ العین حیدر ایک قدیم اشرافیہ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا سلسلۂ نسب 740 عیسوی کے کوفے میں حضرت زید سے ملتا ہے، جن کو خلیفۂ وقت (غالباً ہشام بن عبدالملک اُموی یا ولید بن یزید) نے شہید کر دیا تھا اور بعد میں زید شہید کہلائے۔ (حضرت زید شہید، حضرت حسینؓ کے پوتے حضرت زین العابدین کے صاحب زادے ہیں، حضرت زین العابدین کے دوسرے صاحب زادے حضرت حسین اصغر ہیں۔ اس طرح اس خاندان کا براہِ راست تعلق حضرت حسینؓ سے ہے)۔ جناب زید شہید کی اولاد مزید ایذارسانی سے بچنے کے لیے جارجیا تک چلی گئی۔ آلِ زید شہید بن زید العابدین کے متعدد افراد نے جن میں سید حسین عبداللہ محدث شامل تھے ترمذ کو اپنا وطن بنایا۔

ترمذ اس وقت ملکِ بغداد کے شہر خراسان کے قریب بوق نامی چھوٹے شہر کے پڑوس میں چند لوگوں کی آبادی پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا (تاریخ بلدان)۔ وہاں سے قرۃ العین حیدر کے اجداد نے آ کر ملکِ ہندوستان میں دائمی سکونت اختیار کر لی تھی۔

ان بزرگ کی اولاد میں سید کمال الدین بن سید عثمان ترمذی نے 1180 میں ترکمانیہ سے ہندوستان کا رخ کیا اور یہی سید کمال الدین بن سید عثمان ترمذی قرۃ العین حیدر کے جد امجد ہیں۔ سید کمال الدین ترمذی نے تھانیسر سے متصل قصبہ کیتھل ریاست ہریانہ میں سکونت اختیار کی۔

سید کمال الدین ترمذی کے پانچ بیٹے تھے، (بیٹیوں کی صحیح تعداد نا معلوم ہے) حسام الدین، ملک سید ابراہیم، نصیر الدین، علیم الدین اول اور سید جلال الدین غازی۔ سید کمال الدین غازی قرۃ العین حیدر کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ یہ اس علاقے میں جا کر بسے جو بعد میں روہیل کھنڈ کے نام سے مشہور ہوا۔ سید کمال الدین کے اخلاف میں سید اشرف گنج بخش، سید محمد، سید احمد، سید محمود اور سید حسن عسکری تھے۔ یہ لوگ اور ان کی اولادیں مختلف علاقوں میں جا کر آباد ہو گئیں۔ سید حسن ترمذی قصبہ نہٹور ضلع بجنور میں آباد ہو گئے۔ ان کی اولادیں ساداتِ نہٹور کہلائیں۔ یہیں قرۃ العین حیدر کے پرکھوں کی حویلی بھی ہے، اب جس کے صرف کھنڈرات ہی رہ گئے ہیں۔

یہ کوئی تین چار صدی پہلے کی بات ہے جب ہندوستان اپنی دولت و ثروت، مالداری و تونگری کی وجہ سے ہر ایک کا مطمحِ نظر بنا ہوا تھا، جس کی وجہ سے ہر بادشاہ ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواہش مند رہا کرتا تھا۔ مختلف ملکوں کی عوام بھی خوشحال زندگی گزارنے کے لیے ہندوستان کا رُخ کرتی تھی۔ چنانچہ قرۃ العین حیدر کے اجداد میں سے سید حسن ترمذی بھی وسطِ ایشیا سے ہندوستان آ کر بس گئے تھے۔ قرۃ العین حیدر کے آبا و اجداد پہلے تو لودھی سلاطین کی حکومت میں منصب دار رہے۔ بعد ازاں دربارِ مغلیہ کے بڑے بڑے عہدے پر فائز ہوئے۔ نند کشور وکرم اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"ان کے والد سجاد حیدر یلدرم یو۔ پی۔ کے ایک ایسے پڑھے لکھے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جن کے افراد دربارِ مغلیہ میں سہ ہزاری، پنج ہزاری اور منصب دار وغیرہ رہے تھے۔ ان (یلدرم) کے لکڑ دادا سید حسن ترمذی وسطِ ایشیا سے ہندوستان آئے تھے"۔[1]

یہی بات مجیب احمد نے اپنے مضمون 'ایک عہد ساز شخصیت۔ قرۃ العین حیدر' میں "ان کے آبا و اجداد میں چند لودھی سلاطین کی حکومت میں منصب دار تھے" کے اضافے کے ساتھ لکھی ہے"۔[2]

سید حسن ترمذی کے آبا و اجداد میں سید اشرف 'گنج بخش' کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کے صاحب زادے سید علی گھوڑا بخش تھے ان کے اخلاف میں عبد المطلب، بہادر علی، قادر علی، نادر علی، انور علی، منور علی اور حضرت آخوند امام بخش تھے۔ حضرت آخوند بخش کے لڑکے بندے علی اور احمد علی تھے۔ بندے علی ترمذی کمپنی بہادر میں ایک معمولی ملازم تھے اور بندیل کھنڈ میں تعینات تھے۔ میر احمد علی کمپنی بہادر کے ایک نیٹو پلاٹین میں میرٹھ چھاؤنی کے اندر معمولی سپاہی تھے۔ بغاوت کے جرم میں پھانسی کی سزا سنا دی گئی تھی بعد میں جان بخش دی گئی۔ ان کے بڑے بیٹے سید جلال الدین حیدر، سید حیدر یلدرم کے والد محترم اور قرۃ العین حیدر کے دادا ہیں۔ سید جلال لدین حیدر کے تین اور بھائی غلام حیدر، حسین حیدر اور کرار حیدر تھے۔ غلام حیدر اور حسین حیدر نے طبابت کی تعلیم حاصل کی اور کرار حیدر نے ڈاکٹری کی، اور خود جلال الدین حیدر جھانسی میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس طرح اس خاندان میں علم کا رجحان شروع ہی سے پھل پھول رہا تھا۔ سبھی حضرات تعلیم یافتہ اور بڑے بڑے عہدے پر فائز تھے۔ کسی طرح کی مالی پریشانی نہیں تھی خوشحال مالدار جاگیردار خاندان تھا۔ لوگ خوش اخلاق اور دین دار تھے۔ اسلامی قدروں کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔

سید جلال الدین حیدر کی شادی میر بندے علی مرحوم اور سیدہ مریم خاتون کی بیٹی سعیدہ بانو سے ہوئی تھی۔ ان سے پانچ اولادیں سید اعجاز حیدر، صغریٰ فاطمہ، سجا حیدر،

نصیرالدین حیدر اور وحیدالدین ہوئیں۔ سبھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور حکومت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہوئے۔ سبھی نے عزت، شہرت، قدر و منزلت پائی۔

1857 میں یلدرم کے پردادا میر احمد علی نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کیا (چونکہ یہ مغل سے وابستہ تھے) جس کی وجہ سے ان کا سارا سرمایہ ضبط کر لیا گیا۔ بعد میں یلدرم کے والد سید جلال الدین اور ان کے چھوٹے بھائی سید کرار حیدر نے انگریزی تعلیم حاصل کر کے سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ سید جلال الدین حیدر بنارس کے حاکم مقرر ہوئے اور انگریزوں کی طرف سے خان بہادر کے لقب سے نوازے گئے۔ چھوٹے بھائی کرار حیدر یوپی کے سول سرجن رہے ان کا شمار صوبے کے مشہور ڈاکٹروں میں ہوتا تھا۔

جس دوران سید جلال الدین جھانسی میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے پر فائز تھے اسی دوران 1880 میں قصبہ نذیر ضلع جھانسی میں میر بندے علی مرحوم اور سیدہ مریم خاتون کی بیٹی اور جلال الدین حیدر کی اہلیہ سعیدہ بانو کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام 'سجاد' رکھا گیا جو آگے چل کر سجاد حیدر یلدرم کے نام سے مشہور ہوا۔ ابتدائی تعلیم بنارس سے حاصل کی جہاں ان کے والد بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ 21 نومبر 1892 میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی نویں جماعت میں داخل ہوئے۔ پڑھنے کے بے حد شوقین تھے۔ علی گڑھ کے علمی ماحول نے ان کے شوق کو جلا بخشی۔ ان کا شمار کالج کے ہونہار طلبا میں ہوتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ سجاد حیدر نے 1901 میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ بی اے کرنے سے پہلے ہی ان کے مضامین پانیئر میں شائع ہونے لگے تھے اور 1896 سے 1899 تک معارف علی گڑھ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے۔

اپنی تعلیم کو جاری رکھتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایل ایل بی میں داخلہ لیا، اسی دوران وہ نواب اسمٰعیل خاں تعلقہ دار میرٹھ اور راجا صاحب محمود آباد کے سکریٹری بھی رہے۔ پھر انھوں نے بغداد میں برطانوی کونسل خانے میں ترکی مترجم کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی اولین شہرت ترکی کہانیوں کو اردو زبان میں ترجمہ کرنے سے ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے افسانے لکھنے شروع کیے۔

امیر کابل کی وفات کے بعد ان کی خدمات یوپی سرکار سول سروس میں منتقل کر دی گئیں۔ 1920 میں جب علی گڑھ کالج نے یونیورسٹی کی شکل اختیار کی تو سجاد حیدر یلدرم مسلم یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ کئی سال انڈمان نکوبار میں رہنے کے بعد غازی پور، اٹاوہ سے 1935 میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

اردو ادب کے ذخیرے میں سید سجاد حیدر یلدرم نے جو گراں قدر اضافے کیے ہیں وہ ہم کبھی بھول نہیں سکتے۔ ادبا، شعرا و صاحب علم و فضل اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ جہاں اردو ادب کا پہلا افسانہ نگار پریم چند اور راشدالخیری کو مانا جاتا ہے وہیں بعض محقق سجاد حیدر یلدرم کو اردو کا پہلا افسانہ نگار مانتے ہیں۔ مذکورہ بات میں اگرچہ اختلاف ہے لیکن یہ بات ہر ادیب جانتا ہے کہ اردو افسانے میں رومانیت کی بنیاد سجاد حیدر یلدرم نے رکھی ہے۔ ڈاکٹر ثریا حسین نے خود یہ بات وثوق کے ساتھ کہی ہے اور وقار عظیم کے حوالے سے بھی لکھا ہے کہ مذکورہ دونوں چیزوں کے بانی یلدرم ہی ہیں:

''1980 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اتر پردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے دو روزہ سیمینار ہوا جس میں پہلی بار تمام محققین نے یکجا ہو کر یلدرم کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد یہ بات ابھر کر سامنے آئی کہ پریم چند کا پہلا افسانہ 'عشق دنیا و حب وطن' رسالہ زمانہ میں اپریل 1908 میں شائع ہوا تھا جبکہ یلدرم اس سے پہلے کئی افسانے لکھ چکے تھے۔ اس کے ساتھ ایک اور بات کھل کر سامنے آئی کہ نیاز فتحپوری کو جو رومانی اور ادب لطیف کا بانی شمار کیا جا رہا تھا در اصل انھوں نے اور دوسرے ادیبوں نے یلدرم کے اسلوب سے متاثر ہو کر اور ان کے تتبع میں چند سال بعد لکھنا شروع کیا تھا''۔[3]

پروفیسر وقار عظیم نے 1971 میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کے 'مطالعۂ یلدرم' کا دیباچہ لکھتے ہوئے اپنی رائے تبدیل کی اور فرمایا جس طرح اردو کے پہلے افسانہ نگار پریم چند نہیں یلدرم ہیں اسی طرح اردو افسانے میں رومانیت کی تحریک کی بنیاد ڈالنے کا سہرا بھی انہی کے سر جاتا ہے''۔[4]

جو علمی و ادبی صلاحیت قرۃ العین حیدر کی شہرت کا باعث بنی اس میں والد کے ساتھ ساتھ والدہ کی بھی پوری پوری شرکت رہی ہے۔ اور کیوں نہ ہو قرۃ العین حیدر کا ننہال بھی علم و ادب کا گہوارہ تھا۔

''نند کشور وکرم نے لکھا ہے یلدرم کی نانی ام مریم نے قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا''۔[5]

خواتین فکشن نگار کی دنیا میں نذر سجاد حیدر پایہ اول کی افسانہ نگار ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی والدہ نذر سجاد حیدر کی پیدائش ایک قول کے مطابق 1894 اور ایک قول کے مطابق 1892 میں صوبہ سرحد میں ہوئی۔ ان کے پردادا معصوم علی (مصنف 'انشائے معصوم') سلطنت اودھ میں ناظم تھے۔ اور ان کے والد (نذر سجاد حیدر کے دادا) خان بہادر میر قائم علی کو پنجاب کے قانون اراضی کی تشکیل و تنظیم کے لیے منتخب کیا گیا۔ نذر سجاد حیدر کے والد میر نذر الباقر فوج کے محکمہ سپلائی میں بطور ایجنٹ صوبہ سرحد میں مامور رہے۔

قرۃ العین حیدر کی والدہ کا اصل نام نذر الباقر اور نذر زہرا بیگم تھا۔ 1912 میں سجاد حیدر سے نکاح کے بعد انھوں نے اپنا نام نذر سجاد حیدر رکھ لیا۔ جمیل اختر نے اس نکاح سے متعلق بہت ہی خوبصورت شعر درج کیا ہے:

نذر زہرا نذر حیدر ہو گئیں
نذر بی بی نذر شوہر ہو گئیں

نذر سجاد حیدر شادی سے پہلے نذر الباقر کے نام سے تہذیب نسواں، پھول اور دیگر رسائل میں مضامین لکھا کرتی تھیں۔ ان کی صلاحیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ان کا ناول 'اختر النسا بیگم' 1908 (1910 بھی ہے) منظر عام پر آیا تو ان کی عمر صرف چودہ سال تھی۔ اس کے بعد قرۃ العین حیدر کی والدہ نے اور بھی ناول، افسانے اور مضامین لکھے۔ نذر سجاد حیدر خاص طور پر حقوق نسواں کی خاطر ہمیشہ کمربستہ رہیں۔ خواتین اردو ادیباؤں میں نذر سجاد حیدر کو فیمنزم کا علمبردار مانا جاتا ہے۔ پروفیسر ثریا حسین نے انتخاب۔ سجاد حیدر یلدرم میں لکھا ہے:

''جس طرح اردو کے پہلے افسانہ نگار عینی کے والد یلدرم ہیں اسی طرح اردو کی پہلی خاتون افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کی والدہ نذر سجاد حیدر ہیں۔ عورتوں میں افسانوی ادب کی ابتدا انھوں نے ہی کی ہے۔ ان کے افسانے اکثر و بیشتر حقوق نسواں کی حفاظت اور آزادیٔ نسواں کی حمایت میں لکھے گئے''۔[6]

حوالہ جات

(1) مضمون، احوال و کوائف، نند کشور وکرم۔ ایک مطالعہ: قرۃ العین حیدر۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ص نمبر 26، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2001۔

(2) قرۃ العین حیدر شخصیت اور فن۔ مرتبین، ہمایوں ظفر زیدی و محفوظ عالم۔ کتاب نما کا خصوصی شمارہ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی)۔

(3) انتخاب۔ سجاد حیدر یلدرم، مرتبہ پروفیسر ثریا حسین، ص نمبر 23-24، اتر پردیش اردو اکادمی 1985)۔

(4) قرۃ العین حیدر کے ناولوں کا موضوعاتی مطالعہ: ڈاکٹر زرنگار یاسمین، ص نمبر 14، کتابی دنیا، دہلی 2012)۔

(5) انتخاب۔ سجاد حیدر یلدرم، مرتبہ پروفیسر ثریا حسین، ص نمبر 23-24 اتر پردیش اردو اکادمی، 1985)۔

(6) زندگی نامہ قرۃ العین حیدر۔ جمیل اختر۔ ص نمبر 11 سے 14، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2014۔

■

Mahtab Alam Faizani
Room No.21 Old Boys Hostel
Maulana Azad National Urdu Univesity
Gachibowli,Hyderabad T.S 500032
E-mail: ansarimahtaab@gmail.com
Mob.:7416646297/8897762531

سوشلزم کا شیدائی
کیفی اعظمی

بی محمد داؤد محسن

کیفی اعظمی کا اصلی نام سید اطہر حسین رضوی تھا۔ وہ ایک روایت پرست اور مذہبی گھرانے میں مورخہ 14 جنوری 1919 کو ضلع اعظم گڑھ کے موضع مجواں میں پیدا ہوئے۔ والدین انھیں ایک مولوی بنانا چاہتے تھے لیکن اس کے برعکس کیفی اعظمی نے کمیونزم کو اپنا شعار بنالیا اور وہ انقلابی روش پر چل پڑے۔

کیفی اعظمی نے ایک غلام ملک میں ایک ایسے وقت میں آنکھیں کھولیں جب کہ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ ایک طرف فرنگیوں کا جبر و تشدد تھا تو دوسری طرف انقلابی صدائیں گونج رہی تھیں۔ ادبا و شعرا نے بھی اس انقلاب سے متاثر ہوکر عوامی بیداری پیدا کرنے کا بیڑا اٹھایا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ جب کیفی اعظمی کی شاعری کی شروعات ہوئی وہ ترقی پسند تحریک کا زمانہ تھا جس میں انقلاب، بغاوت اور نعرہ بازی کی گونج اور گرج تھی۔ کیفی اعظمی نے تقریباً پندرہ سال کی عمر میں شعرگوئی کا آغاز کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے گیارہ سال کی عمر میں پہلی غزل کہی تھی جس کا پہلا مصرعہ یہ تھا۔

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے

اس زمانے سے لے کر وفات تک کیفی اعظمی نے مسلسل شاعری کی اور اپنے کلام کے مخصوص رنگ اور اپنی فکر و نظر کی امتیازی حیثیت کی وجہ سے ترقی پسند شعرا میں ایک مقام حاصل کرلیا۔ عام شعرا کی طرح ان کی شاعری کی شروعات بھی رومانیت سے ہوئی اور انھوں نے رومانیت سے بھرپور دلآویز اور پرکشش نظمیں کہیں جن کی بدولت وہ عام نوجوانوں ہی میں نہیں بلکہ مزدوروں اور محنت کشوں میں بھی بہت جلد مقبول ہوگئے۔ نظم 'تصور' کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

ہزاروں جادو دکھا رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

کیفی اعظمی کے کلام میں رومانیت کے شانہ بہ شانہ انقلابیت نے بہت جلد جگہ لے لی۔ جس سے انقلاب و رومان کا امتزاج ہوتا گیا۔ رومان اور انقلاب کی جو

> ,,
> کیفی اعظمی نے ایک غلام ملک میں ایک ایسے وقت میں آنکھیں کھولیں جب کہ ہر طرف افرا تفری کا عالم تھا۔ ایک طرف فرنگیوں کا جبر و تشدد تھا تو دوسری طرف انقلابی صدائیں گونج رہی تھیں۔ ادبا و شعرا نے بھی اس انقلاب سے متاثر ہوکر عوامی بیداری پیدا کرنے کا بیڑا اٹھایا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔
> ‘‘

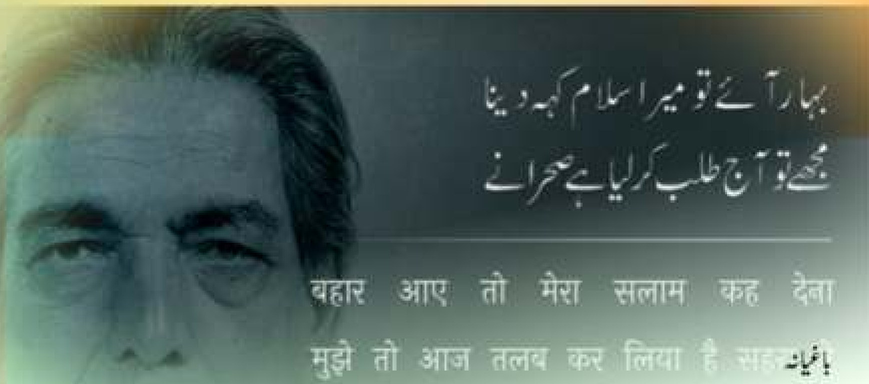

کیفیات دیگر ترقی پسند شعرا فیض، مخدوم، علی سردار جعفری اور مجاز وغیرہ کے یہاں پائی جاتی ہیں وہی کیفیات کیفی اعظمی کے یہاں بھی پائی جانے لگیں۔ مگر ان کے یہاں خطابت اور نعرہ بازی ملتی ہے جس کے بغیر عوام، مزدور، کسانوں اور کاشتکاروں کو اپنے فن کے ذریعے متوجہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ انھوں نے رومانیت اور انقلاب کو اعتدال اور توازن کے ساتھ کئی نظموں میں پیش کیا ہے۔ جس کی بہترین مثال نظم 'عورت' ہے۔ جس میں عورت کو دلکش انداز میں حالات سے آگاہ کرتے ہوئے تحریک آزادی سے وابستہ ہونے کی تلقین کرتے ہیں:

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اڑنے کھلنے میں ہے نکہت خم گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

زندگی کی مصروفیات میں رومانیت کے لیے وقت نہیں رہا تو نظم 'اندیشہ' میں یوں کہتے ہیں:

روح بے چین ہے اک دل کی اذیت کیا ہے
دل ہی شعلہ ہے تو یہ سوز محبت کیا ہے
وہ مجھے بھول گئے اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا

پشیمانی، ٹرنک کال، تبسم وغیرہ اسی نوعیت کی مشہور و مقبول نظمیں ہیں۔ انھوں نے ہنگامی واقعات کو اکثر نظم کیا اور زیادہ تر فرمائشی نظمیں لکھیں۔ گاندھی جناح کی ملاقات، سوویت یونین اور ہندوستان، فتح برلن، قومی حکمراں وغیرہ شبلی اور ظفر علی خاں کی نظموں کی طرز میں لکھی گئی مشہور نظمیں ہیں۔ انھوں نے علامہ اقبال کی 'شکوہ' کی طرز میں بھی نظم 'سپردگی' لکھی۔ کیفی اعظمی کو مزدوروں اور کسانوں سے جو جذباتی وابستگی تھی اس کا اظہار انھوں نے متعدد نظموں مثلاً سرخ جنت، روسی عورت کا نعرہ، اسٹالن کا فرمان، پگار اور پہرا وغیرہ میں کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

کیفی اعظمی نے ترقی پسندی کے باوجود مشرق کے شعری سرمایے اور روایتی اقدار سے استفادہ کیا۔ بعض جگہ وہ لہجے کی سادگی اور روانی میں اقبال اور جوش کی بلند آہنگی سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں احتجاجی لہجہ، باغیانہ انداز، انقلابی رویہ اور خطابت موجود ہے۔

لیکن ان میں بے ساختگی، نرمی، سبک روی اور مترنم اسلوب ملتا ہے۔ جس سے ان کی نعرہ بازی اور گونج گرج کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اکثر مزدوروں کی احتجاجی ریلیوں اور اجتماعات میں اپنی نظمیں سناتے ہوئے محنت کشوں میں عدل و انصاف کے لیے جدوجہد کے لیے تیار کیا۔ ان کی نظم 'پگار' محنت کشوں میں کافی مقبول ہوئی۔

کیفی اعظمی کی شاعری نفرت کے سینوں کو چیر کر محبت کے بیج بونے والی شاعری ہے۔ ان کی شاعری میں 'ہیومنزم' ہے۔ انسانی اقدار سے ان کا ذہنی اور فکری رشتہ ہے اور ہر قدم پر امید سے وابستگی کا درس ملتا ہے۔ نظم 'امید' میں اس کیفیت کو دیکھیے:

ایک دو بھی نہیں، چھبیس دیے
ایک ایک کر کے جلائے میں نے
ایک دیا نام کا یکجہتی کے
روشنی اس کی جہاں تک پہنچی
قوم کو لڑتے جھگڑتے دیکھا
ماں کے آنچل میں جتنے پیوند
سب کو ایک ساتھ ادھڑتے دیکھا
دور سے بیوی نے جھلا کر کہا
تیل مہنگا بھی ہے ملتا بھی نہیں
کیوں دیے اتنے جلا رکھے ہیں
اپنے گھر میں نہ جھروکہ نہ منڈیر
طاق سپنوں کے سجا رکھے ہیں
آیا غصہ کا ایک ایسا جھونکا
بجھ گئے سارے دیے
ہاں مگر ایک دیا نام ہے جس کا امید
جھلملاتا ہی چلا جاتا ہے

کیفی اعظمی نے ایک کامیاب زندگی گذاری۔ دنیا والوں نے ان کی خدمات کا اعتراف بھی کیا اور انھیں کافی عزت و شہرت سے نوازا۔ اردو کے بہت کم ادبا و شعرا گزرے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں شہرت پائی۔ فیض، مجروح اور سردار جعفری کی طرح انھوں نے بھی اپنی آنکھوں سے شہرت دیکھی۔ انھیں بے شمار ایوارڈ، خطابات اور انعامات دیے گئے۔ کیفی اعظمی فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے تو اسکرین پلے اور مکالموں کے لیے انھیں نیشنل ایوارڈ اور فلم فیئر ایوارڈ بھی حاصل ہوئے۔ کئی بہترین فلمی نغموں کے علاوہ ان کے شعری مجموعوں میں جھنکار، آخر شب اور آوارہ سجدے ہیں۔ ایک طویل نظم 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' جسے بعض لوگ اقبال کی نظم 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' کی توسیع قرار دیتے ہیں۔ منظر عام پر آچکی ہے۔ ایک کلیات 'سرمایہ' بھی شائع ہو چکا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کیفی اعظمی کی ادبی موت واقع ہو کر ایک زمانہ گذر گیا تھا جسمانی اور ذہنی طور پر دس گیارہ سال کے عرصہ سے وہ ادھ مرے تھے۔ مگر ان کی آنکھوں میں ایک خوبصورت ہندوستان کا خواب تھا۔ ان کے آخری دنوں کی نظموں میں مایوسی کی جھلک دکھائی دیتی ہے:

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا
نئی زمین، نیا آسماں نہیں ملتا
نئی زمین، نیا آسماں بھی مل جائے
نئے بشر کا کہیں کچھ نشاں نہیں ملتا
وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل میرا
کسی کے ہاتھ کا اس پر نشاں نہیں ملتا
وہ میرا گاؤں ہے وہ میرے گاؤں کے چولھے
کہ جن میں شعلے تو شعلے دھواں نہیں ملتا

کیفی اعظمی نے ایک بار کہا تھا۔ ''میں غلام ہندوستان میں پیدا ہوا ہوں آزاد ملک میں جی رہا ہوں اور میری یہ آرزو ہے کہ جب میرا اس دنیا کو آخری سلام کرنے کا وقت آئے گا میری آرزو ہے کہ میرا دیش سوشلسٹ ملک ہوگا''۔ مگر افسوس کہ خوابوں کی دنیا میں جینے والے شاعر کیفی تمام خواب اپنی پلکوں پر سجائے اس دار فانی سے چل بسے۔ مگر ایسا کلام اور نغمے چھوڑ گئے جو انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

■

Dr. B. M. Davood Mohsin
Principal, S.K.A.H Millath College
Davangere- 577001 (Karnataka)
Mob.:09449202211
E-mail.: drmohameddavood@gmail.com

پیغام آفاقی کا ’مافیا‘

رقیہ نبی

پیغام آفاقی کا اصلی نام اختر علی فاروقی اور قلمی نام پیغام آفاقی ہے۔ اردو دنیا میں ان کی شہرت اسی ادبی نام سے ہوئی ہے۔ ان کی پہلی تخلیق ناول ’مکان‘ کے فلیپ پر ان کی تاریخ پیدائش 10 جنوری 1956 درج ہے۔

پیغام آفاقی نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز ناول ’مکان‘ کی اشاعت کے ساتھ 1989 میں کیا۔ جس کے ذریعے انھوں نے عورت کو ایک مکمل انسان کی حیثیت سے پیش کیا اور ساتھ ہی عورت کو بہادر، باہمت اور باحوصلہ بننے کے لیے بھی اکسایا۔ اپنی دیگر تخلیقات خاص کر ’مافیا‘ اور ’درندہ‘ کے ذریعے ہمیں شہری و دیہی زندگی کے مسائل اور عصر حاضر کے انسان کی بے بسی کی اصل وجہ تک پہنچانے کی بہترین کوشش کی۔ ان کی فکر کا مرکز یہی ہے کہ انسان اپنی حقیقت کو پہچانے اور اس سائنٹفک دور میں اپنی شناخت کو برقرار رکھے نہ کہ خاموشی سے مٹنے دے۔ ان کا ادبی سرمایہ ’مکان‘ 1989، ’مافیا‘ 2002، ’درندہ‘ 2004 اور ’پلیتہ‘ 2010 پر مشتمل ہے جو اگرچہ قلیل ہے لیکن انھیں اردو ادب میں رہتی دنیا تک زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ پیغام آفاقی کے تعلق سے غضنفر علی لکھتے ہیں:

”اس کی شخصیت کا ایک نمایاں وصف اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ ہے۔ اسے عجلت اور جلد بازی پسند نہیں۔ جو آدمی سوچتا ہے وہ کام کرنے سے پہلے ایک ایک نقطے پر غور کرتا ہے، نشیب و فراز کو سامنے رکھتا ہے، دائیں بائیں دیکھتا ہے، ساری کڑیاں ملاتا ہے اسی لیے ایسے آدمی کا کام ٹکاؤ اور پائیدار ہوتا ہے۔ مکان اس کا واضح ثبوت ہے، جس کی تخلیق میں بائیس سال لگے۔“

(سرخ رو، غضنفر علی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2010، ص 47)

مافیا ان کے افسانوی مجموعے کا نام ہے لیکن اس مافیا میں انڈر ورلڈ کے قتل و غارت اور خون ریزی وغیرہ کا تذکرہ نہیں بلکہ سیاسی، سماجی، انسانی اور معاشرتی موضوعات سے بھری کہانیاں سیدھے سادے انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ بعد وفات پیغام آفاقی کے فن پر کئی مضامین نظر سے گزرے، جن میں دیگر افسانوں کی طرح مافیا کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ ان کی انفرادی شناخت کے لیے کافی ہے وغیرہ وغیرہ۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے افسانوی مجموعے میں اس نام سے کوئی افسانہ ہی موجود نہیں ہے پھر جس کی پذیرائی کی گئی وہ مافیا آیا تو آیا کہاں سے! حالانکہ 2009 میں اس مجموعے کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا، اور اس کی ورق گردانی کے بعد بھی مافیا نہیں ملا۔ مافیا کے تعلق سے میں نے کئی ریسرچ اسکالرز (جو میری ہی طرح ان پر تحقیق کر چکے ہیں اور کچھ کر رہے ہیں) کے ساتھ ساتھ پیغام آفاقی کی اہلیہ سے بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش لیکن ان کا کہنا بھی یہی تھا کہ اس نام سے ان کا کوئی افسانہ نہیں ہے۔ شاید یہ حضرات اسی خیال میں بنا سوچے تعریفوں کے پل باندھنے لگے کہ مجموعے کا نام مافیا ہے تو اس نام سے افسانہ بھی موجود ہوگا۔

مافیا میں شامل 26 افسانوں کو 5 حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ اور ہر حصے کا اپنا ایک مخصوص عنوان ہے۔ جیسے ’تخلیقی جہازوں کے قزاق‘، ’کائنات کی اجنبی گلیاں‘، ’موسموں کی ناقابل برداشت شدت‘، ’پر اسرار کرداروں کا جشن‘، ’کتوں کے رونے کی آواز‘۔ ہر کہانی کی ابتدا سے پہلے ہی انھوں نے اپنے مرکزی تصورات کو بیان کر دیا ہے۔ جو دوران قرأت تفہیم سے قریب تو کرتے ہی ہیں اور ساتھ ہی قاری کی دلچسپی مزید بڑھا بھی دیتے ہیں۔ مافیا میں شامل افسانے قاری کو زندگی کی پیچیدگیوں سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ ان پیچیدگیوں میں اتر کر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور ساتھ ہی ہمارے معاشرے میں استحصال کی غلاظتوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ان کو معاشرے سے ہٹانے پر بھی انسان کو آمادہ کرتی ہیں۔ قدیم اور جدید تہذیب کے ٹکراؤ کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

مافیا کی ایک پراسرار کہانی ’لوہے کا جانور‘ ہے۔ یہ اس وقت کی کہانی ہے جب مشینی ترقی ہندوستان کے گاؤں گاؤں تک پہنچ رہی تھی، جو کسان ہل چلا کر اپنے کنبے کے لیے روزی روٹی کماتے تھے، وہ اس تبدیلی سے دوچار تھے اور یہ فکر ستانے لگی تھی کہ اب دو وقت کی روٹی کا انتظام کیسے کیا جائے۔ اس افسانے کی وساطت سے پیغام آفاقی نے یہی پیغام دیا ہے کہ مشینی ترقی کی وجہ سے غریب ہل چلانے والے کسانوں کی زندگیاں کس کرب سے گزرنے لگیں، بے بسی کے عالم میں یہ لوگ اپنے بیوی بچوں کو دو وقت کی روٹی فراہم کرنے سے قاصر تھے اور اثاث البیت کو فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

”وہ سو گیا تھا لیکن یکا یک کسی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ بخار سے کراہتا ہوا وہ اُٹھ کر بیٹھا۔ بغل کی گلی سے ٹریکٹر گزر رہا تھا اور اس کے بچے سب بھول کے ٹریکٹر کو دیکھ کر تالیاں بجا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دور دور تک اُداسی چھا گئی۔ سامنے پیپل کے پیڑ سے پرانے پتے گر کر فرش ہو گئے تھے اور نئی کونپلیں چمک رہی تھیں۔ شام کی سنہری کرنیں اب زرد ہو کر دھندلا گئی تھیں۔ وہ اُٹھا، گھر میں بچا ہوا آخری پیتل کا لوٹا لے کر ہاتھ سے تولا اور چپکے سے گھر کے باہر نکل گیا۔ بخار سے جلتا ہوا بدن اس کو لے کر گر جانا چاہتا تھا، لیکن وہ شہر کی طرف جانے والی سڑک پر بڑھتا ہی جا رہا تھا...“

(لوہے کا جانور، مشمولہ: مافیا، پیغام آفاقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2002، ص 91)

یہاں جدید دور کی مشینی ترقی سے ایک طرف نئی نسل میں خوشی کی لہر دوڑ اُٹھتی ہے وہ مسرت سے اس نئی تبدیلی کا استقبال کرتے ہیں وہیں دوسری طرف پرانی

نسل پر یہ دور حد درجہ گراں گزرا۔ ساتھ ہی ہل کے بمقابل ٹریکٹر کی اہمیت کے ذریعے پیغام آفاقی یہ بھی باور کرا رہے ہیں کہ آج ہر طرف کمزور کے مقابلے طاقتور کا دبدبہ ہے۔

'پیتل کی بالٹی' ان کا ایک اور عمدہ افسانہ ہے۔ یہاں دیہات میں پلی بڑی لڑکی وندنا شادی کے بعد شوہر کے ساتھ شہر کا رخ کرتی ہے، جہاں اسے ضروریات زندگی کی ہر چیز میسر ہے پر وندنا کو نہ اطمینان ملتا ہے نہ سکون۔ ہر بات پر وہ اپنے شوہر 'روی' سے جھگڑنے لگتی ہے، پل میں رونا، پل میں ہنسنا اور پل میں بھڑک جانا اس کا روز کا معمول بنا ہے۔ وندنا کا رویہ 'روی' کی سمجھ کے باہر ہے لیکن اس کی باتوں سے صاف جھلکتا ہے کہ وہ لاکھ کوششوں کے باوجود بھی اس جدید زندگی سے خوش نہیں ہے۔ وہ روی سے کہتی ہیں:

''ایک چراغ جلا دیا کرتی تھی روزانہ شام اپنے گھر میں، گاؤں میں تھی تو کیسی روشنی ہو جاتی تھی۔ اب سوئچ switch دبا دیے اور روشنی بھک سے...''

(پیتل کی بالٹی، مشمولہ: مافیا: پیغام آفاقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2002، ص 81)

اور جب اسے پیتل کی بالٹی ملتی ہے تو سارے کپڑے واشنگ مشین کے بجائے پیتل کی بالٹی میں دھونے لگتی ہے۔ پیتل کی بالٹی میں کپڑے دھونے سے اسے جو خوشی اور اطمینان ملتا ہے، وہ جدید مشین سے ملنا شاید ذرا مشکل تھا۔ حالاں کہ واشنگ مشین کے ساتھ اس کے پاس پلاسٹک کی بالٹی بھی ہے تو پھر وہ پیتل کی بالٹی میں ہی کپڑے کیوں دھو رہی تھی؟ کیوں پورے گھر میں پیتل کی بالٹی کا شور مچا دیا تھا؟ قاری کے ذہن میں یہ سوال بھی اُبھرتا ہے۔ غالباً اس کی ایک وجہ 'روی' کی توجہ پانا ہے یا پھر وہ دیہی ماحول میں پلی بڑھی ہے اور شہری زندگی میں گھل مل جانے کے بعد اور ساری جدید آسائشوں کے باوجود بھی اسے وہ مسرت اور سکون نہیں مل پاتا، جو دیہی زندگی میں میسر تھا۔ بقول مصنف یہ کہانی جدید زندگی کی اداسی کی کہانی ہے۔

افسانہ 'گلاس' اس حقیقت سے آشنا کراتا ہے کہ آج کا انسان ذرا سی مسرت کے لیے دوسروں پر کس طرح ظلم کیے جا رہا ہے اور ان کی تکلیف میں اپنے لیے خوشی پاتا ہے۔ یہاں ایک آدمی کیڑے کو مارنے کی غرض سے اس پر گلاس رکھ دیتا ہے لیکن گلاس کے نچلے حصے میں تھوڑی سی جگہ ہونے کے سبب کیڑا مرنے سے بچ جاتا ہے البتہ وہ گلاس میں قید ہو جاتا ہے، جس سے باہر نکلنے کی وہ ایک ناکام کوشش مسلسل کرتا رہتا ہے۔ دراصل یہاں کیڑا ان تمام مظلوم لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے، جو طاقت ور طبقے کے معمولی سے فائدے یا ذرا سی مسرت کے لیے ذہنی اور جسمانی اذیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

'کیا کہہ رہے ہو' میں مصنف نے صرف دو صفحوں پر ڈھائی ہزار سال کے تجربات کا بہترین نچوڑ پیش کیا ہے۔ مرکزی کردار کے ایک خاندانی بزرگ نے ڈھائی ہزار سال پہلے اپنی ملکیت کے کھیتوں کے سامنے تالاب کے گھاٹ کا نقشہ بنایا تھا اور مرکزی کردار کو اس کھیت کی رجسٹری کے کاغذات 1912 میں ملتے ہیں، وہ اسی کھیت پر 1946 کے تقسیم ملک اور فسادات کے بعد بھی کھیتی کر کے زندگی بسر کرتا ہے کہ 1992 کے آخری دنوں میں کچھ لوگ آ کے اسے ذرا دھمکا کے زمین چھوڑنے کی دھمکی دیتے ہیں کہ یہ زمین جس پر وہ کاشت کر رہا ہے ان کی ہے نہ کہ اس کی خود کی۔ وہ حیرت زدہ ہو کر اس کی زمین کو اپنی کہنے کے دعوے داروں سے خوف کھا کے سہمنے لگتا ہے کہ اب وہ اپنی ہی ملکیت کے کھیتوں سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ لیکن اپنے جوان، شاداب اور توانا بیٹے کو وہاں دیکھ کر اسے خوشی اور اطمینان ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اس کا نوجوان بیٹا ایک توانا اور شاداب بانس کی کونپل لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ایسے متحیر ہیں جیسے ابھی وہ مٹی کے اندر سے انکور کی طرح نمودار ہوا ہو...وہ چپ چاپ عقابی نگاہیں اٹھا کر درختوں کے اوپر دیکھتا ہے اور آرام سے بایاں پاؤں سرکا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

'ادھر مجھ سے بات کرو'

وہ آئے ہوئے اجنبی لوگوں کو مخاطب کرتا ہے اور آرام سے ایک بیڑی سلگاتا ہے

'ہاں اب کہو کیا کہہ رہے تھے۔''

(کیا کہہ رہے ہو: پیغام آفاقی، مشمولہ مافیا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2002، ص 59)

مرکزی کردار کا بیٹا عصر حاضر سے تعلق رکھتا ہے، اس میں سیاسی معاملات و مسائل اور حق و ناحق کی شناخت کا شعور ہے۔ اس افسانے کے ذریعے پیغام آفاقی یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ نئی نسل ذہنی طور پوری طرح بیدار ہے اور وہ کسی کے ڈرانے دھمکانے سے اپنا ملک نہیں چھوڑیں گے نا اپنی کسی چیز پر کسی غیر کا قبضہ ہی ہونے دیں گے۔ وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''پیغام آفاقی ایک ایسے ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں جنہوں نے زندگی کے بیشتر مرحلے میں قوت کے نا زیبا استعمال کو نگاہ میں رکھا ہے۔ لہٰذا ان کے یہاں ایسی قوتوں سے لڑنے کا عزم نمایاں طور ملتا ہے، ملک کی انتظامی کے یہ بھیدی استحصال کے تمام تر احوال سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ ان سے نبرد آزما ہیں۔ کہیں مات اور شکست کی باتیں نہیں کرتے۔ حوصلے اور عقلمندی سے ایسے تمام منفی عناصر سے ٹکرانا چاہتے ہیں...ان کے نئے افسانے کے مجموعے میں اس کی مختلف شقیں اور کیفیتیں بڑی شدت کے ساتھ سامنے آئی ہیں...''

(مابعد جدیدیت مضمرات وممکنات: وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2003، ص 326)

الغرض مافیا میں شامل پہلی کہانی 'بھونکمپ اور جوالا مکھی' سے آخری کہانی 'بوڑھا ملازم' تک ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کہانیوں میں مصنف نے الگ الگ قسم کے مسائل سے پردہ اٹھایا ہے۔ ان کہانیوں میں موجودہ زمانے کے دیگر رنج و الم کے ساتھ ساتھ رشتے ٹوٹنے کے کرب کے عناصر موجود ہیں۔ اگر چہ یہ عناصر دیگر ادبا کی بیشتر تخلیقات میں بھی ملتے ہیں مگر پیغام آفاقی کے افسانے اس کرب کی اصل وجہ تک ہمیں پہنچاتے ہیں۔ پیغام آفاقی ایسے معاشرے کے خواہاں تھے جس میں کسی قد آور شخص کے سبب معصوم ومظلوم لوگوں کے دلوں میں دہشت و خوف نہ پیدا ہو، پھر وہ حاکم ہو، پڑوسی ہو، دوست ہو یا شوہر وغیرہ۔ اور یہی پیغام ان کی تقریباً سبھی تخلیقات میں پنہاں ہے۔ مافیا کے ذریعے پیغام آفاقی ملک کے اقتصادی اور معاشرتی مسائل کو بروئے کار لانے کی بہترین کوشش کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ انہوں نے ناول نگاری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری میں بھی ایک الگ اور نئی راہ متعین کی ہے، جس پر چلنا نئے لکھنے والوں کے لیے فخر کا باعث ہو سکتا ہے۔

■

Ruqayya Nabi
Ph.D Research Scholar, Maulana Azad National Urdu University, Gachibowli, Hyderabad
Hyderabad - 500032 (Telangana)

OUDH AKHBAR

LUCKNOW

اودھ اخبار

1st January, 1875.

اشتہار

لکھنؤ

فرح ہاشم

لکھنؤ کی صحافتی خدمات

لکھنؤ اپنی زبان و تاریخ اور تہذیب کے لیے مشہور ہے۔تقریباً 136 سال تک نوابین کی حکومت اس شہر میں قائم رہی۔اپنی مخصوص تہذیب کے ساتھ یہاں اردو زبان و ادب کو فروغ حاصل ہوا۔اس کے فروغ میں اردو صحافت کا اہم کردار رہا ہے۔اخبارات و رسائل میں ادبی گوشے کے ذریعے اردو ادب کو بھی ترقی مل رہی تھی۔لکھنؤ کے تمام اخبارات میں اس وقت کی تاریخ اور ادب دونوں ہی نظر آتے ہیں۔ اس وقت ملک میں انگریزوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔لکھنؤ میں مغل دور کا خاتمہ ہو چکا تھا۔بہادر شاہ ظفر کے خلاف جب انگریزوں نے مقدمہ چلایا۔طلسم اخبار کے شمارہ 16 دسمبر 1856 کو بطور ثبوت پیش کیا گیا۔انگریزوں کا اقتدار قائم ہونے کی خبر جنوری 1857 کے شمارہ میں شائع ہوئی جس کا عنوان ہے۔'لکھنؤ'

''لکھنؤ میں سنیچر آیا ہے۔چوروں نے ہنگامہ مچایا ہے جو سانحہ ہے عجائب ہے، آنکھ جھپکی پگڑی غائب ہے۔

میر صاحب زمانہ نازک ہے

دونوں ہاتھوں سے تھام لو دستار

''جس دن سے سلطنت نہ رہی۔شہر بگڑا چوروں کی بن آئی، اس اندھیر پر ایک مثل یاد آئی کہ اندھے کی جورو کا خدا رکھوالا ہے۔اس شہر میں اندھا دھندی ہے۔ اس نابینائی پر یہ حکومت اندھیر ہے۔صاف اندھے کے ہاتھ میں بٹیر ہے۔روزانہ باتیں عجائب ہوتی ہیں۔سوجھتا تو خاک نہیں، ٹٹول ٹٹول کر چٹھیاں غائب ہوتی ہیں۔''[1]

طلسم لکھنؤ کی زبان افسانوی انداز میں تھی اور اشاروں میں انگریز حکومت پر طنز کیا جاتا تھا۔طلسم لکھنؤ اودھ میں انگریزوں کے قبضے کے پانچ مہینے بعد یعنی 25 جولائی 1856 کو جاری ہوا۔مولوی محمد یعقوب انصاری اس کے مدیر تھے۔اخبار کے نام کے نیچے حمد و نعت کے یہ شعر لکھے جاتے تھے:

عنوان صحیفہ حمد حق ہے

زیبائش اول ورق ہے

پھر نعت ہے سید البشر کی

جس نے بچی ہمیں خبر دی

'طلسم لکھنؤ'، لکھنوی طرز فکر، تہذیب اور پر تکلف اسلوب نگارش کا مرقع تھا۔اس کے صفحات پر اودھ کے باشندوں کے ان شدید احساسات و جذبات کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔جو انگریزوں کی غاصبانہ کارروائی کے ردعمل میں پیدا ہوئے تھے۔

طلسم لکھنؤ کی اشاعت کے پانچ مہینے بعد 17 نومبر 1856 کو ہفتہ وار 'سحر سامری' شائع ہوا۔اس کے پہلے مدیر امیر مینائی تھے۔دوسرے رگھبیر نارائن عیاش مدیر مقرر کیے گئے۔اخبار کے پہلے صفحے پر ایک دلچسپ اشتہار شائع ہوتا تھا۔یہ اشتہار اردو صحافت کے ابتدائی دور کی بے حد دلچسپ تصویر پیش کرتا ہے۔یہ اشتہار کچھ اس طرح ہے:

اے خامہ لکھ اشتہار اخبار　　عالم کو ہے انتظار اخبار

اشاعت کا دن:

لکھ دے چھپے گا پیر کے روز　　منگل کو یہ ہوگا جلوہ افروز

چمکے گا یوں ہی کوکب طبع　　ذی روح بنے گا قالب طبع[2]

'سحر سامری' میں خبریں دوسرے صفحے سے شروع ہوتی تھیں۔پہلے کالم میں لکھنؤ کے عنوان سے مقامی خبریں اور پھر دوسرے شہروں اور ملکوں کی خبریں درج کی جاتی تھیں۔لکھنؤ کی تازہ خبر ملنے پر ضمیمہ بھی شائع ہوتا تھا۔وسیم احمد سعید تحریر فرماتے ہیں۔

''جدید اصطلاح میں اخبار پبلک کے لیے براہ راست خبریں فراہم کرتا ہے اور اس کے لیے چھاپہ خانے کا ہونا لازمی ہے۔اودھ کے اولین اخباروں میں طلسم لکھنؤ اور سحر سامری کا ذکر آتا ہے۔یہ دونوں اخبار واجد علی شاہ کے لکھنؤ سے جانے کے بعد جاری ہوئے۔نوابین کے دور حکومت میں کوئی اخبار جاری نہیں ہوا لیکن اس دوران اردو زبان و ادب ثقافت، فنون لطیفہ کو جو فروغ ملا۔ اس سے اودھ میں ادبی صحافت کو پروان چڑھنے میں ذرا بھی وقت نہیں لگا۔''[3]

منشی نول کشور کا اخبار 'اودھ اخبار' 26 نومبر 1858

کو شائع ہوا۔ اخبار کے پہلے صفحے میں اشتہار اور ضروری اعلانات ہوتے تھے لیکن بعد میں تبدیلی ہوگئی۔ اودھ اخبار میں مختلف ادبی و علمی اداروں اور انجمنوں کی رپورٹیں اور ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں، مشاعروں اور جلسوں کی اطلاعات بھی شائع ہوتی تھیں۔ اکثر شعراء کا کلام چھپتا تھا۔ چند شخصیتوں کے نام اس طرح ہیں۔

''اودھ اخبار کی فائلوں میں مرزا غالب، میرانیس مرزا دبیر، حاتم علی خان مہر، مرزا ہر گوپال تفتہ، کلب حسین خان نادر، مردان علی خان رعنا، سرسید احمد خاں اور محسن الملک جیسے بلند پایہ شاعروں اور نثر نگاروں کے بارے میں مفید اور وسیع معلومات ملتی ہیں۔ اول الذکر شعرا کی تاریخ ہائے وفات بھی بہ کثرت چھپی ہیں۔''4

اودھ کو اپنے زمانے میں اردو کا بہترین اخبار تسلیم کرلیا گیا تھا۔ اودھ اخبار بیسویں صدی میں بھی شائع ہوتا رہا۔ اس صدی میں اخبار کی ادارت سے مولوی عبدالحلیم شرر، شیو پرشاد، طوطا رام شایاں، امجد علی شہری، مرزا حیرت دہلوی، جالب دہلوی، یاس یگانہ چنگیزی، مرزا محمد عسکری اور پیارے لال شاکر جیسی ممتاز ادبی علمی ہستیاں بھی وابستہ رہیں۔ اودھ اخبار سے اردو صحافت میں اخبار کی عظمت اور اس کی وسعت کے امکانات کا اندازہ کیا گیا۔

یکم جون 1877 کو اودھ اخبار روز نامہ ہو گیا۔ روزنامہ کے ساتھ ساتھ ایک ہفتہ وار ایڈیشن بھی شائع ہوتا تھا۔ رتن ناتھ سرشار جس سال اخبار سے وابستہ ہوئے انھوں نے اپنے ناول 'فسانہ آزاد' کی قسط وار اشاعت کی۔ اس میں لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے۔ فسانہ آزاد کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ دوسری قسط میں آگے کا ناول پڑھنے کا انتظار رہتا تھا۔ اس کے مضامین شائستہ اور سنجیدہ تھے۔ زبان سادہ اور سلیس تھی فارسی کے اثر سے آزاد تھی۔ اودھ اخبار کے موضوعات سماجی، سیاسی، ادبی نوعیت کے ہوتے تھے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے تعلقات پر بھی لکھا جاتا تھا۔

لکھنؤ سے جاری اخبار 'اودھ پنچ' کا مقام اردو صحافت میں قابل قدر ہے۔ جس نے زبان و ادب کی ترقی کے پیش نظر اپنی خدمات انجام دیں۔ منشی سجاد حسین کا اخبار جب منظر عام پر آیا اس وقت لکھنؤ میں اردو صحافت کی شروعات ہو چکی تھی۔ اودھ پنچ نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں اس وقت مختلف رجحانات میں تصادم تھا۔ دو طرح کے طبقے نظر آ رہے تھے ایک طبقہ انگریزوں کی نقالی کر رہا تھا دوسرا طبقہ مغربی تہذیب کا سخت مخالف تھا۔ اودھ پنچ کے ذریعے اردو شاعری میں طنز و مزاح کی شروعات ہوئی۔ وزیر آغا تحریر فرماتے ہیں۔

''اودھ پنچ 1877 میں منظر عام پر آیا اور اشاعت پذیر ہوتے ہی فضا قہقہوں سے لبریز ہوگئی۔ طنز و مزاح کا ایک سیلاب تھا مسکراہٹوں کو اپنے جلوے میں لیے امڑا اور چاروں طرف پھیل گیا۔ اور شاعروں اور مضمون نگاروں کا ایک پورا گروہ طنز و مزاح کے حربوں سے ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو نشانہ تمسخر بنانے لگا۔ یوں تو اودھ پنچ نے طنز و مزاح لکھنے والوں کا ایک پورا حلقہ پیدا کیا۔ جن میں شوق، برق، پینٹ، ٹریڈ مارک، مولانا جنوبی، عرش، لا ابالی اور درجنوں دوسرے شعراء شامل تھے لیکن دیکھا جائے تو اس گروہ میں چار نام زیادہ ابھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ پنڈت تربھون ناتھ ہجر، احمد علی شوق، مولوی سید عبدالغفور شہباز اور لسان العصر اکبر الہ آبادی۔ ان میں سے ہجر کی شہرت تحریف نگاری کے باعث ہے۔''5

اودھ پنچ میں پنڈت تربھون ناتھ ہجر نے غالب کی ایک غزل کی تحریف کی ہے لیکن دراصل اس کا سہارا لے کر اپنے زمانے کی بدحالی کو پیش کیا ہے۔

اک مہینے سے چپکے بیٹھے ہیں وہ کیا واقعہ نگاری ہے
بیٹھے کوئی نہ کوئی دفتر میں نادری حکم اب یہ جاری ہے
کیا کریں اب بچارے ایڈیٹر رات دن شغل آہ و زاری ہے
ہائے تخفیف اور ٹیکس کے پنچ
رو چکے سب ہماری باری ہے 6

اودھ پنچ ہندوستان کا پہلا مزاحیہ اخبار تھا۔ لفظ پنچ کو اسی نے رواج دیا۔ ابتدائی شماروں کے سرورق پر ایک مضحکہ خیز خاکہ ہوتا تھا۔ جس میں ایک شخص کی زبان باہر نکلی ہوئی ہے، اس کے دونوں ہاتھوں میں کاغذات ہیں۔ داہنے ہاتھ کے کاغذ پر قیمت درج ہے بائیں ہاتھ کے کاغذ پر اسی اخبار کا اشتہار ہے۔ اس کی ایک آنکھ میں اودھ اور دوسری میں پنچ لکھا ہوا ہے۔ اودھ پنچ کے اداریے، مضامین اور تنقید اگر ہم بغور پڑھیں اور ان کے مزاحیہ اسلوب و انداز اور طنزیہ معیار کا تجزیاتی مطالعہ کریں تو ہمیں اس وقت کے معاشرتی حالات ذہنی سطح علمی شعور کا معیار، اخلاقی و سیاسی پستی اور اس دور کی روزمرہ کی زندگی کی کشاکش کا کافی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے۔ اودھ پنچ کے نامہ نگاروں نے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان، محاوروں، کہاوتوں کو اپنے مضامین میں جگہ دی۔ اودھ پنچ کی صحافت دراصل ادبی صحافت تھی۔ جس میں قدیم و جدید رجحانات کا امتزاج تھا۔ محمد عبدالرزاق فاروقی تحریر فرماتے ہیں۔

''اودھ پنچ جس کے خمیر میں لکھنؤ کی ادبی روایات گوندھی گئی تھیں۔ اس معاملہ میں لکیر کا فقیر نہیں رہا۔ بلکہ اس نے یہ کہ اپنا فکری سرمایہ ہندوستانی مسائل سے اخذ کیا اسلوب لکھنؤ کی ادبی روایات سے اور ان کو پیش کرنے کا ڈھنگ مغربی صحافت سے لیا۔ لیکن یہاں بھی سردی گرمی اور قلم کے معرکے باقی رہے۔ البتہ ان کے معیار اور مقصد میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو چکا تھا۔ سردی گرمی کی مدح کی بجائے نیا سال، عیدِ نوروز، محرم، بقرعید، رمضان، بسنت، ہولی وغیرہ جیسی تقاریب اس کے لکھنؤ والوں کے مستقل موضوعات تھے۔ ان موضوعات پر اودھ پنچ کے شاعروں نے طویل ساقی نامے پیش کیے۔ ان میں سردی گرمی کا حال یا موسموں کا ذکر اس طرح ہوتا تھا کہ اس دور کی تہذیبی زندگی کو نظم کر دیا جاتا تھا۔''7

اودھ پنچ میں مضامین کے علاوہ نظم کا حصہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ایک ادبی خزانہ ہے۔ اس میں حکمراں طبقوں اور حاکموں کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ ہندوستانیوں کو انگریز کالا آدمی کہہ کر حقارت اور نفرت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس ذہنیت پر جناب شہرت نے ایک غزل کہی جو نومبر 1877 کے اودھ پنچ میں شائع ہوئی۔

کچھ نہیں کام ہے لیاقت کا مرتبہ ہے تو گوری رنگت کا
سول سروس سے ہو گئے محروم خانہ بربادی ایسی رنگت کا
پوشش خوش ہے کوٹ اور پتلون ہندی پہناوا ہے جہالت کا
طوف لندن کا جو ہے کر آیا نہیں قائل وہ ہوتا جنت کا
نہیں کے کہتے ہیں لوگ سب سنکر
ریختہ خمرہ ہے یہ شہرت کا

اودھ پنچ کے لکھنے والے زندہ دلی کی زندہ تصویریں ہیں جن کا نام طنز و مزاح کی دنیا میں ہمیشہ رہے گا۔ اودھ پنچ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ تیار کر لیا تھا۔ اس زمانے میں جب عام اخبار کی اشاعت دو تین سو تھی اودھ پنچ کی تیرہ ہزار کاپیاں چھپتی تھیں۔ اس اخبار نے اردو زبان کو ہر دلعزیز بنانے اور اخبار بینی کے شوق کو عام کرنے میں اہم خدمات انجام دیں۔ باکمال اہل علم کے تعاون سے اس اخبار کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔

عبدالحلیم شرر کا اخبار دلگداز 1887 میں جاری ہوا۔ جس نے اس دور کی صحافت کی نثر میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ ابتدا میں اس رسالہ میں رومانی اور تاریخی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ایک سال بعد اس میں ناول بڑھا دیا گیا۔ ان کے تاریخی ناول حسن انجلینا، منصور موہنا وغیرہ اسی اخبار میں قسط وار شائع ہوئے۔ عوام کا تجسس اس قدر بڑھ جاتا تھا کہ دوسری قسط آتے ہی اخبار ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا تھا۔ اب ہر شمارے میں شرر صاحب کے قلم سے

ایک ناول یا ڈرامہ شائع ہوتا تھا۔ یہ تخلیقات تاریخ اسلام کے واقعات پر مبنی ہوتی تھیں۔ لیکن شرر کا طرز نگارش اس قدر دلچسپ تھا کہ ان کی نگارشات سے لوگوں میں نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ ناول کے مطالعہ کے لیے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ادب کے سلسلے میں شرر نے دلگداز کا انداز اختیار کیا اور اس کے ادبی معیار کے مطابق کام کرنے کا اعلان کیا۔ اس اخبار میں مضامین کے علاوہ غیر ممالک کی خبریں درج ہوتی تھیں۔ عبدالحلیم شرر نے ایک طویل مدت تک ماہانہ دلگداز کی ادارت کی۔ یہ ان کی علمی و ادبی صحافت کا شاہکار ہے۔ اس رسالہ میں صرف ادبی مضامین ہی نہیں چھپتے تھے، بلکہ ہندوستان اور بیرون ملک کے اہم سیاسی اور تمدنی امور پر بھی اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ دسمبر 1877 کے دلگداز میں شرر اپنی صحیفہ نگاری کا مقصد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''دلگداز اردو رنگ سخن میں ایک نئی روح پھونکنے اور نئی طرح کی قوت مقناطیسی پیدا کرنے کے لیے جاری ہوا ہے.....اس میں شک نہیں کہ دلگداز اپنے رنگ میں اکیلا ہے۔''8

منشی دوارکا پرساد کا اخبار نظم 1888 میں جاری ہوا تھا۔ اخبار کے صفحہ اول پر 124 اشعار کی ایک نظم شائع ہوتی تھی۔ جس میں اخبار کی غرض و غایت بیان کی گئی تھی۔ اس کے آخری چند اشعار ہیں:

مچا دے شاعری کی اے افق دھوم
دکھا دے جلوہ اخبار منظوم

لکھنؤ کی صحافت میں گلدستوں کو ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔صحافت کے آغاز ہی سے گلدستہ جاری ہوا کرتے تھے۔آج بھی ان کارواج مشاعروں کی روداد کے طور پر قائم ہے۔اس دور کی ادبی صحافت کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے ادبی اصناف کو عوام میں مقبولیت بخشی۔لکھنوی صحافت نے ایسے تمام شعراء اور ادباء کو اپنی صفحات میں جگہ دی جن کو پہلے یہ شہرت نہ حاصل تھی اور انھیں عوام میں مقبولیت اخبارات و رسائل کے صفحات میں شائع ہونے کے بعد ملی۔

ہر اک انداز کے مضموں ہوں اس میں
مطابق نثر کے موزوں ہوں اس میں
بڑھا تاریخ سے توقیر اشعار
رقم کر بے بدل منظوم اخبار

افق نے مثنوی کے ذریعہ اپنے اخبار کے مقاصد اور خوبیاں بیان کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اخبار ہفتہ میں دو دن شائع ہوتا تھا۔ اس میں ہر انداز کے مضمون شائع ہوتے تھے۔ سوئی ہوئی قوم کو جگانے کا کام کر رہا تھا۔ یہ اخبار تار بن کر خبر کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر رہا تھا۔ گلوئے علم و فن کا ہار بن گیا تھا۔ اس کے ضمیمہ میں نثری مضامین شائع ہوتے تھے۔

اخبار ہمدم لکھنؤ سے اکتوبر 1916 کو جاری ہوا۔ جالب دہلوی اس کے مدیر تھے۔ سرورق پر اکبرالہ آبادی کا یہ قطعہ درج ہوتا تھا:

پابند اگر چہ اپنی خواہش کے رہو
حامی نہ کسی خراب سازش کے رہو
قانون سے فائدہ اٹھانا ہے اگر
لائل سبجیکٹ تم برٹش کے رہو

1914 کی جنگ عظیم کے بعد ہندوستانی اخبارات کے لیے سخت قانون نافذ ہو گئے تھے۔ لیکن ہمدم نے اپنی پالیسی برقرار رکھی۔ ملکی اور قومی مفاد کو نظر انداز نہیں کیا۔

جنوری 1918 کو لکھنؤ سے ماہوار گلدستہ 'منظر' جاری ہوا۔ یہ افضل الدولہ افضل خلف اصغر کی سرپرستی میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر آزاد لکھنوی اور ابوالکمال لطف لکھنوی تھے۔ 32 صفحات پر مشتمل یہ گلدستہ منظر پریس لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔ رسالہ کے سرورق پر یہ شعر درج ہوتا تھا:

تا حشر آسماں پہ چمکتے ہلال منظر
دیکھے نگاہ عالم اوج کمال نظر

امداد صابری تحریر فرماتے ہیں:

''رسالہ کا نام پہلے لطیف تھا۔ کتابت طباعت اور کاغذ معمولی ہے۔ ہندوستان کے مشہور شعراء کا کلام درج ہوتا تھا۔ انتخاب میں امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔ نو شعر سے زیادہ نہیں چھپتے تھے اور زیادہ کے لیے 2 آنے فی شعر وصول کیا جاتا تھا۔''

اگست 1922 کے شمارہ کے شعراء کے منتخب اشعار ملاحظہ ہیں:

ناصح مشفق ہماری زندگی ہی تھی محال
آپ نے تو کہہ دیا بس دل لگانا ہی نہ تھا
آج رونا تو نہ پڑتا لاش دل پر شیفتہ
رسم ایسی بے مروت سے بڑھانا ہی نہ تھا9

'صبح امید' علمی، ادبی، سیاسی ماہانہ رسالہ لکھنؤ سے اکتوبر 1918 میں نمودار ہوا۔ اس کے مدیر پنڈت برج نرائن چکبست تھے۔ ہندوستانی پریس نظیر آباد لکھنؤ میں شائع ہوتا تھا۔ اردو کے مشہور ادیب و شاعر اس میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ اس رسالہ کے مضمون نگار منشی احمد علی شوق قدوائی، سید اکبر حسین اکبر آبادی، مولانا حسرت موہانی، علامہ سلیمان ندوی، سید سجاد حیدر اور مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ تھے۔

لکھنؤ کی صحافت میں گلدستوں کو ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ صحافت کے آغاز ہی سے گلدستہ جاری ہوا کرتے تھے۔ آج بھی ان کا رواج مشاعروں کی روداد کے طور پر قائم ہے۔ اس دور کی ادبی صحافت کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے ادبی اصناف کو عوام میں مقبولیت بخشی۔ لکھنوی صحافت نے ایسے تمام شعراء اور ادباء کو اپنی صفحات میں جگہ دی جن کو پہلے یہ شہرت نہ حاصل تھی اور انھیں عوام میں مقبولیت اخبارات و رسائل کے صفحات میں شائع ہونے کے بعد ملی۔

حواشی:

1۔ اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857، معصوم مراد آبادی، خبر دار پبلیکیشن، 2008، ص 166
2۔ انیسویں صدی میں اردو صحافت، ڈاکٹر طاہر مسعود، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، 2009، ص 312
3۔ نیا دور، جون جولائی 2011، ص 149
4۔ اردو صحافت انیسویں صدی میں، ڈاکٹر طاہر مسعود، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2009، ص 480
5۔ اردو ادب میں طنز و مزاح، وزیر آغا، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1999، ص 110
6۔ اردو ادب میں طنز و مزاح، وزیر آغا ص 110
7۔ اودھ پنچ کی ادبی خدمات، ڈاکٹر محمد عبدالرزاق فاروقی، شاہین کلب کرنول، 1982، ص 81
8۔ اردو صحافت میں اظہار و ابلاغ کے مختلف پیرائے کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر صالح عبداللہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، 2009، ص 64
9۔ تاریخ صحافت اردو، امداد صابری، جلد پنجم، جمال پریس دہلی، 1983، ص 563

■

Dr. Farah Hashim
Guest Faculty, Dept of PG Urdu
Hamidia Girls Degree College
Sultanpur Bhawa, Buddha Tazia, Noorulla Road
Khuldabad, Kala Danda
Allahabad - 211003 (UP)

فرزانہ بیگ جمیل بیگ

نگار کا مومن نمبر

علامہ نیاز فتح پوری نے نگار کا یہ خصوصی شمارہ جنوری 1928 میں شائع کیا تھا۔ 112 صفحات پر مشتمل اس شمارے کی قیمت صرف دو روپے رکھی گئی تھی۔ اور اس میں کل پانچ ایسے مضامین شامل کیے گئے تھے جن سے مومن کا شعری مرتبہ واضح ہو سکے۔ ان مضامین کی فہرست درج ذیل ہے:

(1) کلامِ مومن پر ایک طائرانہ نگاہ از نیاز فتح پوری
(2) مومن کی شاعری از سید امتیاز احمد بی۔اے۔ [علیگ]
(3) مومن کا تغزل از مرزا جعفر علی خان اثر بی۔اے۔
(4) موازنۂ مومن و غالب از عبدالباری آسی
(5) انتخاب کلامِ مومن

نیاز نے اپنے مضمون کی ابتدا ہی اس جملے سے کی ہے "اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعراء متقدمین کا کلام رکھ دو [باستثنائے میر] مجھ کو ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بنا تامل کہہ دوں گا" مجھے کلّیاتِ مومن دے دو اور باقی سب اٹھالے جاؤ۔"

اپنے اس خیال کی تائید میں نیاز نے مومن کے کلام کا جس طرح جائزہ لیا ہے اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ مومن کو اس کے عہد کے دیگر شعرا سے اس لیے ممتاز و منفرد مانتے تھے کہ ان کے کلام سے "خوئے گدایانہ کا اظہار نہیں ہوتا۔" جب کہ ان کے ہم عصر ذوق و غالب دونوں معتبر شعرا بہادر شاہ ظفر کی مدح سرائی میں کسی نہ کسی نہج پر دکھائی دیتے ہیں۔

اسی کے ساتھ نیاز نے مومن کی ایک اور خصوصیت 'رنگِ تغزل' کا ذکر اپنے اس مضمون میں کیا ہے اور انھیں اس رنگ میں یکتا و منفرد پایا ہے۔

اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

"رنگ تغزل میں ان کا کلام اس غیر تغزلانہ چیز سے بالکل پاک ہے جس کو تصوف یا عشق حقیقی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مومن نے اسی دنیا سے عشق کیا اور اس میں جتنے تجربات تلخ و شیریں ہو سکتے ہیں وہ سب انھوں نے حاصل کیے وہی ہجر و وصال کی مادّی کیفیات' وہی شکوہ و شکایات وہی رقیب کا کھٹکا وہی التجائیں وہی تدبیریں۔ الغرض وہ سارے جذبات جو عناصر محبت سے تعلق رکھتے ہیں مومن کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم مومن کے معشوق کا کیرکٹر ان کے کلام سے معیّن کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ بازاری جنس سے تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن بایں ہمہ مومن کا کمال شاعری دیکھیے کہ اگر ایک طرف وہ پستی سے اس قدر قریب ہے کہ ادنی سی لغزش بھی اسے گرکر جرات وانشاء کی صف میں ملا سکتی ہے، تو دوسری طرف بلندی کا یہ عالم ہے کہ غالب کی انتہائی پرواز بھی اس کی فضا تک نہیں پہنچ سکتی۔ (لیکن یہ سب انھیں حدود کے اندر جن کو حدودِ تغزل کہا جاتا ہے)"

نیاز فتح پوری نے مومن کے ان پہلوؤں کو بھی ان کے رنگ تغزل میں دیکھنے کی کوشش کی ہے جن کا تعلق عشق کی نفسیات سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس سلسلے سے اپنی بات کے ثبوت میں انھوں نے مومن کا یہ شعر درج کیا ہے:

دن رات فکرِ جور میں یوں رنج اٹھاتا کب تک
میں بھی ذرا آرام لوں تو بھی ذرا آرام کر

اس شعر کے اس ٹکڑے 'میں بھی ذرا آرام لوں' کو مومن کی نفسیات دانی سے منسوب کیا ہے اور اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس طرح وہ محبت پر ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ اب بھی مجھے کافی ایذا پہنچ چکی ہے اور اس لیے مزید فکر جور بیکار ہے۔ لیکن اس سے زیادہ گہری بات ایک اور ہے۔ فطرتِ انسانی ہے کہ جب کسی کے فائدہ کی بات بتائی جاتی ہے تو وہ غور کرتا ہے کہ کیوں ایسا مشورہ دیا گیا۔ اور اس کو کیا غرض تھی کہ وہ میرے فائدے کی بات بتاتا۔ اس لیے گمان بد کی بنا پر وہ مشورہ قبول نہیں کیا جاتا۔ لیکن اگر ساتھ ہی ساتھ مشورہ دینے والا اس میں یہ بھی لکھ دے کہ اس میں تھوڑا سا فائدہ میرا بھی ہے تو پھر غور و تامل کی بات باقی نہیں رہتی اور اس کو بالکل موافق فطرت سمجھ کر مان لیا جاتا ہے۔ مومن کا یہ کہنا کہ "میں بھی ذرا آرام لوں" بالکل اسی قبیل میں ہے

نیاز نے مومن کی غزل میں ذکرِ رقیب کی اہمیت کو بھی بتاتے ہوئے ان کی ان تہذیبی روایات کا ذکر کیا ہے

جو وہ رقیب سے خطاب کرتے وقت برتتے تھے:

ذکرِ اشک غیر میں رنگینیاں
بوئے خوں آئی تری گفتار میں

ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے
یہ ستم بے مروّت کس سے دیکھا جائے ہے

نیاز نے مومن کی ندرتِ ادا اور قدرتِ بیاں کی بھی تعریف کی ہے۔ اسی کے ساتھ ان کی غزلوں میں شبِ فراق کو ایک نئی صورت میں جس حسین انداز میں مومن نے پیش کیا ہے اسے نیاز نے ان کی ذہنی ندرت سے منسوب کیا ہے۔ اور اس کے لیے مومن کا یہ شعر درج کیا ہے:

شبِ فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں
کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے

لیکن نیاز نے اس سلسلے کے مومن کے اس شعر کو نہ جانے کیوں درج نہیں کیا جو انھوں نے 'شبِ ہجراں' سے متعلق کہا تھا وہ شعر اس طرح ہے:

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

بہر حال مومن کی جن خصوصیات کا نیاز نے ذکر کیا ہے ان میں سے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ کسی واقعہ کو بیان کرتے وقت اس کی درمیانی کڑی کو چھوڑ دیتے تھے۔ جسے ان کا قاری پورا کرتا تھا۔ جیسے:

جب دوست ہی لائقِ لطف و کرم نہیں
ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں

مومن کی ایک شعری خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ کسی بات کو معمولی طریقے پر ادا نہیں کرتے تھے اور اپنے مدعا کو ایک خاص پُر لطف پیچ سے ظاہر کرتے تھے۔ بقول نیاز "اس لطف سے ان کا سارا دیوان بھرا پڑا ہے۔" وہ اس سلسلے میں ان کا یہ شعر پیش کرتے ہیں:

بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں
کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے

اس شعر میں بقول نیاز مومن یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ناصح کی نصیحت بالکل بے اثر چیز ہے۔

مومن نے جس ندرتِ خیال کو اپنی غزلوں میں پیش کیا تھا اس کی جانب بھی نیاز نے اشارے کیے ہیں مثال کے طور پر وہ پامال خیال کو بھی اپنے خیال کی ندرت سے نیا بنانے میں مہارت رکھتے تھے۔ اس سلسلے کے یہ دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

رازِ نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہنچا
کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہنچا

اسی طرح نیاز نے ان کا درج ذیل شعر لکھ کر اس کی وضاحت بھی کردی ہے۔ شعر یہ ہے:

مانے نہ مانے منع تپش ہائے دل کروں
میں غیر تو نہیں کہ تماشائے دل کروں

اب وضاحت دیکھیے: یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ غیر کی تپشِ دل صحیح نہیں ہے بلکہ وہ صرف اس کی نمائش کرتا ہے۔

نیاز نے مومن کی غزلوں میں فارسی تراکیب کو بھی ان کی اہمیت سے منسوب کیا ہے۔ انھوں نے مومن کی تراکیب کی نزاکت کا اعتراف بھی کیا ہے، اور اس کا موازنہ غالب کی فارسی تراکیب سے کرتے ہوئے مومن کو اہمیت دینے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مومن کے چند ایسے اشعار پیش کیے ہیں جنھیں انھوں نے فارسی تراکیب سے سنوارا ہے۔

اسی کے ساتھ انھوں نے اس بات کا بھی دعویٰ کیا ہے کہ غالب مومن کی تراکیب شعری سے متاثر تھے۔ اسی لیے انھوں نے فارسی تراکیب کو ترک کر کے آسان تراکیب کو اپنا لیا تھا۔

نیاز نے مومن کی غزلوں میں استعمال ہونے والے کنایے اور استعارات کا ذکر بھی اپنے اس مضمون میں کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ان کے ہاں تشبیہات کے مقابلے میں کنایے اور استعارات کا استعمال زیادہ خوبصورت طریقے سے ہوا ہے۔ خاص طور سے انھوں نے مومن کے کنایوں کے سلسلے سے چند اشعار بھی پیش کیے ہیں۔

انھوں نے مومن کے بعض قصائد میں بھی رنگِ تغزل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے کے ایسے اشعار پیش کیے ہیں:

تم اور حسرتِ نازآہ کیا علاج کروں
میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل
چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا
غضب ہے شوقِ رسائی و دوری منزل
خدا سے ذرہ بید رد ہے یہ کیا انصاف
کہ تو جفا سے نہ ہو اور وفا سے ہوں میں خجل

اپنے اس مضمون کے آخر میں نیاز نے اپنی اسی بات کو ایک بار پھر سے دہرایا ہے کہ:

"اگر میرے سامنے تمام شعراء کا کلام رکھ کر صرف ایک کے انتخاب کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کلیاتِ مومن اٹھا لوں گا۔

نگار کے اس خصوصی شمارے کا دوسرا مضمون سیّد امتیاز احمد کا تحریر کردہ ہے۔

سیّد امتیاز احمد نے ابتدا میں مومن کی سوانح حیات کی تفصیلات پیش کی ہیں جن میں مومن کی پیدائش، ان کے والد اور دادا اور دادا کے بھائی کا اسم گرامی اور ان کی سماجی حیثیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے اس خاندان کو ملنے والی مراعات کا تذکرہ بھی اسی مضمون میں موجود ہے۔

حکیم مومن کے والد کی مذہبی حیثیت کی تفصیلات بھی پیش کی گئی ہیں۔ خصوصاً شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ العزیز سے ان کی ارادت کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد مومن کی تعلیم و تربیت اور شاہ عبدالقادر کی شاگردی کی تفصیلات دی گئی ہیں اور پھر یہ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے والد اور اپنے دونوں چچا حکیم غلام حیدر اور حکیم غلام حسین خاں سے طب کی کتب کا درس حاصل کیا۔ لیکن بقول صاحبِ مضمون "اپنے آبائی مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد حکیم مومن خان کی شخصیت بھی مومن شاعر کی شخصیت میں جذب ہو کر رہ گئی۔ مومن نے طب پڑھی طبابت کی مگر وہیں تک جہاں تک ان کے عاشقانہ اندازِ طبیعت کا تقاضا تھا۔ مومن کے یہاں طب نے دراصل شاعری کا جامہ پہن لیا"۔ اس کے بعد انھوں نے مومن کے ایسے چند اشعار پیش کیے ہیں جن کا تعلق طب سے کہیں زیادہ شاعری اور وہ بھی عاشقانہ شاعری سے زیادہ تھا۔

اس سلسلے کے درج ذیل اشعار پیش کیے گئے ہیں:

اس کو جوں ہاتھ لگایا میں نے
دل سے بس ہاتھ اٹھایا میں نے
آفتِ تازہ جو جان پر آئی
یہ غزل اپنی زبان پر آئی

غزل

کیا لگا دستِ دل آرام کے ساتھ
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ
ہاتھ دیتے تو ہو ہاتھ میں پر
کان پر رکھیے گا پھر نام سے ہاتھ
کیا کہوں آہ ! بقول مومن
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ [مثنوی قولِ غمگین]

مومن کی طبیعت بہت جلد علمِ طب سے گریزاں ہو گئی اور انھوں نے علمِ نجوم کی جانب توجہ دینی شروع کی۔ اور اس علم میں بھی کئی ماہر عالموں سے استفادہ کیا۔ بقول صاحبِ مضمون "مومن کی اختر شماری بھی ان کی عاشقانہ طبیعت کے لیے ایک تازیانہ ثابت ہوئی۔"

کہاں ہے بدر سیما وہ ترحم
کہ ہوں میں رازدانِ سیر انجم

اسی مضمون میں مومن کی وضع قطع' ان کے لباس کے ساتھ ہی ان کی رنگین مزاجی کے بارے میں تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ ان کی طبیعت جو میں خودداری اور ذہانت تھی اسے بھی بیان کیا گیا ہے۔

دہلی سے باہر سہارن پور' بدایوں' رام پور' سہسوان اور جہانگیر آباد کے انھوں نے جو سفر اختیار کیے تھے ان کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

ایک طویل تمہید کے بعد سیّد صاحب نے مومن کی شعری خصوصیات پر طویل تبصرہ کیا ہے اور ان کی شعری حیثیت کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ خاص طور سے ان کے تخیل کی نزاکت، محاکات' تشبیہات و استعارات کے ساتھ ہی ان کے شعری موضوعات ان کی بلند پروازی، ان کے طنز، ان کے اجتماع ضدّین پر بھی خاصی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، اور ان کے کلام میں سے کئی اہم اور کارآمد اشعار کا انتخاب کر کے اپنی بات کو مدلل بنانے کی کوشش کی ہے۔

اپنے اس مضمون میں سیّد امتیاز احمد نے مومن کی غزلوں کے ساتھ ہی ان کی دیگر اصناف سخن سے رغبت پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ مثلاً ان کی قصیدہ گوئی کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے۔: ''مومن کے قصائد بہت بلند ہیں اور ان سے ان کی علمی لیاقت اور شاعرانہ تخیل کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اور بے شک ان کے قصائد نہ صرف ان کے معاصرین مشہور کے ہم پایہ ہیں بلکہ ان کا درجہ اساتذۂ فارسی سے ملتا ہے۔ اور ان کے مطالعے سے معمولی استعداد کا آدمی لطف نہیں اٹھا سکتا۔

سیّد امتیاز احمد نے مومن کی غزلوں کے ساتھ ہی ان کی دیگر اصناف سخن سے رغبت پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ مثلا ان کی قصیدہ گوئی کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے۔: ''مومن کے قصائد بہت بلند ہیں اور ان سے ان کی علمی لیاقت اور شاعرانہ تخیل کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اور بے شک ان کے قصائد نہ صرف ان کے معا صرین مشہور کے ہم پایہ ہیں بلکہ ان کا درجہ اساتذۂ فارسی سے ملتا ہے۔ اور ان کے مطالعے سے معمولی استعد اد کا آدمی لطف نہیں اٹھا سکتا۔

اسی طرح مومن کی مثنویوں کے بارے میں وہ فرماتے ہیں: مومن کی مثنویاں ان کے حیاتِ معاشقہ کی منظوم تصویریں ہیں۔ ان کی سیرت کا وہ پہلو جس نے ان کے کلام پر اثر کیا ان مثنویوں کے مطالعے سے صاف واضح ہو جاتا ہے۔'' رباعیاتِ مومن کے بارے میں بھی صاحبِ مضمون نے ان کی چند رباعیات کو پیش کیا ہے۔ اور ان کے مضامین پر روشنی ڈالی ہے۔ مومن کے ایک شخصی مرثیے کا ذکر بھی اسی مضمون میں کیا گیا ہے جو انھوں نے معشوقہ' حور و ملک شیم' کے انتقال پر کہا تھا۔ اس مرثیہ کی خوبیوں پر بھی امتیاز احمد نے خاصی روشنی ڈالی ہے۔ اسی کے ساتھ ان کی تضمین ان کے معمے اور تاریخیں وغیرہ پر بھی کسی حد تک بات کی گئی ہے۔ مومن کی عدم مقبولیت کا سبب ان کی طبیعت میں موجود جذبہ خودداری کو بتایا گیا ہے۔ اور ان کے خیالات کی پیچیدگی نیز زبان کی ناہمواری سے اختلاف کیا گیا ہے۔ مومن کے شاگردوں کا ذکر بھی اجمالاً کیا گیا ہے۔ جن شعرا نے مومن سے اپنے کلام پر اصلاح لی ان میں آشفتہ، آہی، قلق، بیتاب، بیمار، تسکین، برق، سالک، صاحب، شیفتہ، ظہور، عظمت، شورش، صفیر قیصر، کاظم، کرم، نسیم، وحشت، یاس وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے چند شعراء بیرون دہلی سے بھی تعلق رکھتے تھے۔

غرض اپنے اس مضمون میں امتیاز احمد نے مومن کی حیات و شاعری پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

اس شمارے کا اگلا مضمون' مومن کا تغزل' [مرزا جعفر علی خاں اثر] بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اپنے اس مضمون کی ابتدا ہی میں اثر نے مومن کی ان شعری خوبیوں کی وضاحت کر دی ہے جن پر وہ آگے چل کر اظہار خیال کرنے والے ہیں۔ اوّل انھوں نے مومن کے دائرہ تخیل پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ'' اس نے اپنے دائرہ تخیل کو بہت محدود کر دیا ہے۔ مسائل تصوّف، سائنس، اور فلسفہ کی کہنا چاہیے کہ جھلک بھی نہیں۔ صرف ایک متلون شاہد مجازی سے محبت ہے اور اسی کے تمام لوازم ہیں... تاہم اس محدود دائرے میں اس نے ایسی حیرت انگیز جدّت اور تنوع سے کام لیا ہے کہ جو شعر ہے نیا ہے اور اسی کے ساتھ بے حد دلکش۔''

اسی کے ساتھ اثر نے مومن کی شاعری میں حکیمانہ اور دقیق مسائل علمی اور مشکل و نامانوس الفاظ کی جانب اشارہ کرنے کے بعد اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اکثر اشعار ایسے ہیں جن کا مفہوم سمجھنے میں نہایت کاہش اور دماغ سوزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف اندازِ بیان سے خیال کو مشکل بنا کر ایسی صورت میں پیش کرتا ہے کہ مطلب تک ذہن کی رسائی باآسانی نہیں ہوتی۔ خود کہتے ہیں:

اگر چہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے
کہاں ہے لیک معنی بند مضموں یاب اپنا سا

آگے چل کر اس سلسلے میں اثر کہتے ہیں'' اس دشواری مطلب کا ایک سبب ایہام بھی ہے۔ اپنے معاصرین میں مومن ہی ایسا شاعر ہے جس نے ایہام کا احیا کیا۔ ورنہ یہ اسلوب متروک ہو چکا تھا۔''

انھوں نے مومن کی ایک اور اہم خوبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''جس خوبی سے وہ اپنا تخلص مقطع میں لاتا ہے دوسرے شاعر کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔''

اسی کے ساتھ اس بات کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے کہ مومن نے اپنی پوری شاعری میں سوائے عورت کے کسی کو اپنے محبوب کی شکل میں پیش نہیں کیا ہے۔ جبکہ اردو کے تقریباً تمام شعراء نے محبوب کی شکل میں امرد یا سبزہ آغاز نوجوان کا تذکرہ ضرور کیا ہے۔

اسی کے ساتھ مومن کی شاعری میں آئے نفسیاتی پہلوؤں پر بھی کافی تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور ان دشوار ترین پہلوؤں کو ان کی غزلوں میں تلاش کیا گیا ہے جن کا تعلق انسانی نفسیات سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ مومن نے ان پہلوؤں کو پیش کر کے اپنے اشعار میں وسعت معانی پیدا کرنے کی جس طرح کی کوشش کی ہے اسے بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ اور یہ لکھا ہے کہ ''نفسیات کے مسائل کو مختصر الفاظ میں نظم کر دینا آسان کام نہیں۔''

اس کے بعد مومن کے ایسے اشعار کو بطور مثال پیش کیا ہے جن میں مومن کے رنگِ شاعری کی بھرپور عکاسی ہے۔ ان اشعار میں زیادہ تر محبوب سے تخاطب کے ساتھ ہی ہجر و وصال کے موضوعات ہی کو چھوا گیا ہے۔ یا پھر مومن کے اسلوب بیاں اور زبان دانی سے متعلق بحث کرتے ہوئے ان پہلوؤں کو پیش کیا ہے جن سے مومن کی ذہنی وسعتوں پر روشنی پڑتی ہو۔ اس سلسلے میں اثر نے کافی طوالت سے کام لیا ہے اور مومن کے کلام میں سے ایسے اشعار کا انتخاب کر کے ان کی خوبیوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

غرض مرزا جعفر علی خاں اثر نے مومن کی شعری استطاعت، ان کی فکری وسعت پر انتہائی غیر جانب دارانہ روشنی ڈالی ہے، جس کی وجہ سے ان کا یہ مضمون قابلِ قدر بن گیا ہے۔

دیکھنے والا پہلی نظر میں دیکھ لیتا ہے کہ مصنّف نے ایک تشبیب بغیر سوچے سمجھے محض اپنی شاعرانہ قوّت بیاں کے زور پر لکھی ہے۔ اس کے بعد اس کو خیال پیدا ہوا کہ اس قصیدہ کا منقبت کی طرف رخ پھیر دینا چاہیے اسی لیے اسے دقّت پیدا ہوئی اور اس نے گریز کا یہ انداز پسند کیا۔ بر عکس اس کے مومن کے یہاں پہلے ہی سے اہتمام کیا گیا ہے۔ اور اس صفائی اور خوبصورتی سے گریز کیا کہ داد نہیں دی جا سکتی۔

اسی شمارے میں عبدالباری آسی کا ایک اہم مضمون بعنوان 'موازنۂ مومن و غالب' شامل کیا گیا ہے۔ اپنے اس مضمون کی ابتداء میں آسی نے غالب اور مومن کی مزاجی کیفیتوں کا موازنہ کرتے ہوئے ان میں پائے جانے والے 'تضاد' کو نمایاں کیا ہے۔ مثلاً غالب کو 'آزاد مزاج' رندِ لاابالی، غم و افکار کو کیف شراب سے دور کرنے والا، زخم خوردہ مگر مرہم کی جستجو سے بے پروا، دردمند مگر فکر چارہ سے مستغنی فاقہ مست مگر مزاج میں شاہانہ بول ہوئے، امرائے عہد کا ثنا گو اور عقیدت مند'' بتایا گیا ہے۔

جبکہ اس کے برخلاف مومن کو 'عاشق مزاج، الفت ومحبت کی مضبوط زنجیروں میں جکڑا ہوا حسن پر جان دینے والا، زمانے کے غم والم سے اثر لینے والا، آن پر جان دینے والا، شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے حلقۂ ادارت میں بیٹھنے والا، رؤسا کی باتوں کو چینِ ابرو سے دیکھنے والا ان کی صحبتوں سے محترز، ان کے مال دولت پر نظر استحقار ڈالنے والا'' کہا گیا ہے۔

اور اس مزاجی تفاوت کو سامنے رکھتے ہوئے دونوں کے رنگِ شعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے دونوں کی مختلف اصناف سخن پر کی گئی طبع آزمائی کو اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ مثال کے طور پر دونوں کی مثنویوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان کا موازنہ کیا گیا ہے اور لکھا ہے '' غالب کی مثنویاں زیادہ تر واقعات ضروری پر مبنی ہیں۔ اور مومن نے باستثنائے بعض سب مثنویاں عشقیہ لکھی ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے غالب کے مقابلے میں مومن کو ترجیح دینے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ان دونوں شعراء کا موازنہ کرتے ہوئے ان کے ذریعے تخلیق کی گئی رباعیات، قصائد، مراثی اور غزلیات کی اہمیت پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

سب سے پہلے دونوں کے قصائد کا موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے دونوں کے ہم موضوع قصیدے پر اظہار خیال کیا ہے۔

دونوں شعراء، نے حضرت علی کرم اللہ کی شان میں قصائد کہے ہیں۔ مومن کے قصیدے کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

'' معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا امڈا چلا آرہا ہے۔ اسی روانی اور تسلسل کی حالت میں اس آسان طریقہ سے گریز کیا ہے۔ جس کا جواب نہیں۔ گویا مصنف نے گریز کا ارادہ نہیں کیا بلکہ بے اختیار ان کے قلم سے یہ اشعار نکلتے گئے ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے غالب کے قصیدے کا ذکر کرتے ہوئے تشبیب کے تین اشعار پیش کیے ہیں اور لکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کی کہنہ مشقی نے اس میں بہت کچھ حسن پیدا کر دیا ہے۔ مگر قصیدہ میں وہ بات نہیں جو مومن کے یہاں ہے۔''

اپنی اس بات کو مدلل بنانے کے لیے انھوں نے غالب کے بارے میں لکھا ہے۔ '' دیکھنے والا پہلی نظر میں دیکھ لیتا ہے کہ مصنف نے ایک تشبیب بغیر سوچے سمجھے محض اپنی شاعرانہ قوت بیاں کے زور پر لکھی ہے۔ اس کے بعد اس کو خیال پیدا ہوا کہ اس قصیدہ کا منقبت کی طرف رخ پھیر دینا چاہیے اسی لیے اسے دقت پیدا ہوئی اور اس نے گریز کا یہ انداز پسند کیا۔ برعکس اس کے مومن کے یہاں پہلے ہی سے اہتمام کیا گیا ہے۔ اور اس صفائی اور خوبصورتی سے گریز کیا کہ داد نہیں دی جاسکتی''

دونوں کی رباعیات کا موازنہ اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ مومن کے مقابلے میں غالب نے بہت ہی کم تعداد میں رباعیات کی تخلیق کی ہیں۔ اسی لیے آسی نے یہ کہہ کر اس موضوع کو ٹال دیا'' غالب اس صنفِ سخن کے مردِ میداں نہیں سمجھے جاسکتے۔''

اسی کے بعد دونوں شعرا کی غزلیات کا موازنہ کافی طوالت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں شعرا میدان کے 'مرد' مانے جاتے رہے ہیں۔''

اس کے لیے انھوں نے دونوں کی ہم طرح غزلیات کا موازنہ کیا ہے۔ یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ دونوں کی مزاجی کیفیت کی عکاسی ان غزلیات میں کس قدر موجود ہے۔

بہتر ہوگا اس سلسلے کے ہم طرح اشعار پیش کیے جائیں۔ پہلے غالب کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگر چہ مرا ہم زباں نہیں
نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گر خراب
سوگز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

اور اب مومن کے اسی زمین میں چند اشعار دیکھیے:

اظہار دوستی کی خوشی کیا شبِ وصال
دشمن سے سن چکا ہوں کہ تو مہرباں نہیں
پرسش عدو سمجھ کے ذرا حال پوچھنا
قابو میں نہیں ہے مرے بس میں زباں نہیں
ہر ذرہ میری خاک کا برباد ہو چکا
بس اے خرام نازِ تاب و تواں نہیں

اسی زمین کی دونوں غزلوں کی خوبیاں بتاتے ہوئے صاحبِ مضمون نے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ مومن اور غالب کے شعری مزاج کا صحیح طور پر جائزہ لے سکیں۔

اپنے اس جائزہ میں انھوں نے غالب کے اشعار میں ان کی فلسفیانہ فکر، ان کی شوخی کا انداز، عاشق کی حرماں نصیبی، ان کے شوخی الفاظ وغیرہم کی جانب اشارے کیے ہیں۔

جبکہ مومن کے اشعار کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے ان کے بے مثل انداز تغزل، دوست کی بے ثباتی، محبت، شعری بلاغت ومعنویت، حسرت دل کی سبک روی وغیرہ کو کافی نمایاں کیا ہے۔

اسی طرح ان دونوں شعرا کی ہم زمین دو اور غزلوں کا جائزہ اسی صورت میں لیا گیا ہے اور دونوں کی شعری اہمیت وعظمت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ہم قافیہ وہم ردیف اشعار کے ساتھ ہی عبدالباری آسی نے ان کے ہم مضمون اشعار کا انتخاب بھی پیش کیا ہے، اور دونوں کی شعری کیفیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

آخر میں خود نیاز فتح پوری نے مومن کی اہم ترین غزلوں کے ایسے اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے جن کے ذریعے مومن کی مزاجی اور شعری عظمت سے بخوبی واقف ہوا جاسکتا ہے۔

■

Dr. Farzana Beg Jameel Beg
2, North Ghafoor Khan ki Bazria
Iqbal Colony
Indore - 452006 (MP)

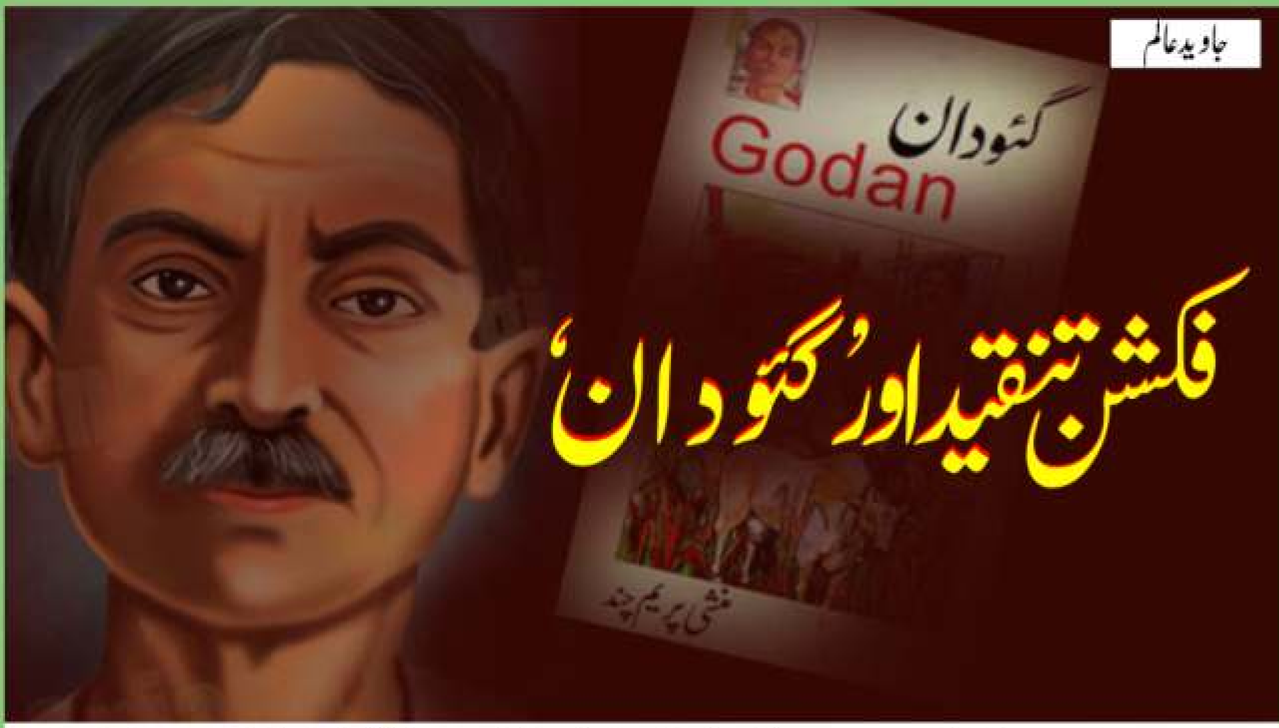

فکشن تنقید اور 'گئودان'

جاوید عالم

بیسویں صدی میں اردو۔ ہندی کے جن ادیبوں نے اپنی منفرد اور غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں سے اس پورے عہد کو متاثر کیا ان میں پریم چند کی حیثیت امتیازی ہے۔ ان کی تخلیقات کا سایہ اس پورے دور کی آگہی پر بہت گہرا ہے جس میں ہمیں اپنے ماضی، حال اور مستقبل سے وابستہ تصویریں ایک ساتھ دکھائی دیتی ہیں۔ پریم چند گاندھی واد کے ساتھ مارکسوادی نظریہ، مشترکہ تہذیبی اقدار اور اجتماعی زندگی کے ترجمان تھے، اس کا اظہار ان کے تین سو سے زائد افسانوں اور کچھ ناولوں میں پوری تخلیقی سچائی اور فنکارانہ ایمانداری کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ افسانوں میں 'کفن' اور ناولوں میں 'گئودان' پریم چند کے شعور فن کی پختگی کے ساتھ ہماری اجتماعی زندگی کا المیہ بھی ہے۔ 1936 میں لکھا گیا ان کا یہ ناول اردو۔ ہندی میں ناول نگاری کی روایت کا ایک شاہکار قرار دیا جاتا رہا ہے۔ سید احتشام حسین کا خیال ہے کہ ''گئودان اردو ناول کی تاریخ میں ایک ایسی منزل ہے جہاں صرف پریم چند پہنچے اور وہ بھی صرف ایک بار'' اسی طرح ہندی کے ممتاز نقاد اندر ناتھ مدان لکھتے ہیں ''ناول فنکاری کا اعلی نمونہ ہے اور ہمیشہ ایک عظیم تخلیق کی حیثیت سے زندہ رہے گا'' گئودان میں پریم چند نے کسی ایک مسئلے کو موضوع بنانے کے بجائے اس عہد کے ہندوستانی سماج کے اجتماعی مقدرات و مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ غالبًا یہی سبب ہے کہ دونوں زبانوں (اردو۔ ہندی) میں جتنا تنقیدی سرمایہ 'گئودان' پر ملتا ہے کسی دوسرے ناول پر نہیں ملتا۔ ہندی میں گوپال رائے، شیو کمار مشر اور مکھن لال وغیرہ نے تو اس پر باضابطہ کتابیں لکھی ہیں جبکہ اردو میں کتاب ایک بھی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ہندی میں 'گئودان' پر تنقیدی و تجزیاتی مضامین کی تعداد بھی سیکڑوں میں ہے اردو میں صورت حال مختلف بلکہ مایوس کن ہے تاہم ممتاز حسین، علی سردار جعفری، اسلوب احمد انصاری، باقر مہدی، جعفر رضا، علی عباس حسینی، یوسف سرمست اور قمر رئیس وغیرہ نے زیر بحث ناول کی اہمیت کا اعتراف اپنے مضامین میں کیا ہے سردست میرا موضوع 'گئودان' پر اردو کے ان چند ناقدین کے خیالات کا فردًا فردًا جائزہ لینا ہے۔

ممتاز حسین کا شمار ان چند مارکسی نقادوں میں ہوتا ہے جنھوں نے کسی بھی طرح کی جذباتیت اور انتہا پسندی کا شکار ہوئے بغیر خالص علمی بنیادوں پر اپنے تنقیدی شعور کی عمارت قائم کی ہے۔ 'منشی پریم چند بحیثیت ناول نگار' کے عنوان سے ان کا ایک گرانقدر مضمون قمر رئیس نے اپنی کتاب 'منشی پریم چند: شخصیت اور کارنامے' میں شامل کیا ہے جو نسبتًا طویل ہونے کے باوجود اردو میں 'گئودان تنقید' کی روایت کا ایسا پہلا مضمون ہے جس میں اس ناول کا ایک نہایت سلجھے ہوئے اور صحتمند مارکسی ذہن کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے۔ ممتاز حسین کے نزدیک پریم چند کی مارکسیت اور ان کی اشتراکی آئیڈیالوجی سوویت یونین کی اشتراکی سائنس کا خیر مقدم کرنے کے باوجود زیادہ انسان دوستی کی آئیڈیالوجی تھی اور زر کی اقتصادیات، طبقاتی تصادم پر مبنی سماجی نظام اور سرمایہ دارانہ استحصال کی سخت دشمن تھی جس کا اظہار گئودان میں صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ناول میں زر کی اقتصادیات پر مبنی ایک طبقاتی سماج کی عکاسی ملتی ہے جہاں انسانی رشتے مفقود ہیں، ایک طبقاتی اور استحصالی سماج میں اکثر ہوتا بھی یہی ہے کہ عوام کی وفا، ایثار اور قربانی رعبہ کے استحصال کا جواز بن جاتی ہے۔ ہوری پر ظلم کا جواز نہ صرف رائے صاحب کو بلکہ پنڈت داتا دین اور ناول کے دیگر کرداروں مثلًا مہاجن تھانے دار اور سپاہی وغیرہ کو بھی حاصل ہے۔ مس مالتی اور مسز کھنا کے حوالے سے پریم چند کے تانیثی نظریات کا بھی ممتاز حسین نے علمی تجزیہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک ناول میں مس مالتی اور مسز کھنا کے کرداروں کا تقابل کرتے ہوئے برتری اور فضیلت مسز کھنا کو بخشی گئی ہے کیونکہ اس نے اپنی خودی کو مٹا ڈالا تھا۔ اپنے شوہر کے مظالم برداشت کرنے کے بعد بھی ان سے جدا ہونے کا نام نہیں لیتی اس کے برعکس مس مالتی ہے جو ولایت کی تعلیم یافتہ ایک روشن خیال لیڈی ہے۔ اور سماج کو صحتمند رکھنے کے لیے حقوق نسواں کے تحفظ کو ضروری سمجھتی ہے، مس مالتی اور مسز کھنا کے کرداروں کے نفسیاتی تجزیے میں پریم چند کی اس کسمساہٹ کی وجہ ممتاز حسین کے نزدیک یہ ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں عورتوں کے مقام و مرتبے کا تعین صرف انسانی رشتوں ہی کا رہین منت نہیں رہا بلکہ اقتصادی حالات، رسوم و رواج اور دھرم شاستروں کے وضع کردہ ضوابط بھی مشرقی سماج میں عورتوں کی حیثیت متعین کرتے رہے ہیں اس لیے دور قدیم ہی سے یہ

اقدار باہم برسرِ پیکار رہی ہیں یہ پیکار سرمایہ دارانہ نظام میں مزید شدت اختیار کر گئی جس کے نتیجے میں انسانی رشتے اس قدر بے دخل ہوئے کہ بعض اوقات مردوں کا برتاؤ عورتوں کے ساتھ حیوانوں سے بھی بدتر ہو گیا۔ مسٹر کھنا کا اپنی بیوی کو مارنا اور اسے طرح طرح سے ذہنی و جسمانی اذیت پہنچانا اسی حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے، جوں جوں ہمارے یہاں مغرب کی لائی ہوئی آئینی حکومت، جمہوریت، انفرادیت اور تہذیب و تعلیم کا اثر قائم ہوتا گیا عورتوں میں اپنے حقوق اور شخصی آزادی کے تحفظ کا شعور بیدار ہوا اور وہ ان اقدار کی بھی علی الاعلان مخالفت کرنے لگیں جو ان کی آزادی کے راستے میں اب تک حائل تھیں اس طرح وہ ہماری اجتماعی اقدار میں مساوات کی مدعی بن گئیں۔ مس مالتی اور مسز کھنا کے کرداروں کے اس نفسیاتی تضاد پر پریم چند کے موقف کی وضاحت ممتاز حسین نے ان الفاظ میں کی ہے۔

''پریم چند نے اس کسمساہٹ کو اور اس تصادم کو شدت کے ساتھ محسوس کیا لیکن وہ پوری طرح مرد اور عورت کے درمیان مساوات کے حامی نہ ہو سکے.... وہ اس معاملہ میں یقیناً اٹل معلوم ہوتے ہیں کہ عورت مرد کو صرف سیوا ہی سے رام کر سکتی ہے''

(پریم چند: شخصیت اور کارنامے، ص 249)

ناول میں ایک جگہ مسٹر مہتا کہتے ہیں:

''میرے ذہن میں عورت وفا اور ایثار کی مورت ہے جو اپنی بے زبانی اور اپنی قربانی سے اپنے کو بالکل مٹا کر شوہر کی روح کا ایک جز بن جاتی ہے قالب مرد کا ہوتا ہے مگر جان عورت کی ہوتی ہے''

جس پسماندہ ماحول میں پریم چند کی شخصیت کی تعمیر ہوئی تھی اس کے ردِ عمل کا نتیجہ تھا کہ وہ مارکسی نہ بننے کے باوجود بھی اشتراکی خیالات رکھتے تھے۔ پریم چند کے نظریات اس ناول میں مارکسی خیالات سے متاثر ضرور ہوئے ہیں لیکن وہ مارکسزم کے میکانکی استعمال سے بچے ہیں۔ دراصل ان کے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی زندگی نے انھیں کسی بھی طرح کے میکانکی اشتراکی تصورات سے الگ گورکی کی اس اشتراکیت سے قریب کر دیا تھا جسے ان دونوں ادیبوں نے زندگی کے اجتماعی تجربوں اور واردات سے براہِ راست حاصل کیا تھا، یہ رجحان گئودان کی تخلیق تک اپنی مزید تکمیل شدہ اور نکھری ہوئی شکل میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

اردو تنقید نے پریم چند اور ان کے آخری مکمل ناول 'گئودان' کو مارکسزم کے ایک محدود چوکھٹے میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ تنقید کے دیگر دبستانوں مثلاً جدیدیت اور مابعد جدیدیت وغیرہ نے اردو ناول نگاری کی روایت کے اس عظیم شاہکار کے تعلق سے ایک قسم کی سوچی سمجھی بیزاری کا ثبوت دیا ہے۔ ترقی پسند ادبی تنقید نے بھی صرف مارکسزم کے فریم میں رکھ کر جس طرح 'گئودان' کی آفاقیت کو کم کرنے کی غلطی کی ہے اس سے قاری کو ناول کی تفہیم میں کوئی خاطر خواہ مدد نہیں ملتی اور متعدد جگہوں پر پڑھنے والا ناول کو عہدِ رفتہ کی داستان سمجھ کر اس کی اصل معنویت ہی کا منکر ہو جاتا ہے۔ ترقی پسند ناقدین میں علی سردار جعفری، احتشام حسین، باقر مہدی اور قمر رئیس نے اگرچہ اپنی تحریروں اور مضامین میں ناول کے مختلف مباحث پر کئی زاویوں سے روشنی ڈالی ہے، مثلاً علی سردار جعفری نے ناول میں پریم چند کی سچی اور بے رحم سماجی حقیقت نگاری اور ہوری کی دردناک موت پر ناول کے اختتام کو پریم چند کی جملہ تخلیقات میں سب سے الگ بتایا ہے، احتشام حسین نے زمینداری، مہاجنی تہذیب، سرمایہ داری اور ان سب کے جال میں پھنس کر دم توڑتے کسان، مزدور وغیرہ پر بحث کی ہے جبکہ قمر رئیس مثالیت پسندی اور حقیقت نگاری کے سیاق میں پریم چند کے تخلیقی موقف کو اپنے تجزیہ میں لاتے ہیں تاہم مارکسوادی نظریہ کے جس دائرے سے باہر نکل کر ناول کو ایک آفاقی اور کشادہ ذہن کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت تھی اس کی کوئی نظیر ہمیں اردو تنقید میں نظر نہیں آتی۔ ناقدین کی یہ دلیل صحیح ہے کہ 'گئودان' پر مارکسوادی نظریہ اور سماجی حقیقت نگاری کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں کیونکہ ناول میں کئی مسائل کو سمجھنے کا نظریہ سماجوادی نظریہ سے متاثر معلوم ہوتا ہے، ہوری کا بنیادی مسئلہ معاش ہے جو مارکسوادی فکر سے ماخوذ ہے، مذہب اور برادری اس کے استحصال ہی کا عکس ہیں جنھیں مارکسوادی مفکرین 'معھیا چیتنا' کہتے ہیں۔ شہر میں کھنا جیسے لوگ صرف Speculation سے مالدار ہو جاتے ہیں جبکہ ان کی فیکٹری کے مزدور رات دن بدترین حالت میں مزدوری کرتے ہوئے الگاؤ یا تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ ساری باتیں مارکسوادی نظریہ کا عکس معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو 'گئودان' میں مارکسواد اس شدت کے ساتھ موجود نہیں ہے جیسا کہ اردو کے ناقدین نے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ معاشی زندگی کے مسائل اور کسانوں کا استحصال 'گوشۂ عافیت' اور 'میدانِ عمل' میں بھی تھا جب ترقی پسندی وجود میں ہی نہیں تھی۔ ناول میں مزدوروں کی ہڑتال کا جتنا بھیانک انجام ہوا ہے وہ مارکسوادی نظریہ کے بالکل برعکس ہے مالتی کا مہتا سے شادی نہ کرنا روحانی اور مذہبی آدرش سے متاثر معلوم ہوتا ہے جو کہ مارکسزم کے مادی نظریہ کے بالکل برعکس ہے۔ اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ مارکسواد کی تھوڑی بہت جھلکیاں گئودان میں بھلے ہی موجود ہوں لیکن یہ مارکسواد کی مکمل تصویر نہیں ہے۔ اس نے کئی جگہوں پر مارکسزم کا بائیکاٹ کیا ہے۔ اردو ناقدین کا ناول کے تجزیہ کے عمل میں اس کے مارکسی پہلوؤں پر اس قدر مصر ہونا جس میں پریم چند کی تخلیقی فکر کے اپنے خود مکتفی نشانات گم ہو کر رہ جائیں اس عظیم فنکار کے ساتھ ناانصافی ہے۔

علی عباس حسینی، یوسف سرمست اور باقر مہدی نے بھی اپنی تحریروں میں 'گئودان' کے مباحث کو موضوع بنایا ہے۔ علی عباس حسینی نے اپنی مشہور تصنیف 'اردو ناول کی تاریخ و تنقید' میں زیرِ بحث ناول سے متعلق جو معروضات پیش کیے ہیں۔ معلوم نہیں کن بنیادوں پر علی عباس حسینی اس ناول کو ایک تاریخی چیز سمجھ بیٹھے، لکھتے ہیں:

''ممکن ہے کہ کچھ دنوں میں نظامِ سیاسی بدل جائے اور دیہاتی اور شہری زندگی دوسرے سانچے میں ڈھال دی جائے ایسی حالت میں پریم چند کے ناول محض تاریخی چیز بن کر رہ جائیں گے'' (اردو ناول کی تاریخ و تنقید ص 118)

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ناول کا پلاٹ اگرچہ لکھنؤ اور اس کے آس پاس سمری اور بیلاری کے ارد گرد گھومتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پریم چند نے ان دونوں جگہوں کو ہندوستان کے کسی بھی گاؤں اور شہر کی علامت کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ کسی خاص جغرافیائی نشاندہی سے بچے ہیں اس سے ناول کی لامکانیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جہاں تک حسینی صاحب کا ناول کو محض تاریخی چیز قرار دینے کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ 'گئودان' کا قصہ 1936 کے آس پاس کے 5-10 برسوں کے واقعات کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود پریم چند نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ تاریخی واقعات کا یہ دائرہ ناول کا دائرہ نہ بن جائے۔ انھوں نے پورے ناول میں ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جو کسی مخصوص تاریخ یا سال سے تعلق رکھتا ہو۔ تحریکِ آزادی سے جڑے کسی بھی واقعہ کو کہانی میں جگہ نہ دینے کا سبب یہ بھی تھا کہ اگر وہ تاریخی یا زمانی لحاظ سے خاص واقعات کو جگہ دیتے تو ناول زمانیت کے دائرے میں قید ہو کر ایک تاریخی دستاویز بن کر رہ جاتا۔ لیکن آج اگر یہ ناول اپنی تخلیق کے تقریباً 81 برس گزر جانے کے بعد بھی آج ہی کا ناول ہونے کا احساس دلاتا ہے تو اس کا

بڑا سبب یہی ہے کہ پریم چند قصہ کو زمان و مکان کے دائروں کا قیدی بنانے سے شعوری طور پر بچے ہیں۔ اس لیے حسینی صاحب کا ناول کو محض تاریخی چیز قرار دینا کسی طور مناسب نہیں۔

آج جب ہماری اجتماعی زندگی ظلم، استحصال، تشدد اور فرقہ واریت جیسے مہلک مسائل کی گرفت میں ہے 'گئودان' کے ایک زندہ ناول ہونے کی تصدیق ہمیں علی سردار جعفری کے اس اقتباس سے بھی ملتی ہے:

''پریم چند نے ہوری اور دھنیا کی تخلیق کر کے گمناموں اور بے زبانوں کو زبان دی موجودہ نسلیں ہوری اور دھنیا کے ذریعہ سے اپنے عہد کی حقیقت کو سمجھیں گی .....اور کبھی اس نظام کو واپس نہیں آنے دیں گی جو ہوری کی جان لے لیتا ہے'' (ترقی پسند ادب ص126)

ممتاز حسین کے بعد ''گئودان پر تفصیلی نظر ڈالنے والے اردو کے دوسرے نقاد ڈاکٹر یوسف سرمست ہیں جنھوں نے متعدد پہلوؤں سے ناول کا کامیاب تجزیہ کیا ہے اور بعض ایسے کلیوں کی طرف نشاندہی کی ہے جو ایک نئے زاویہ سے ناول کی تفہیم کا تقاضا کرتے ہیں۔ یوسف سرمست کا خیال ہے کہ ناول کو سمجھنے کے لیے اس عہد کے تاریخی واقعات پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ گئودان 1936 کی تخلیق ہے اس سے چند برسوں پہلے 1931 میں گاندھی۔ ارون سمجھوتے کے نتیجے میں ملک کی قومی جدو جہد آزادی کی رفتار سست پڑ گئی تھی۔ تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ اس معاہدہ کے نتیجے میں کسانوں پر لگان بھی تھوپا گیا جس سے کسانوں کی حالت دن بہ دن بدتر ہوتی گئی، ان واقعات کا پریم چند پر ایسا غیر معمولی اثر پڑا کہ وہ گئودان میں کسی بھی موقعے پر کسان ہوری کو اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے خلاف نبرد آزما نہیں دکھاتے، ہوری اور اس کے دیگر ساتھی زمینداروں کے استحصال کو خاموشی سے سہتے ہیں، مصائب جھیلتے ہیں اور ہر وقت لگان کی ادائیگی کو اپنی قسمت سمجھ کر خاموشی سے ادا کرتے ہیں۔

یوسف سرمست نے اپنے تجزیہ میں اس بات کی تردید بھی کی ہے جس میں ناقدین کا ایک گروہ پریم چند کے خیالات کو اشتراکی کہہ کر ان کا فکری رشتہ سوویت یونین کی اس اشتراکی سائنس سے جوڑتا ہے جو ظلم کے خلاف ہر طرح کے تشدد اور انتہا پسندی کو جائز قرار دیتی ہے۔ 'گئودان' کا پلاٹ کئی جگہوں پر اشتراکی حقیقت نگاری کی تردید کرتا ہے۔ دراصل گورکی کی طرح پریم چند نے اشتراکیت کی روح کو براہ راست زندگی سے حاصل کیا تھا۔ یوسف سرمست رقمطراز ہیں ''پریم چند کے خیالات صاف طور پر اشتراکی خیالات سے مختلف اور جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں'' دراصل وہ ایک طرح کی اجتماعیت اور فلسفۂ عدم تشدد کے گرویدہ تھے اور اجتماعیت و عدم تشدد کے یہ آداب انہوں نے اپنے گرد و پیش کے ماحول اور گاندھی جی، سے سیکھے تھے جن لوگوں کی صحبتوں نے ان کے تخلیقی ذہن کو متاثر کیا تھا اس میں رہ کر وہ یہی کر سکتے تھے کہ اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدہ کے ذریعے سے ایک ایسی معاشرت کی ضرورت کو محسوس کرائیں جو غلامی، استحصال اور مہاجنی تہذیب کی لعنت سے پاک ہو اور جہاں صرف انسانیت کے رشتوں کا بول بالا ہو، ایک موقع پر وہ خود لکھتے ہیں:

'' مجھے فخر ہے کہ فطرت اور قسمت نے مدد کی اور مجھے غریبوں کا شریک غم بنا دیا اس سے مجھے روحانی تسکین ملتی ہے'' (بحوالہ بیسویں صدی میں اردو ناول ،ص 231)

باقر مہدی کا شمار اردو کے نہایت وسیع المطالعہ مارکسی نقادوں میں ہوتا ہے۔ 'گئودان' پر موصوف کا ایک مضمون 'گئودان ایک مختصر تنقیدی جائزہ' کے عنوان سے یعقوب راہی کی مرتب کردہ 'باقیات باقر مہدی' میں شامل ہے۔ باقر مہدی نے اپنے اس مضمون کی ابتداء میں یہ وضاحت کی ہے کہ کرداروں کی تخلیق اور ان کی نفسیاتی گرہ کشائی میں پریم چند ناکام ہیں ناول کے سب سے اہم کردار ہوری کے حوالے سے باقر مہدی کا خیال ہے کہ پریم چند کے اس سب سے اہم کردار میں ناول کے اختتام تک کوئی واضح ارتقاء نہیں ہو سکا ہے، کہانی کے آغاز میں وہ بوڑھا نہیں ہے لیکن اس کی زندگی تیاگی اور برہم چاری کی سی ہے۔ باقر مہدی کے نزدیک ہوری اور دھنیا کے بیچ لڑائی کی وجہ جنسی ناآسودگی تھی ناول میں پریم چند دھنیا کی اس نفسیاتی گہرائی تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ باقر مہدی کا تجزیاتی ذہن چند صفحات میں ناول کے تقریباً جملہ پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لیتا ہے بحث چاہے کردار نگاری کی ہو بیانیہ کی ہو یا فارم کی ہو باقر مہدی ہر پہلو سے ناول کا تجزیہ کرتے ہیں ویسے بھی اپنے معاصرین میں ان کا شمار ایک بے باک اور سخت گیر نقاد کے طور پر ہوتا ہے۔ ہوری کے حوالے سے انہوں نے ایک نئی بات یہ کہی ہے کہ ''ہوری کی بقا کی جدو جہد گئودان کی سب سے اہم کہانی ہے یعنی ہوری خود اتنا اہم کردار نہیں ہے، بقاء کی جدو جہد'' حقیقت بھی یہی ہے کہ ناول کے ہیرو (ہوری) کا زندگی کی جدو جہد کرتے ہوئے مر جانا کردار نگاری کے فن کا ایک زندہ اور توانا پہلو ہے، ہندوستانی روایت میں کہانیوں کا اختتام اکثر ہیرو کی جیت پر ہوتا تھا لیکن پریم چند نے یہاں حقیقت کو پوری برہنگی کے ساتھ قبول کیا ہے اور ہوری کے کردار میں گریک روایت کے المیاتی عنصر کو بڑی کامیابی سے برتا ہے۔ ہوری کا یہ کردار اردو ناول نگاری کی روایت کو پریم چند کا ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہیرو کو شہزادوں اور پریوں کی مخصوص روایتی محفل سے نکال کر اسے عوام کے بیچ لا کھڑا کرنا اس ناول کی مرکزی خصوصیت ہے۔ ممکنہ طور پر ہوری پہلا ہیرو ہے جس کی ہر خصوصیت میں سماج کے عام دلت اور مظلوم انسان کا عکس مکمل طور پر جھلکتا ہے۔

علاوہ ازیں احسن فاروقی نے اپنی تصنیف 'ناول کی تنقیدی تاریخ' وقار عظیم نے 'داستان سے افسانے تک میں'، 'گئودان' کے مختلف مباحث کا احاطہ کیا ہے بخوف طوالت سب پر فرداً فرداً گفتگو مشکل ہے لیکن ناول کے سیاق میں اردو تنقید کے اس مختصر جائزے کے بعد اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مارکسی تنقید کے علاوہ اردو تنقید کے دیگر دبستانوں نے اس اہم ناول پر توجہ دینے سے یکسر دامن بچایا ہے ہمیں مارکسی تنقید کے علاوہ اپنے پورے ادبی سرمائے میں 'گئودان' پر ایک مضمون بھی دور تک نظر نہیں آتا اس کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں لیکن اتنا بہر حال کہا جا سکتا ہے کہ 'گئودان' جیسے عظیم شاہکار سے یہ بے اعتنائی ہماری تنقید کی جانبدارانہ ذہنیت کو آشکار کرتی ہے اردو کی بہ نسبت بلاشبہ ہندی میں پریم چند اور اس ناول پر تصانیف کی تعداد سیکڑوں میں ہے اور یہ سلسلہ اب بھی زور و شور سے جاری ہے لیکن بقول راجیندر یادو ''پریم چند پر کام کرنے والے ابھی اندھی گلیوں میں بھٹک رہے ہیں اور اپنی کوتاہ بینی کے باعث پریم چند کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں'' دراصل ہماری اجتماعی زندگی نت نئے سوالوں سے دوچار ہونے کے باوجود بھی بہت سے پرانے مسئلوں میں الجھی ہوئی ہے۔ عورتوں کے استحصال کا مسئلہ تشدد کا مسئلہ، فرقہ واریت کا مسئلہ، یہ تمام مسائل برصغیر کی اجتماعی زندگی میں پیوست ہیں۔ پریم چند کے خواب سب کے لیے تھے ان کا ضمیر اپنے زمانے کی آواز تھا جہاں مذہب، ملت اور زبان کی بنیاد پر من و تو کی کوئی تفریق نہ تھی ظاہر ہے کہ پریم چند اور ان کے آخری مکمل ناول 'گئودان' کا جائزہ ان حوالوں سے بھی لیا جانا چاہیے۔

■

Javed Alam
121, Kaveri Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Mob.: 9968746689
Email.: javed.alam075@gmail.com

سمت کمار

اردو کی خواتین افسانہ نگار

انیسویں صدی ختم ہورہی تھی بیسویں صدی شروع ہونے کو تھی مگر ابھی تک عورت کی حقیقت مرد کے نقطۂ نظر سے ہی سامنے آرہی تھی۔ عورت کو نہ تو اس لائق سمجھا گیا اور نہ اس لائق بنانے کی کوشش کی گئی کہ وہ خود اپنی بات کہے۔ تاہم یہ صورت حال زیادہ دیر تک قائم رہنے والی نہیں تھی۔ رشیدۃ النساء بیگم کا ناول اصلاح النساء 1894 میں منظرِ عام پر آچکا تھا۔ یہ اس وقت ہوا تھا جب عورت کے نام اور اس کی آواز تک کا پردہ تھا۔ بدلتے وقت نے عورتوں کو یہ باور کرا دیا تھا کہ جذبے اور خیال کی آزادی کے بغیر ان کی حیثیت انسانوں کی نہیں ہے۔ لہٰذا کچھ نے یہ کہنا اور لکھنا بھی شروع کردیا مگر مسئلہ اس کی تشہیر کا تھا۔

شروع شروع میں جن عورتوں نے لکھنا شروع کیا ان پر نذیر احمد اور راشد الخیری کا اثر نمایاں تھا۔ انھوں نے گھریلو زندگی اور عورت کے متعلق مسائل کو اپنا موضوع بنایا لیکن ان کا اصل موضوع عورت کا استحصال تھا اس کے علاوہ کم عمری میں بے جوڑ شادیاں مردوں کا عورتوں پر ظلم مردوں کی دوسری شادی، بیوہ عورت کے مسائل ان کے اغلب موضوع تھے۔ اس رجحان کو مضبوط بنانے میں محمدی بیگم (والدہ امتیاز علی) کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ تہذیب نسواں، جو 1998 میں لاہور سے جاری ہوا، نے اہم رول ادا کیا۔ باوجود اس کے عورت افسانہ نگار بہت جلد مردوں کے ذریعے خلق کی گئی رومانی دنیا میں آپھنسی۔ بیگم عبدالقادر اور بیگم حجاب امتیاز علی ایک ایسی دنیا تخلیق کرنے لگیں جو خوبصورت اور رومان پرور تھی۔ جہاں عورت سراپا محبت، خوبصورتی کا منبع بن کر سامنے آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار پھر عورتوں کا معاملہ مرد لکھنے والوں کے ہاتھ میں آگیا۔ سجاد حیدر یلدرم نے حالانکہ پوری ایمانداری سے عورت کی ذات وصفات اور اہمیت کو اپنے افسانوں میں بیان کیا۔ ان کے نزدیک عورت کے بغیر مرد کی زندگی ادھوری اور نا تمام ہے۔ عورت سجاد حیدر کے یہاں بقول ان کے عیاشی اور گناہ کا مظہر نہیں بلکہ لطافت اور زندگی کے صحت مند تصور کی علامت ہے۔

دنیا کی کسی بھی قوم یا زبان کے ادب کا مطالعہ کیجیے، عورت ہمیشہ سے اغلب موضوع رہی ہے وہ ام القصص ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ عورتوں کے جذبات وخیالات اور احساسات کو مرد کیونکر قلم بند کرے۔ سوال یہ بھی ہے کہ وہ کیا ایسا کامیابی کے ساتھ کر بھی سکتا ہے، جس کا اسے تجربہ ہی نہیں ہے؟ کیونکہ ماں بننے کے احساس وجذبے کی صحیح ترجمانی ایک ماں ہی کرسکتی ہے۔

بہر حال اردو افسانے کی جاندار روایت پریم چند سے شروع ہوتی ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانوں میں سماجی ومعاشرتی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کی عکاسی کی اور اس صنف کو فنی طور پر بھی بام عروج پر پہنچا دیا پہلی بار انھوں نے عورت کے حوالے سے کوئی تھیوری یا فلسفے پر مبنی بات نہیں کہی بلکہ ان کے اصل مسئلے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کے بعد ترقی پسند تحریک کا دور شروع ہوا جس نے زندگی اور سماج کی حقیقتوں کو ادب کا موضوع بنانے کا اپنا نصب العین طے کیا۔ بے لاگ حقیقت نگاری کی بنیاد ڈالتے ہوئے ان تحریک سے وابستہ لکھنے والوں نے ایک افسانوی مجموعہ 'انگارے' کی اشاعت کی۔ ان میں خاتون افسانہ نگار رشید جہاں بھی تھی۔ رشید جہاں کی اس تحریک سے پہلے عورتیں بے چین تو تھیں، لیکن ان کے اندر وہ ہمت اور جرأت نہیں تھی کہ وہ اپنے تئیں تلخ حقیقتوں کو آشکارہ کرسکیں۔ رشید جہاں نے عورت کی شکست، بے بسی کو اپنا ہتھیار بنا کر عورتوں کے ظلم واستحصال کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ پہلی بار رشید جہاں نے عورت کی آزاد حیثیت کو تسلیم کروایا۔ نئے زمانے کے نئے ادب میں عورتوں نے قلم برداشتہ لکھا اور ادب میں خواتین کے محسوسات براہِ راست سامنے آئے اور آخر کار مردوں کو انھیں تسلیم کرنا پڑا۔

اردو ادب کے اس تاریخی دور میں یہ طے ہو گیا کہ اظہار کی سطح پر مرد اور عورت برابر ہیں۔ یہ سچائی بھی سامنے آئی کہ عورت کی صدیوں کی غلامی اور محکومی کا خاتمہ اسی وقت ہوگا جب اسے اظہار کی آزادی ملے گی اور وہ بے خوف وخطر اپنی بات دنیا کے سامنے کہہ سکے گی اور تب اس کو سنا جائے گا اور اس کی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا بھی کیا جائے گا۔

"وہ آزاد عورت ان باتوں سے چھٹکارا پا کر ہی وجود میں آئے گی جو آرہی ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کے تخیلات کی دنیا مردوں کی دنیا سے کس قدر مختلف ہوگی.......... کتنا فرق عورت کی اس دنیا میں مرد کی دنیا سے ہوگا۔ مگر عورت کی دنیا کا یہ فرق عورتوں کی ترقی کے امکانات کو روشن کرے گا۔ ایسے امکانات جنھیں مردوں نے دبا دیا تھا اور انسانیت کے لیے وہ گم ہو چکے تھے"۔

(سمون دی بوار)

بہر حال اس حقیقت کو قائم رکھنے کے لیے خواتین افسانہ نگاروں کی ایک پوری کھیپ اردو کے افسانوی ادب کے افق پر آگئی۔

ان میں رضیہ سجاد ظہیر، حجاب امتیاز علی، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو، بانو قدسیہ، رضیہ فصیح احمد، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور عصمت چغتائی کے علاوہ قرۃ العین حیدر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ تاریخی طور پر دیکھا جائے تو جس وقت خواتین افسانہ نگاروں کا قافلہ آگے قدم بڑھ رہا تھا اس وقت ہندوستان کی سیاسی وتہذیبی زندگی ایک انقلابی دور میں داخل ہو رہی تھی۔ انگریزی حکومت کے خلاف

بغاوت کا بگل بجنے لگا تھا۔ جگہ جگہ تحریکیں چلائی جا رہی تھیں۔ لوگ آزادی کے لیے جان کی بھی پرواہ نہیں کر رہے تھے۔ اس سماجی بحران میں رضیہ سجاد ظہیر جیسی افسانہ نویس نے اپنی تخلیق کے ذریعے خانگی زندگی اور متوسط طبقے کی معاشرت کی عکاسی کی۔ ان کے افسانوی مجموعے 'اللہ دے بندہ لے' میں اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی دختر نور ظہیر کہتی ہیں کہ:

''کبھی کبھی وہ اپنی کہانیوں میں ایسے مسائل پر روشنی ڈالتی تھیں جو کہ شاید سطحی طور پر نظر بھی آتے ہوں۔''

ان کا ایک افسانہ 'نمک' ہے جس میں نمک کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے کا کردار بہت مضبوط اور اثر دار ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر کے یہاں کردار نگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ اس افسانے کا مرکزی کردار صفیہ ہے۔ جب وہ پاکستانی سرحد پار کرتی ہے تو افسر سے اس طرح گفتگو کرتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''کسٹم والوں کو جانیں یا نہ جانیں پر ہم انسانوں کو تھوڑا سا ضرور جانتے ہیں۔''

''جامع مسجد کی سیڑھیوں کو میرا اسلام کہیے گا اور ان خاتون کو یہ نمک دیتے وقت میری طرف سے کہیے گا کہ لاہور ابھی تک ان کا وطن ہے۔ اور دہلی تو...... باقی سب رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

جیلانی بانو کا پہلا افسانوی مجموعہ 1958 میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ انھوں نے جاگیردارانہ نظام کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر پیش کیا اور اس عہد کی تہذیبی و سماجی فضا سے مواد اکٹھا کر کے تخلیقی میدان میں آگے بڑھیں۔ ان کے افسانوں کے کئی کردار ہمارے آس پاس چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ کردار سازی میں انھوں نے بہترین فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کا ایک افسانہ 'موم کی مریم' ہے جس میں انھوں نے عورتوں کے مسائل کو پیش کیا ہے اس افسانے میں جیلانی بانو نے ایک ایسی لڑکی کے کردار کو پیش کیا ہے جو اپنی شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتی ہے۔ اس افسانے کا ایک اقتباس دیکھیے:

''قدسیہ کے یہاں چھوٹی خالہ امجد بھائی کا پیغام لے کر گئیں تو قدسیہ نے خود آ کر کہہ دیا کہ وہ امجد سے بیاہ نہیں کرے گی۔ سنا ہے، چچا ابا زہر کھانے والے ہیں۔ سارے خاندان میں تھو تھو ہو رہی ہے۔''

اس طرح کا بے باک کردار تخلیق کرنا اس دور میں بڑے دل گردے کی بات تھی مگر اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خواتین افسانہ نگار ہر طرح کے موضوع پر قلم اٹھانے کی ہمت اپنے اندر پیدا کر چکی تھیں۔

جیلانی بانو کے علاوہ اسی طرح کا بے باک اور بے لاگ موضوع واجدہ تبسم کے افسانوں میں بھی ملتا ہے۔ واجدہ تبسم نے بھی اپنے افسانوں میں متوسط طبقے کے معاشی و معاشرتی حالات پر غور و فکر کر کے انھیں سماج کے سامنے پیش کیا۔

ان کا ایک افسانہ 'گلستان سے قبرستان تک' ہے جس میں جاگیردارانہ نظام کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس افسانے کے علاوہ انھوں نے نتھ کو علامت بنا کر کچھ افسانے لکھے ہیں۔ 'نتھ کا بوجھ' نتھ کی لاج جیسے افسانے منظر عام پر لا کر واجدہ تبسم نے افسانوی ادب کو نہ صرف جلا بخشی بلکہ عورتوں کے گونا گوں کوائف سے اردو عوام کو روشناس کرایا۔ ان افسانہ نگاروں کے علاوہ عصمت چغتائی کا نام بھی افسانے کی تاریخ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے متعلق یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ خود ایک عہد ہیں۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ تخلیق کر رہی ہیں وہ انھیں کیمرے کی نظر سے دیکھ رہی ہیں۔ نفسیاتی افسانوں کو جس اسلوب اور تکنیک کے ساتھ عصمت چغتائی نے پیش کیا ہے شاید ہی کسی دوسری خواتین افسانہ نگار نے پیش کیا ہو۔ ان کا ایک افسانہ 'لحاف' ہے جو عورت کی داخلی نفسیات کی کیفیات کو بیان کرتا ہے۔ عصمت چغتائی کے قلم نے معاشرے کی دکھتی رگ پر نشتر رکھنے کا کام کیا۔ انھوں نے عورتوں کی نفسیات کو اردو افسانے کا موضوع بنا کر اردو افسانے کو نئی راہوں سے آشنا کیا۔ ان کے کچھ افسانے تقسیم ہند سے متاثر ہو کر بھی لکھے گئے ہیں جس کی عمدہ مثال 'جڑیں' ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اماں کی زبان گنگ رہی۔ آج سے نہیں 15 اگست سے جب ڈاکٹر صاحب کے گھر پر ترنگا اور اپنے گھر پر لیگ کا جھنڈا لگا تھا۔ اس دن سے ان کی زبان کو چپ لگ گئی تھی۔ اور دو جھنڈوں کے درمیان میلوں لمبی خلیج حائل ہو گئی تھی۔ جس کی بھیانک گہرائی کو وہ اپنے غمگین آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر لرزا کرتیں۔

عصمت چغتائی کے علاوہ فن افسانہ نگاری میں جس بڑی شخصیت کا نام ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ قرۃ العین حیدر کا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی تہذیب اور تقسیم ہند کے موضوع کو بڑے کینوس پر برتا۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں کو زیادہ تر نسائی کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اور ان کے ذریعے نئی تہذیب کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے تقسیم ہند کے نقشے کو پیش کر کے افسانوی ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ایسے نہ جانے کتنے سماجی و معاشرتی مسائل کو انھوں نے اپنا موضوع بنایا اور ان مسائل کی گرہوں کو سلجھایا۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'ستاروں سے آگے'، 'پت جھڑ کی آواز' اور 'شیشے کا گھر' ہے۔ انھوں نے شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کر کے نئی تہذیب کے مثبت اور منفی رویوں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور یادِ ماضی کو تخلیق کا موضوع بنایا ہے۔ اس لیے ان کے موضوعات سیاسی سطح پر زیادہ متنوع ہیں ان کے فن کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تخلیق خاص اہمیت کی حامل ہے۔ ان کا ایک افسانہ 'جلاوطن' ہے جو تقسیم ہند کے واقعہ کو پیش کرتا ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''جنم جنم کے پڑوسی تھے اور کیا دوستی یگانگت کا عالم تھا، پر تھے ہم اُن کے لیے ملیچھ۔ ان کے چوکے کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے۔ اور ہماری اماں کا یہ مسئلہ تھا کہ اگر ہندو کی دکان سے کوئی چیز آتی تو اسے فوراً حوض میں غوطہ دے کر پاک کیا جاتا۔ ایک قوم اس طرح بنتی ہے؟ تقسیم کا مطالبہ ہند کی طرح ساری تاریخ کا منطقی نتیجہ ہے۔''

علاوہ ازیں ترقی پسند خاتون ادیبوں کے علاوہ جدید خاتون افسانہ نگاروں نے بھی اس فن میں دلچسپی دکھائی اور سماجی مسئلے کو پیش کر کے اپنی تخلیقات کے ذریعے انھیں حل کرنے کی کوشش کی۔ ان خواتین افسانہ نگاروں میں ترنم ریاض، ذکیہ مشہدی، غزال ضیغم، مسرور جہاں، صبیحہ انور، عائشہ صدیقی، عطیہ پروین، قمر قدیر ارم، صغریٰ مہدی، غزالہ قمر اعجاز وغیرہ شامل ہیں جنھوں نے اس صنف کو آگے بڑھانے میں حصہ لیا۔

بہر کیف مرد افسانہ نگاروں کی روش پر چل کر تو کچھ خواتین افسانہ نگاروں نے اپنی ایک راہ بنا کر افسانے کی صنف کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا اور اپنے قلم کی جوت سے، تو کچھ نے ایک سے بڑھ کر ایک افسانے اردو ادب کے سرمایہ میں شامل کیے۔ اردو ادب ان خواتین افسانہ نگاروں کا ہمیشہ ممنون رہے گا جنھوں نے اپنے دور کی قدامت پرستی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے افسانوں کی تخلیق کی اور افسانے کے دور کو عہد زریں تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کی۔

علاوہ ازیں انھوں نے سماج کے ایسے مسئلے کو موضوع بنایا جن سے عوام بے بہرہ تھے ان افسانوں کو پڑھ کر عوام میں بیداری کی لہر پیدا ہوئی۔ عورتوں کے تئیں لوگوں کا رویہ بدلا اور سماج میں انھیں برابری کا حق حاصل ہوا۔

■

Sumit Kumar
Research Scholar, Delhi University
Delhi - 110007
Moh.: 7417428810

اکیسویں صدی میں اردو ناول

رام پرساد مینا

انسانی جذبات وخیالات کی عکاسی کے لیے ادب سب سے بہتر ذریعۂ اظہار ہے۔ ادب ہی ہمارے معاشرے اور تہذیب وتمدن کی بہتر ترجمانی کرتا ہے۔ ادب ہی سے معاشرت میں تبدیلیاں اور تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ ادب ہی انسانی سماج کی تشکیل کرتا ہے اور اسے وحشی ہونے سے بچاتا ہے۔ معاشرتی ترجیحات کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی بہت سی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جس کا اثر فنکاروں کے ذہن پر بھی پڑتا ہے اور وہ انھی تبدیلیوں کے زیر اثر اپنی تخلیقات کو رنگ اور روپ عطا کرتے ہیں۔

ناول کا تعلق انسانی زندگی اور اس کے سماج سے ہے۔ یہ انسانی زندگی کے مسائل و اقدار کی تفہیم وتعبیر کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ تہذیب ومعاشرت کی عکاسی جس بہترین انداز میں ناول میں ہوتی ہے وہ شاید ہی کسی دوسری صنف میں ہوتی ہو۔ ناول کا کینوس بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ حیات و کائنات کے بیشتر مسائل کو پورے سیاق وسباق کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس میں موضوعات اور اسالیب کی سطح پر بھی بہت آزادی ہوتی ہے۔ بہت سے سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، تاریخی، سائنسی موضوعات ناول میں سما جاتے ہیں۔ ناول ہمارے عہد کی ایک مقبول ترین صنف ہے اور اس صنف نے بہت زیادہ مقبولیت اور عظمت بھی حاصل کی ہے۔ ناول کے آغاز سے لے کر اب تک کا جو منظرنامہ ہے وہ زیادہ مایوس کن نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کے عہد میں بڑے ناول نہیں لکھے جا رہے ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ناول کی صنف کمزور ہو رہی ہو۔ آج کے عہد میں بھی کچھ ایسے ناول نگار ہیں جن کی وجہ سے ناول کی صنفی عظمت میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس میں تخلیق کار اسلوب اور موضوع کی سطح پر نئے نئے تجربے بھی کر رہے ہیں۔ چونکہ زمانہ بدلا ہے اس لیے ناول کے طرز تحریر میں بھی تبدیلی آئی ہے اور فنکاروں کا طرز احساس بھی بدلا ہے۔ 1980 کے بعد کے منظرنامے پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں ناول میں بڑے اہم نام ملتے ہیں جن میں عبدالصمد، حسین الحق، شموئل احمد، غضنفر، پیغام آفاقی، ترنم ریاض، مشرف عالم ذوقی، شائستہ فاخری، ثروت خان، رحمٰن عباس، خالد جاوید، اختر آزاد اور احمد صغیر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے اپنے عہد کی معاشرت کی بہت ہی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ تمام ناول نگاروں کا فرداً فرداً ذکر مشکل ہے۔ اس لیے چند ناول نگاروں تک ہی میری گفتگو محدود ہوگی۔ یہ ناول نگار وہ ہیں جنھوں نے ناول کی دنیا کو نئے امکانات سے روشناس کرایا ہے اور ہماری تہذیب ومعاشرت کے نقوش اپنے ناولوں میں پیش کیے ہیں۔ انھی میں عبدالصمد جیسے ناول نگار بھی ہیں جنھیں ساہتیہ اکادمی کا باوقار ایوارڈ مل چکا ہے۔ ان کا شمار اس عہد کے ممتاز فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ ناول اور افسانہ دونوں میں یکساں فنی مہارت رکھتے ہیں۔ انھوں نے کئی مشہور ناول لکھے ہیں جن میں دو گز زمین 1988، مہاتما 1992، خوابوں کا سویرا 1994، مہاساگر 1999، اور دھمک 2004 قابل ذکر ہیں۔ ناول دھمک میں انھوں نے سیاست کی میں بدعنوانیوں اور استحصال کے بھیانک رنگ کی تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عبدالصمد نے صوبہ بہار کی سیاست کے گلیاروں کا بہت گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ اس لیے ان کے ناولوں میں سیاسی موضوعات بکثرت ہیں۔ سیاست ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اس لیے بہت سارے سیاسی مسائل کو انھوں نے اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ ناول 'شکست کی آواز' میں عبدالصمد نے سیاست اور معاشرت کے موضوع سے الگ ہٹ کر جنسیت کو اپنا موضوع بنایا ہے اور ندیم نام کے ایک Introvert نوجوان کی شخصیت میں پوشیدہ جنسی شعور کی پیچیدگیوں کو پیش کیا ہے۔ ندیم لڑکیوں سے ڈرتا ہے لیکن نوری کو نیم عریاں انداز میں دیکھتا بھی ہے۔ مگر جب لڑکی اپنا جسم دکھانے لگتی ہے تو نوجوان گھبرا جاتا ہے۔ اس ناول کے ذریعے ناول نگار نے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں اور سماج کے دوغلے رویے کو بھی پیش کیا ہے۔

غضنفر بھی اس عہد کے بہت ہی کامیاب فکشن نگار ہیں جنھوں نے بہت سے ناول لکھے ہیں۔ جن میں پانی، کینچلی، دویہ بانی، فسوں، وش منتھن، شوراب، مانجھی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ 'دویہ بانی' میں انھوں نے پہلی بار دلتوں کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ دلت ڈسکورس مابعد جدیدیت کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ غضنفر نے اردو میں دلتوں کے کرب اور اذیت کو بہت ہی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے

ناول ہمارے عہد کی ایک مقبول ترین صنف ہے اور اس صنف نے بہت زیادہ مقبولیت اور عظمت بھی حاصل کی ہے۔ ناول کے آغاز سے لے کر اب تک کا جو منظرنامہ ہے وہ زیادہ مایوس کن نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کے عہد میں بڑے ناول نہیں لکھے جارہے ہیں۔لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ناول کی صنف کمزور ہورہی ہو۔ آج کے عہد میں بھی کچھ ایسے ناول نگار ہیں جن کی وجہ سے ناول کی صنفی عظمت میں اضافہ ہورہا ہے اور اس میں تخلیق کار اسلوب اور موضوع کی سطح پر نئے نئے تجربے بھی کررہے ہیں۔ چونکہ زمانہ بدلا ہے اس لیے ناول کے طرز تحریر میں بھی تبدیلی آئی ہے اور فنکاروں کا طرز احساس بھی بدلا ہے۔

اور ان کی حاشیائی حیثیت کو ناول کے ذریعے پیش کیا ہے۔

وش منتھن میں انھوں نے ہندو مسلم تعلقات، اختلافات اور تضادات کو موضوع بنایا ہے جبکہ شوراب بیانیہ اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد غضنفر نے 'مانجھی' جیسا ناول لکھا۔ اس ناول پر بہت زیادہ گفتگو ہوئی اور اسے غضنفر کا ایک اہم ناول مانا جاتا ہے۔ مانجھی کا ہیرو وی این رائے ہے اور اس کردار کے ذریعے غضنفر نے اس عہد کی سیاست، ثقافت اور معاشرت کو بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس ناول میں بہت سارے اساطیر اور علامات بھی ہیں۔ کردار کے ذریعے یہ واضح کیا گیا ہے کہ آج کی تہذیب وثقافت میں کس طرح ذہنی اور فکری تصادم کی شکلیں پیدا ہوتی ہیں اور کس طرح ایک معمولی چیز دو فرقوں کے درمیان تفرقے کا سبب بن جاتی ہے۔

خواتین ناول نگاروں میں ترنم ریاض منفرد مقام

رکھتی ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کو کئی شاہکار ناول عطا کیے ہیں جن میں مورتی، برف آشنا پرندے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ مورتی ناول میں ازدواجی زندگی کے مسائل اور ناکام ازدواجی زندگی کے اسباب کو بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کا دوسرا ناول 'برف آشنا پرندے' ہے جو اشاعت کے بعد سے ہی ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اس ناول میں ایک مسلم کشمیری خاندان کے تہذیبی زوال کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس کہانی کے کردار میاں بیوی ہیں جن کے درمیان اختلافات اور ناراضگی بھی ہے۔ اس میں شوہر کی زیادتی اور بیوی کا صبر و استقلال بھی ہے۔ ان دونوں کے جھگڑوں کا اثر ان کی اولاد پر بھی صاف نظر آتا ہے۔ یہ ناول آج کے رشتوں کی بہترین عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔

یہ بہت ہی اہم موضوع پر لکھا گیا ناول ہے۔ یہ آج کا موضوع ہے کیونکہ آج میاں بیوی کے درمیان اختلافات کی وجہ سے بچوں پر اس کے منفی اثرات پڑ رہے ہیں۔ اس تعلق سے بہت سی نفسیاتی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ خاص طور پر ازدواجی رشتوں میں جو دراڑ پیدا ہو جاتی ہے اس پر بھی مقالات و مضامین لکھے جاتے رہے ہیں لیکن ایک ناول نگار کس طرح اس موضوع کو مَس کرتا ہے وہ دیکھنا ہو تو 'برف آشنا پرندے' میں دیکھیے۔ انھوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس موضوع کو پیش کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ عورت مرد کے درمیان تناؤ سے بچوں کی ذہنی اور فکری توانائی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے خواب بھی مرجھا جاتے ہیں۔ ان کا مستقبل بھی اندھیرے میں بھٹکنے لگتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بے بس اور بے سہارا ماننے لگتے ہیں۔ میاں بیوی اور بچوں کی نفسیات کے حوالے سے یہ ناول بہت ہی عمدہ ہے۔ آج کی معاشرت میں اس طرح کے ناولوں کی بڑی شدید ضرورت تھی۔ ترنم ریاض چونکہ عورتوں کی نفسیات سے اچھی طرح آگاہ ہیں اور مردوں کے احوال سے بھی باخبر ہیں اور بچوں کے تئیں بھی ان کا ایک مشفقانہ رویہ ہے، اس لیے بڑی ہی عمدگی کے ساتھ وقت کی ضرورت کے تحت انھوں نے اس اہم موضوع کو اپنے ناول کا حصہ بنایا ہے اور اس موضوع کی اہمیت اور ان کے اسلوب کی ہی وجہ سے 'برف آشنا پرندے' کا شمار ہمارے عہد کے ایک اہم ناولوں میں ہوتا ہے۔

شائستہ فاخری بھی ہمارے عہد کی ایک اہم فکشن نگار ہیں۔ انھوں نے بہت جلد مقبولیت اور شہرت کی بلندیاں طے کی ہیں۔ ان کے ناولوں کے جو موضوعات ہیں ان موضوعات نے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ خاص طور پر تانیثی ڈسکورس کے ذیل میں ان کے ناول بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ تانیثیت مسائل اور متعلقات کو انھوں نے بڑی عمدگی کے ساتھ اپنے ناول کا مرکز بنایا ہے۔ ان کے ناولوں میں عورت ایک مفعول نہیں ایک فاعلی کردار میں نظر آتی ہے۔ ایک احتجاجی اور باغیانہ تیور لیے ہوئے عورتیں ان کے ناولوں کا کردار بنتی ہیں اور عورتوں کی زندگی سے متعلق مسائل اور مصائب کو بہت ہی

معروضی اور منطقی انداز میں پیش کرتی ہیں۔ شائستہ فاخری کا طرز تحریر بھی بہت عمدہ ہے۔ قاری کو اپنی طرف کھینچنے کی پوری طاقت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شائستہ فاخری نے بہت کم عرصے میں فکشن نگاروں کی صف میں اپنا ایک اہم مقام پیدا کر لیا ہے۔ 'نادیدہ بہاروں کے نشاں میں' عورت کی مظلومیت اور بے بسی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جو مرد کی خود غرضی، بے دردی اور انانیت کا ثبوت ہے۔ اُنھوں نے ایک نازک مسئلے 'حلالہ' کو بڑی سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ 'حلالہ' ایک ایسا مسئلہ ہے جو آج سیاسی گفتگو کا بھی مرکز بن چکا ہے اور اس پر پہلے بھی کئی افسانے لکھے جا چکے ہیں مگر شائستہ فاخری نے 'حلالے' کے موضوع کو اپنے طور پر تانیثی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار علیزہ ہے۔ اس میں ایک طرف عورت کی بے بسی اور لاچاری کا اظہار ملتا ہے تو دوسری طرف مرد کے جابرانہ رویے کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے جو ناول ہیں ان میں آج کے عہد کے ان مسائل کو مرکز بنایا گیا ہے جو عورت کی ذات اور زندگی سے متعلق ہیں۔ شائستہ فاخری نے عورتوں پر ہونے والے مظالم کو اپنے سماج میں دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان بے بس اور مظلوم عورتوں کے لیے آواز بلند کرتی ہیں۔ ان کے ناول مرد حاوی نظام کے خلاف ایک طرح سے صرف احتجاج نہیں ہیں بلکہ حقیقت کی عکاسی ہے۔ انھوں نے جس طور پر عورتوں کو دیکھا اور محسوس کیا ہے اسی طرح ان کے کرب اور اذیت کی داستان تحریر کر دی ہے۔ شائستہ فاخری کے یہاں بڑے امکانات ہیں اور ان سے مستقبل میں بھی بڑی توقعات ہیں۔ ان کا تخلیقی سفر اسی طرح جاری رہے گا تو یقیناً اردو ادب کا دامن اور بھی عمدہ اور خوبصورت ناولوں سے بھر جائے گا اور صنفِ ناول کی ثروت میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔

ان کے علاوہ مشرف عالم ذوقی نے بہت سے اہم ناول لکھے ہیں جن میں مسلمان، بیان، پوکے مان کی دنیا، لے سانس بھی آہستہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور معاشرت کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے اور بہت ہی بے باکی کے ساتھ سیاسی مسائل پر گفتگو کی ہے۔ 'لے سانس بھی آہستہ' ان کا ایک بہت عمدہ ناول ہے۔

احمد صغیر بھی ایک اچھے ناول نگار ہیں جن کے کئی ناول منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جنگ جاری ہے، دروازہ ابھی بند اور ایک بوند اجالا ان کے اچھے ناول ہیں۔ ان میں آج کی تہذیبی اور معاشرتی اقدار کی شکست کے المیے کو موضوع بنایا گیا ہے اور مشترکہ تہذیب کے بکھراؤ کو انھوں نے مرکز میں رکھ کر ناول تحریر کیے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سے ناول نگار ہیں جن پر گفتگو کی جا سکتی ہے مگر یہاں صفحات کی تنگ دامانی کی وجہ سے سب پر تفصیلی گفتگو ممکن نہیں ہے۔ آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے عہد کے ناول نگاروں نے اپنے دور کے سماجی اور سیاسی مسائل کو بڑی بے باکی سے بیان کیا ہے اور اکیسویں صدی میں اردو ناول فن اور موضوع ہر اعتبار سے ارتقاپذیر ہے۔ جس طرح کے مسائل زندگی میں جنم لے رہے ہیں ان مسائل کے حوالے سے ناول بھی تحریر کیے جا رہے ہیں اور یہ ناول یقینی طور پر ہمارے عہد کی سیاسی اور سماجی دستاویز بنتے جا رہے ہیں۔

■

Ram Parsad Meena
Research Scholar, Dept of Urdu
Dehli University
Delhi-110007

نیلوفر حفیظ

ماہر بصریات وریاضیات

ابن الہیثم

علم ہیئت وفلکیات، ریاضیات وادبیات اور تاریخ نگاری ولغت نویسی وغیرہ جیسے مشکل وپیچیدہ علوم میں مسلمان سائنس دانوں اورادیبوں نے جو کارہائے گرانقدر انجام دیے ان سے اغماض یا چشم پوشی کسی طور پر بھی ممکن نہیں ہے۔ بالخصوص سائنس کے میدان میں مسلمان سائنس دانوں کے متحیر کن انکشافات اور متعجب کردینے والی ایجادات نے اہل جہاں کو انگشت بدنداں کردیا۔ مسلمان سائنس دانوں کا سب سے بڑا، اہم اور خاص وصف یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے تمام تر سائنسی انکشافات واختراعات کی بنیاد اپنے دقیق وعمیق مطالعے اور تجربات ومشاہدات کی روشنی میں دلائل وبراہین پر رکھی ان بیدار مغز اور روشن ذہن لوگوں نے یونانی فلسفے کی گرداب میں اپنی حیثیت وشناخت کھودینے کے بجائے اپنے لیے نئی راہوں کا تعین خود کیا اپنی محنت شاقہ سے کیے گئے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں نتائج اخذ کیے اور سائنس کی بنیادوں کو مستحکم واستوار کرنے میں ہیچ دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ دنیا کے صف اول کے سائنسدانوں میں ابوعلی الحسن بن الحسن ابن الہیثم کا نام سرفہرست ہے۔ ابن الہیثم ایک عظیم، معتبر اور قابل رشک شخصیت کا نام ہے جنھوں نے جریدہ عالم پر کبھی نہ محو ہونے والے راسخ اور ہمہ گیر نقوش مرتب کیے۔ اس یگانۂ عصر اور نابغۂ روزگار سائنسداں کے سائنسی کارنامے اہل جہاں کے لیے اس وقت تک منفعت بخش اور سودمند ثابت ہوتے رہیں گے، جب تک یہ کائنات جاری وساری ہے۔ دور حاضر میں اس عظیم شخصیت کی ایجادات واختراعات کی بنیاد پر ہی جدید سائنس کی بنیادیں استوار کی جارہی ہیں۔

ابوعلی الحسن بن الحسن ابن الہیثم کی پیدائش 965 میں عراق کے ایک مشہور شہر بصرہ میں ہوئی۔ ایام کودکی سے ہی انھیں علم فلکیات، ہندسہ، ریاضی، فلسفہ، نفسیات اور سائنسی علوم سے غیر معمولی شغف تھا کاتب ازل کی طرف سے ذہن رسا بخشا گیا تھا چنانچہ بہت کم عمری ہی میں علوم مروجہ میں مہارت تامہ حاصل کرسکے تھے۔ غور وفکر اور تجربات ومشاہدات کی عادت ابتداء ہی سے تھی اس لیے بہت جلد وہ نئے نئے انکشافات اور تحیر آمیز اختراعات کی طرف متوجہ ہوگئے اور ان کے حیرت انگیز وشگفت آمیز کارنامے بہت جلد لوگوں پر ظاہر ہونے لگے۔ ان کے سائنسی کارناموں کے سبب معاصرین میں ان کو عزت ووقعت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ 996 میں ان کی بے پناہ ذہانت ولیاقت کا شہرہ سن کر مصر کے فاطمی خلیفہ الحاکم نے انھیں اپنے یہاں آنے کی دعوت خاص دی جو انھوں نے بسر وچشم قبول بھی کرلی اور مصر چلے آئے اور ابن الہیثم پہلے مسلمان ماہر طبعیات، ہیئت دان، ریاضی دان اور طبیب مانے جاتے ہیں جن کی حیرت انگیز صلاحیتوں نے ان کے معاصرین ومتاخرین کو قعر حیرت میں ڈال دیا۔ مزاجاً وہ سادگی پسند، اعلیٰ ظرف، باریک بین، بلند خیال اور بشر دوست انسان تھے انھوں نے اپنی ہمہ زندگی تحقیق وتالیف میں گزاری، اپنے شاگردوں کو مفت تعلیم دینے کا انتظام کیا، نئے نئے تجربات کیے اور نئے مشاہدات کو سپرد قلم وقرطاس کرکے برائے آئندگان بیش بہا سرمایہ فکر وراثت میں چھوڑا تاکہ یہ لوگ ان تجربات ومشاہدات کی روشنی میں اپنی آگے کی راہیں متعین کرسکیں اور اس جہان فانی میں حیات جاوداں حاصل کرسکیں، اگر عہد وسطی کے

مورخین کی مانیں تو ابن الہیثم نے تقریباً 200 تالیفات اپنی یادگار چھوڑی تھیں مگر جائے تاسف ہے اس نابغہ روزگار اور یگانہ عصر شخصیت کا بہت سا تحریری سرمایہ آشوب روزگار کی نذر ہوکر صفحہ عالم سے اپنا وجود فنا کرچکا ہے یا اگر دستبرد زمانہ سے بچ بھی گیا ہے تو محققین کی دوررس ودقیق بین نظریں بھی اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں لیکن تمام تر حالات نامساعد اور دستبرد زمانہ کے باوجود تقریباً پچاس کتابیں اب بھی ہماری دسترس میں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح کے لوگ یقیناً صدیوں میں شاذ ونادر پیدا ہونے والوں میں سے ایک ہیں ذیل میں ابن الہیثم کی دستیاب شدہ کتابوں میں سے کچھ کتابوں کی فہرست دی جارہی ہے:

1۔ کتاب المناظر، 2۔ مقالۃ فی التحلیل والترکیب، 3۔ میزان الحکمۃ، 4۔ تصویبات علی المجسطی، 5۔ مقالۃ فی المکان، 6۔ التجدید الدقیق للقطب، 7۔ رسالۃ فی الشفق، 8۔ کیفیۃ حساب اتجاہ القبلۃ، 9۔ النمر وسۃ الافقیۃ 10۔ شکوک علی بطلیموس، 11۔ مقالۃ فی فرسطون، 12۔ کمال الخاریط، 13۔ رواۃ الکواکب، 14۔ مقالۃ فی تریخ اندائرۃ، 15۔ المرایا المحرقۃ بالدوائر، 16۔ تکوین العالم، 17۔ مقالۃ فی صورۃ الکسوف، 18۔ مقالۃ فی ضوء النجوم، 19۔ مقالۃ فی ضوء القمر، 20۔ مقالۃ فی قوس قزح، 21۔ کیفیات الاظلال، 22۔ مقالۃ فی درب القبابۃ، 23۔ اتجاہ القبلہ، 24۔ نماذج حرکات الکواکب اسبعہ، 25۔ نموذج الکون، 26۔ حرکۃ القمر، 27۔ الحرکۃ المعرجۃ، 28۔ رسالۃ فی الضوء، 29۔ رسالۃ فی المکان، 30۔ تاثیر اللحون الموسیقیۃ فی النفوس الحیوانیۃ، 21۔ کتاب فی تحلیل المسائل الہندسہ، 32۔ الجامع فی

اصول الحساب، 33۔قول فی مساحۃ الکرۃ 34۔ القول المعروف بالغریب فی حساب المعاملات، 35۔خواص المثلث من جہۃ العمود، 36۔رسالۃ فی مساحۃ المجسم المکافی، 37۔شرح اصول اقلیدس، 38۔المرایا المحرقۃ بالعطوع

ابن الہیثم کی شہرت دوام کی سب سے اہم کتاب ''کتاب المناظر'' ہے وہ پہلے سائنس داں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے نظریہ بصارت کی درست تشریح وتوضیح پیش کی ہے مثلاً اشعۂ نور کے انعکاس وانعطاف، اغلاط بصر، قوس وقزح، قوت ثقل وغیرہ کے سلسلے میں وہ حیرت انگیز انکشافات کیے جو سائنس کی دنیا میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں انھوں نے بطلیموس کے اس نظریے کو کہ ''روشنی جب اشیاء پر پڑتی ہے تو چیزیں دکھائی دیتی ہیں'' کو پوری طرح سے رد کیا اور اپنی تحقیق کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ جب روشنی ہماری آنکھ میں داخل ہوتی ہے تو ہی ہم چیزوں کو دیکھ پاتے ہیں انھوں نے شعاعوں کے اس قدیم نظریے کو پوری طرح غلط ثابت کیا کہ جب روشنی کسی شے پر پڑتی ہے تو کرنیں پلٹ کر فضا میں تحلیل ہوجاتی ہیں اور ان میں سے بعض شعائیں دیکھنے والے کی آنکھ میں داخل ہوجاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ چیزیں ہم کو دکھائی دینے لگتی ہیں، انھوں نے اس سلسلے میں صدہا تجربات کے ذریعے ثابت کیا کہ جب آنکھ سے نکل کر شعاع کسی چیز سے ٹکراتی ہے تبھی ہم کو چیزیں نظر آتی ہیں، انھوں نے کہا جب کسی شے پر روشنی پڑتی ہے وہ شے اس روشنی کو متعین سمتوں میں بھیج دیتی ہے روشنی کا یہ وصف ہے کہ جب کسی شے سے ٹکراتی ہے تو اسی زاویے سے واپس بھی مڑ جاتی ہے جس زاویے سے ٹکراؤ ہوتا ہے جس سے نکلی ہوئی کچھ شعائیں آنکھوں میں داخل ہوجاتی ہیں جو خط مستقیم میں سفر کرنے والی شعاعوں کے راستے میں آجاتی ہیں اور اس طرح وہ چیزیں آنکھوں کے ذریعے نظر آنے لگتی ہیں۔ان کے بعد دنیا کے بڑے بڑے سائنس دانوں نے اس پر تجربات کیے اور ابن الہیثم کی تقلید کی ان کے دکھائے گئے راستے پر چل کر اپنی منزل مقصود حاصل کی مگر افسوس کہ ہم اس مسلم سائنسداں کی محنت شاقہ سے تیار کردہ تحقیقات کو فراموش کرکے مغرب کے ان سائنس دانوں کو قابل رشک نظروں سے دیکھتے ہیں۔

جناب احمد خان صاحب نے بالکل صحیح کہا ہے:

''ابن الہیثم کا اثر یورپ پر بہت زیادہ رہا ہے چنانچہ تقریباً پانچ صدیوں تک اس کی کتابیں ونظریات یورپ میں مقبول ورائج رہے اگر یہ شخص یورپ میں پیدا ہوا ہوتا تو اب تک ہزارہا کتابیں اس کی زندگی اور نظریات پر لکھی جاچکی ہوتیں مگر افسوس مسلمانوں کی موجودہ نسل بطلیموس، کیلر اور ہیکن وغیرہ سے تو پوری طرح واقف ہے مگر اپنے اسلاف کی اس کو خبر نہیں وہ ابن الہیثم کی بہ نسبت نیوٹن سے زیادہ واقف ہے حالانکہ نیوٹن کے نظریات میں ابن الہیثم کے نظریات کا ایک اہم حصہ ہے۔''[1]

ابن الہیثم کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے روشنی کے انعکاس وانعطاف کے اصول وقواعد دریافت کیے، گردی اور مخی Sherical/Parabalic آئینوں پر اس کی تحقیق بھی اس کا ایک بہترین کارنامہ قرار دیا جاتا ہے انھوں نے اصطلاحات بھی وضع کیں جیسے 'آنکھ کا عدسہ' مسور کی دال سے مشابہ نظر آیا تو اس کو عدسہ کا نام دے دیا۔عربی زبان میں مسور کی دال کو عدس اور لاطینی زبان میں لینٹل Lentil کہتے ہیں اسی مناسبت سے اس کو lense بھی کہا گیا۔آنکھ کے مختلف حصوں کی توضیح وتشریح کے لیے ذاتی گراف بناکر ان کی تکنیکی اصطلاحات بھی ایجاد کی ہیں مثلاً Retina, Cataract, Cornia وغیرہ جو آج بھی بدون کسی تبدیلی کے رائج ہیں۔

ابن الہیثم نے اپنے تجربات وتحقیقات کی روشنی میں یہ بھی ثابت کیا کہ حرارتی توانائی کی طرح روشنی ایک قسم کی توانائی ہی ہوتی ہے جو بغیر کسی سہارے کے خط مستقیم پر چلتی ہے لیکن اس کی رفتار میں کمی وبیشی ہوسکتی ہے یعنی جب وہ لطیف جسم سے گزرنے لگتی ہے تو اس کی رفتار میں خود بہ خود تیزی آجاتی ہے جب کہ کثیف جسم سے گزرنے پر اس کی رفتار کم ہوجاتی ہے اس عظیم شخصیت نے نہ صرف آنکھ کی ہیئت وساخت پر تفصیلی بحث کی بلکہ کیمرہ کی ایجاد کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے انھوں نے ایک تاریک چھوٹے کمرے میں چھوٹے سوراخ کے ذریعے روشنی پہونچائی سوراخ کے سامنے ایک پردہ لٹکا دیا جس پر سوراخ سے آنے والی روشنی اور اس روشنی میں نظر آنے والی چیزوں کا عکس پڑسکے۔انھوں نے دیکھا کہ روشنی میں دکھائی دینے والی چیزیں پردے پر الٹی نظر آرہی ہیں ان کا یہ مشاہدہ آنکھ کے افعال کو بخوبی سمجھانے میں مددگار ہوا، انھوں نے محراب دار شیشے Carcave mirror پر ایک نقطہ معلوم کرنے کا طریقہ بھی ایجاد کیا جس کی وجہ سے عینک کے شیشے کی دریافت ہوسکی اس کے علاوہ انھوں نے اصول جمود کی تعبیر وتشریح پیش کی جو بعد کے سائنس دانوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا، محمد زکریا ورک اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

''ابن الہیثم نے اصول جمود Law of interia دریافت کیا جو بعد میں نیوٹن کے فرسٹ لا آف موشن کا حصہ بنا اس نے کہا اگر روشنی کسی واسطے سے گزر رہی ہو تو وہ ایسا راستہ اختیار کرتی ہے جو آسان ہونے کے ساتھ ساتھ تیز تر بھی ہو یہی اصول صدیوں پہلے فرنچ سائنس داں Fermat نے دریافت کیا تھا۔''[2]

ابن الہیثم نے آنکھ کی بناوٹ وساخت اور اس کے ہر حصے کے کام کو پوری وضاحت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے جس میں دور حاضر تک کے سائنس داں اپنی تمام تر دلیلوں کے باوجود بھی ذرہ برابر تبدیلی لانے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں یہ ابن الہیثم ہی ہیں جنھوں نے آنکھوں کا دھوکہ یا آنکھوں کا وہم جیسی بیماریوں کی دریافت کی اور بتایا کہ بعض حالات میں نزدیک کی چیزیں دور اور دور کی چیزیں نزدیک دکھائی دینے لگتی ہیں اس کی حقیقت پر انھوں نے نہایت درست طریقے سے بحث کی ہے۔الطاف حسین اپنے ایک مضمون میں ان کی اختراعات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ان کی اہمیت وافادیت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''انھوں نے پردہ بصارت (Retina) کی اہمیت پر بحث کی اور اس کا optoc nerve اور دماغ Brain کے ساتھ باہمی تعلق واضح کیا مزید برآں ان کا نام Astronomical, Metrology, Velocities, Light, Lense, Observation اور Camera وغیرہ پر تاسیسی شان حاصل ہے۔''[3]

مختصراً یہ کہ جب مسلمان صرف سائنس کے شعبے نہیں بلکہ دیگر تمام علوم وفنون میں مسند اعلیٰ پر فائز تھے ان کے حیرت انگیز کارنامے اذہان وقلوب کو متعجب کردینے والے تھے، ان میں بڑے بڑے نامور حکیم، ادیب، شاعر، فلسفی، ریاضی داں، ماہر فلکیات، جغرافیہ داں، تاریخ نویس اور علم طب وغیرہ جیسے اہم علوم کے موجد وبانی ہوئے۔ ہماری ان بزرگ شخصیات نے اپنی بے پناہ ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے جو بیش بہا اور گرانقدر کارنامے انجام دیے اس کی نظیر تاریخ عالم میں کہیں اور نظر نہیں آتی ہے۔

منابع وماخذ:

1۔ معارف جنوری 1970، مضمون ابن الہیثم کا جشن ہزار سالہ از قلم احمد خان صاحب، ص 67، شبلی اکاڈمی اعظم گڑھ۔
2۔ مسلمانوں کے سائنسی کارنامے: محمد زکریا ورک، ص: 70، مرکز فروغ سائنس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
3۔ رسالہ الطاہر شمارہ 48، الطاف حسین میمن طاہر، ص: 45، جماعت اصلاح مسلمین، پاکستان 2007۔

Dr. Neelofar Hafeez
Lecturer Farsi, Dept Arabi wa Farsi
Danishgah Allahabad
Allahabad - (UP)

سماج پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے اثرات

محمد افروز عالم

سائنس مطالعہ کرنے کا وہ جدید ترین طریقہ ہے جس میں عملی تجربے کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ایک سائنسداں اس کائنات میں پائی جانے والی بے شمار چیزوں کو لیبوریٹری میں تجربہ کرتا ہے اوران تجربوں کی روشنی میں ٹھوس نتائج اخذ کرتا ہے۔ اس طرح سائنس کی مدد سے جو معلومات حاصل کی جاتی ہیں وہ بڑی ٹھوس ہوتی ہیں۔ اس طرح مطالعہ کرنے کا طریقہ سب سے پہلے سر آئزک نیوٹن نے سترھویں صدی میں ایجاد کیا تھا۔ نیوٹن کی کامیابی کے بعد علم ودانش کی دنیا میں نئے نئے تجربے کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوااور بایولوجی، کیمسٹری، میڈیسن کے میدان میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔

سائنس کے دو اقدار ہیں۔ اصول اور ایجاد۔ اصولی میدان میں البرٹ آئنسٹائن کو سائنس کے نئے اقدار کا مسیحا مانا جاتا ہے۔ بڑے بڑے سائنسدانوں کے کارناموں کے نتیجے میں سترھویں صدی میں ایک نیا سائنٹفک نقطۂ نظر پیدا ہوا۔ اس سائنٹفک نقطۂ نظر کو وجود میں لانے والے مندرجہ ذیل اجزا یہ تھے:

1. حقائق کا اظہار مشاہدے پر مبنی ہونا چاہیے۔
2. غیر ذی حیات دنیا خود کار اور خود قیامی نظام ہے جس میں ساری تبدیلیاں قوانین فطرت کے مطابق ہوتی ہیں۔
3. زمین کائنات کا مرکز نہیں ہے اور شاید انسان اس کی غرض و غایت نہیں ہے۔ مزید برآں مقصد یا غرض، ایک ایسا تصور ہے جو سائنس کے نقطۂ نظر سے بے کار ہے۔

عصر جدید کی سائنس اس پر یقین رکھتی ہے کہ اسباب دو قسم کے ہوتے ہیں۔ 'موثر' اور 'آخری'۔ موثر سبب ہوتا ہے اور آخری غرض قرار پاتا ہے۔ لفظ 'سائنس' کی ابتدا لاطینی لفظ 'Scientia' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہے جاننا یا معلومات حاصل کرنا۔

سائنس کی مختلف تعریفیں بیان کی گئی ہیں مثلاً:

* سائنس منظم معلومات کا مجموعہ ہے۔
* سائنس منظم حس کے سوائے کچھ نہیں۔
* سائنس سچائی کا ڈھیر ہے۔

موجودہ دور سائنس اور ٹکنالوجی کا ہے۔ موجودہ تہذیب وتمدن ترقی کے جس اعلیٰ مقام اور عروج پر پہنچ گئی ہے، اس کا سہرا سائنس اور ٹکنالوجی کو بھی جاتا ہے۔ زندگی کا کوئی بھی ایسا شعبہ نہیں جسے سائنس اور ٹکنالوجی نے متاثر نہیں کیا ہو۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے دنیا میں بہت سی تبدیلیاں کر ڈالی ہیں۔

سائنس اور ٹکنالوجی نے ہماری طرز زندگی کو یکسر بدل ڈالا ہے اور انقلاب لے آیا ہے۔ ہمارے سوچنے کے طریقے، انداز فکر، رویہ اور نقطۂ نظر میں بہت تیزی سے تبدیلی آئی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کا اثر ہمارے اطراف بالکل عیاں ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے زندگی کے مختلف شعبوں کو اثر انداز کیا ہے۔ آج سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے پوری دنیا کو ایک عالمی گاؤں یعنی گلوبل ولیج میں تبدیل کر دیا ہے۔ دنیا بھر میں صحت، ذرائع نقل وحمل، بجلی، خلا، الیکٹرانک، ماحولیات، حیاتیاتی تنوع، بایوٹیکنالوجی، زراعت، توانائی، نیوکلیائی توانائی، اطلاعاتی ٹیکنالوجی، کمپیوٹر وغیرہ شعبوں پر اثر ڈالا ہے۔ اس لیے اب بغیر کسی تامل کے یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے ہماری زندگی کی وسعت کو دُگنا کر دیا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی عالمگیر ہے۔ اس لیے سائنس اور ٹکنالوجی کے عالمگیر اور آفاقی فائدے ہیں۔

صنعتی زراعت اور جوہری توانائی کی کھوج نے انسانی زندگی کو بہت زیادہ فائدہ پہنچایا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سائنس نے اگر دور جدید کی تخلیق کی ہے تو دور جدید کی ترقی کو بھی برقرار رکھا ہے۔ آج وہ دن بھی آ گیا ہے کہ انسان سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے چاند اور سیارہ کے اندر پہنچ چکا ہے، اور دیگر سیارہ پر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ آج انسانی ترقی کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہوگا، جس پر سائنس اور ٹکنالوجی کی انمٹ چھاپ نہ دکھائی دے۔ اس طرح سائنس اور ٹکنالوجی نے انسانی زندگی کے ہر ایک شعبے پر اثر ڈالا ہے۔ ان میں کچھ حسب ذیل درج ہیں:

جدید تہذیب پر سائنس اور ٹکنالوجی کے اثرات

سائنس اور سماج بڑی حد تک ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ہر شخص ہمارے سوچنے کے انداز اور معیار زندگی پر سائنس کے اثرات سے اچھی طرح واقف ہے۔

زندگی کے مختلف شعبوں میں مختلف قسم کی ترقی نے جیسے زراعت، میڈیسن، کاسمٹک، نقل وحمل، ترسیل وغیرہ نے ہماری زندگی کو مختلف طریقوں سے اثر انداز کیا ہے، جس سے ہمارے کردار میں تبدیلی آئی ہے۔ انسانی زندگی میں جدید تہذیب پر سائنس کی اہم خدمات یہ رہی ہیں ہے کہ اس نے ناخواندگی، جہالت، ناواقفیت، لاعلمی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں تعلیم نسواں کی طرف توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے ہارڈ ویئر، سافٹ ویئر، ڈاٹا پروگرامنگ، اوٹو موبائل، پارا میڈیکل، مچھلی پالن، نرسری، پھولوں کی کھیتی وغیرہ کی تعلیم کو ایجاد کیا، جس سے لوگوں کو سماج میں روزگار کے مواقع حاصل ہوئے ہیں۔

تعلیم پر سائنس اور ٹکنالوجی کے اثرات

تعلیم کے شعبے میں سائنس اور ٹکنالوجی نے بہت زیادہ اثر ڈالا ہے۔ مائکروسکوپ، ٹیلی اسکوپ، میجک لینٹرن، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی مدد سے مشکل سے مشکل موضوع یا مضمون کو آسان کرکے پڑھایا جاتا ہے۔ کمپیوٹر کی ایجاد نے درس وتدریس کو اور زیادہ موثر بنادیا ہے۔ انٹرنیٹ بھی ایک ایسا ہی سوپر ہائیوے ہے۔ ٹیلی کمیونی کیشن اور سیٹلائٹ ٹکنالوجی کی مدد سے یہ لاکھوں کمپیوٹروں کا ایک ایسا انفارمیشن سسٹم ہے، جس میں پوری کی پوری لائبریری (کتب خانہ) اور ریڈیو، ٹیلی ویژن چینل، اخبارات، رسالہ اور متعدد معلومات دستیاب ہیں، انٹرنیٹ کی مدد سے گھر سے بیٹھے بیٹھے دنیا کے بڑی بڑی کتب خانہ سے معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ آج تعلیمی سیٹلائٹ کے لانچ ہوجانے سے دور دراز کے ملکوں اور صوبوں میں تعلیم کی رسائی ہے۔ اس سے تعلیم حاصل کرنا اور بھی آسان ہوگیا ہے۔ آج انٹرنیٹ پر ای ٹیوشن کی مدد سے ایک ملک کے طلبا دوسرے ممالک کے استاذ سے تعلیم حاصل کرسکتے ہیں۔

سائنسدانوں نے تعلیم کے شعبہ میں تعلیمی ٹکنالوجی ایجاد کیا ہے۔ نئی ایجادوں، سائنسی طریقہ تدریس اور سمعی وبصری، مشینوں کا درس وتدریس میں استعمال موثر درس وتدریس کے لیے کیا جاتا ہے۔ تعلیمی ٹکنالوجی سے مطلب ہے کہ تعلیم کے لیے ضروری ذرائع ابلاغ، طریقہ تدریس اور تکنیکس کا استعمال کرنا جس سے درس پر اثر اور پر اعتماد ہوسکے۔ لیتھ کے مطابق ''اکتساب اور اکتسابی عمل میں سائنس کے استعمال کو جب درس و تدریس کو پر اعتماد بنانے کے لیے کیا جائے تو وہی تعلیمی ٹکنالوجی ہے۔'' میتھس کے مطابق ''تعلیمی ٹکنالوجی اس طریقہ کار کو کہا جاتا ہے جس میں درس و تدریس، تجربہ، منصوبہ بندی شامل ہو''۔ کلکرنی کے مطابق ''تعلیمی ٹکنالوجی کو ہم اس طرح واضح کرسکتے ہیں کہ یہ استعمال ہے قواعد کا، اس طرح جس طرح سائنس اور ٹکنالوجی، نئی نئی ایجادوں کا تعلیمی عمل میں''۔ تعلیمی ٹکنالوجی میں سمعی وبصری امدادیں، ایپڈواسکوپ، سلائیڈ پروجکٹر، فلم اسکرپٹ، پروجکٹار، او ایچ پی، ریڈیو، ٹیپ رکارڈر، ٹیلی ویژن، وی سی آر وغیرہ کے استعمال سے تدریس کو موثر بنایا گیا ہے۔

زراعت پر سائنس اور ٹکنالوجی کے اثرات

زراعت کے شعبہ میں جینیاتی انجینئرنگ، کیڑوں پر کنٹرول، پانی کا منظم استعمال، پیداواری تحقیق وغیرہ مختلف سائنسی طریقوں کے استعمال سے زراعت میں بے شمار اضافہ ہوا ہے۔ 'سبز انقلاب' صرف سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے وجہ سے ممکن ہوسکا۔ سائنس پر منحصر زراعت اور سبز انقلاب صرف اس لیے ممکن ہوا کیونکہ تکنیکی طور پر کھیتی کی گئی۔ جس کے لیے سائنس نے جو اوزار اور آلات ایجاد کیے، اس نے کسان کے کام کو جوتائی یا قلبہ رانی، بیج، بونا، فصل کٹائی وغیرہ کو آسان بنادیا ہے۔ کھاد یعنی فرٹیلائزر کے استعمال نے زراعتی زمین کو زرخیز بنادیا ہے اور فصل کی پیداوار میں بہت زیادہ اضافہ کردیا ہے۔ اس طرح سائنسی تکنیک کے استعمال نے مختلف زراعتی فصل کی پیداوار میں اضافہ کردیا ہے اور خطرناک قسم کے کیڑوں سے زراعت کو بچایا ہے۔ کیڑوں سے فصل کو بچانے کے لیے سائنسدانوں نے Pesticides اور Insecticides ایجاد کیا۔ اس طرح کے Insecticides کے چھرکاؤ سے کھیتوں میں فصل کی حفاظت ہوتی ہے اور پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ موجودہ وقت میں جینیاتی انجینئرنگ اور جوہری توانائی کا استعمال مختلف قسم کی صنعتی فصل کے بیج کو ایجاد کرنے میں کیا جارہا ہے۔

صحت پر سائنس اور ٹکنالوجی کے اثرات

صحت کے اعتبار سے سائنس کا ایک بہت ہی اہم عطیہ ہے۔ بہت ساری بیماریاں پہلے لا علاج تھیں، اگر علاج تھا بھی تو دیرپا اور پریشان کن۔ اس کے علاوہ بہت ساری بیماریاں موت کا پیغام بن کر آئی تھیں، مثلاً ٹی بی، دمہ، چیچک، تپ دق، لقوہ وغیرہ۔ مگر سائنس اور ٹکنالوجی کی بدولت اب وہ بیماریاں مکمل طور پر ٹھیک ہوجاتی ہیں۔ اس طرح اپنی زندگی سے مایوس انسان سائنس کو حیات کا فرشتہ سمجھنے لگا ہے اور آج تمام مخلوقات اس کی ممنون ہے۔ سائنس کی یہ لامحدود خدمات کبھی بھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔ 1796ء میں ایڈورڈ جینر نے چیچک کے علاج کے لیے ٹیکے کی کھوج کی تھی، جس کے چلتے 1979 تک اس بیماری کو پوری دنیا بھر میں جڑ سے مٹادیا گیا۔ 'Multi Drug Therapy' کے شروعات ہونے سے 'تپ دق' کے معاملوں میں کمی آئی ہے۔ پولیو کے ڈراپس نے ہزاروں بچوں کو معذور ہونے سے بچایا ہے۔ اسی طرح ہم نے کیموتھراپی، میموگرافی، ریڈیشن اور مرض کی جلد پہچان وغیرہ مختلف علاج کے طریقوں کے ذریعہ سے کینسر کے علاج میں بھی کامیابی ملی ہے۔ علاج کے ساتھ ساتھ سرجری میں بھی سائنس اور ٹکنالوجی نے کئی ایجادات کیے ہیں۔ Organ transplant کے شعبہ میں دل اور گردوں کے کئی کامیاب آپریشن ہوچکے ہیں۔ اب سائنسداں دماغ کے Transplant کے لیے بھی کوشش کررہے ہیں۔ یہاں تک کہ سائنسدانوں نے مصنوعی جسمانی اعضاء کا بھی ٹرانسپلانٹ کردیا ہے۔ جینیاتی انجینئرنگ نے حمل میں ہی بچہ کو بیماری سے تحفظ کی کوشش کو کامیاب بنایا ہے۔

صنعت پر سائنس اور ٹکنالوجی کے اثرات

جدید صنعت کاری پوری طرح سائنس کی ایجادات پر منحصر ہے۔ سائنسی ایجادات نے صنعت کاری کے عمل میں شدید تبدیلیاں کی ہیں۔ سائنسی ترقی نے بہت زیادہ مشکل کاموں کو مشینوں کی مدد سے آسان فہم بنادیا ہے۔ صنعتی طور پر ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ملکوں میں مختلف قسم کے کاموں کو مشینوں کی مدد سے استعمال کیا جاتا ہے اور انسانوں کو صرف اس مشین کو چلانے کے لیے رکھتے ہیں۔ مختلف قسم کے کاموں کو Automatic machine کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ جیسے Yarn production اور Weaving and giving a finish وغیرہ۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے بہت سے صنعتی علاقوں میں انقلاب لادیا ہے۔ اس میں بڑے صنعتی علاقے جیسے پرنٹنگ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن، دوا، زراعت، زیورات، کپڑوں کی صنعت وغیرہ شامل ہیں۔

موجودہ دور مشینوں اور کارخانوں کا دور ہے۔ اس صنعتی دور میں کامیابی اور ترقی مختلف قسم کے تربیت یافتہ اور تجربہ کار لوگوں پر منحصر ہے۔ یہ لوگ اعلیٰ انجینئر اور دیگر جانکار اور مزدور ہوتے ہیں۔

نقل وحمل پر سائنس اور ٹکنالوجی کے اثرات

ایک زمانہ تھا کہ انسان کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانے میں بہت ساری مصیبتوں اور خطروں سے دوچار ہونا پڑتا تھا اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لالے پر جاتے تھے۔ لیکن آج کافی دوری کا فاصلہ انسان سائنس اور ٹکنالوجی کی ایجاد کردہ بس، موٹر، ریل اور ہوائی جہاز جیسی سواری سے کچھ دیر میں طے کرلیتا ہے۔ ہوائی جہاز کی وجہ سے بھی ملک ایک دوسرے کے نزدیک آگئے ہیں۔ ہندوستان سے یوروپ اور امریکہ جانے میں جہاں دو یا تین مہینے لگتے تھے، وہاں اب ہوائی جہاز سے چند گھنٹوں میں پہنچا جاسکتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سائنس

اور ٹکنالوجی کی وجہ سے بار برداری ونقل وحمل میں بھی غیر معمولی انقلاب آیا ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے انسان کار یا اسکوٹر جیسے اپنی نجی گاڑی، سرکاری بس، میٹرو ریل وغیرہ کا استعمال کرتا ہے۔ موجودہ زمانے میں 'میٹرو ریل' ٹکنالوجی کی ایک بہت ہی اہم دین ہے۔

ذرائع ابلاغ، مواصلات یا ترسیل پر سائنس اور ٹکنالوجی کے اثرات

موجودہ زمانہ 'ترسیلی انقلاب' کا زمانہ ہے۔ موجودہ دور میں انسان وائرلیس، ٹیلی فون اور موبائل کے ذریعہ آسانی سے دور دراز کے لوگوں سے گفتگو کر لیتا ہے۔ ریڈیو، ٹی وی، ایسی ایجادیں ہیں جو ہماری زندگی کے لیے ضروری بن گئی ہیں۔ ریڈیو ثقافت اور بین الاقوامی تعلقات کو استوار کرنے میں مرکزی رول ادا کرتا ہے۔ معاشی اور سیاسی میدان میں مدد پہنچاتا ہے۔ عملی معلومات اور دینی خدمات میں نمایاں حصہ لیتا ہے اور اس طرح گفتگو کرتا ہے جیسے دونوں ایک ہی کمرہ میں بیٹھے محو گفتگو ہوں۔ ریڈیو سائنس کی ایجاد ہے جس کا موجد مارکونی ہے۔ اس کے ذریعے دوسرے ملکوں کی خبر اور آنکھوں دیکھا حال سنا جاتا ہے۔ ریڈیو میں برقی آلات ہیں لیکن اس کی کرشمہ سازی کا عالم یہ ہے کہ آپ گھر میں بیٹھے ہوئے تمام ممالک کی خبریں سن لیتے ہیں۔

ٹیلی ویژن سائنس کی ایک تعجب خیز ایجاد ہے۔ یہ دل بہلانے اور علم میں اضافہ کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اس کی ایجاد جان بیرڈ نے 1926 میں کی تھی ٹیلی ویژن کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ہم اندرون ملک اور غیر ممالک کے پروگراموں کو گھر بیٹھے ٹیلی ویژن کی اسکرین پر دیکھ لیتے ہیں۔ مختلف سماجی، سیاسی، علمی اور ثقافتی پروگراموں کو دیکھ کر ہم اس سے بہت کچھ حاصل کرتے ہیں اور ہمارا علم کا ذخیرہ بڑھتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے پروگرام دکھائے جاتے ہیں جن سے ہم لطف اندوز ہوکر ذہنی سکون محسوس کرتے ہیں۔ اس سے ذہنی تناؤ دور ہوتا ہے۔ کمپیوٹر کی ایجاد نے ترسیلی میدان میں بہت انقلاب لا دیا ہے۔ خصوصاً انٹرنیٹ کے ذریعے انسان بہت کم وقفہ میں اپنی خبر کو دوسری جگہ بھیج سکتا ہے۔ 'اسپیڈ پوسٹ' کے ذریعہ دور دراز کے شہروں میں 'منی آرڈر' وغیرہ بہت کم وقت میں بھیج سکتا ہے۔ 'موبائل' کی ایجاد نے ترسیلی میدان میں زبردست انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب لوگ خط کے ذریعہ اپنے احباب سے ترسیل کرتے تھے۔ اب خط کی جگہ لوگ

> **ٹیلی ویژن سائنس کی ایک تعجب خیز ایجاد ہے۔ یہ دل بہلانے اور علم میں اضافہ کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اس کی ایجاد جان بینرڈ نے 1926 میں کی تھی ٹیلی ویژن کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ہم اندرون ملک اور غیر ممالک کے پروگراموں کو گھر بیٹھے ٹیلی ویژن کی اسکرین پر دیکھ لیتے ہیں۔ مختلف سماجی، سیاسی، علمی اور ثقافتی پروگراموں کو دیکھ کر ہم اس سے بہت کچھ حاصل کرتے ہیں اور ہمارا علم کا ذخیرہ بڑھتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے پروگرام دکھائے جاتے ہیں جن سے ہم لطف اندوز ہوکر ذہنی سکون محسوس کرتے ہیں۔**

موبائل کا استعمال کرتے ہیں۔ موبائل ایک ایسا مواصلاتی ٹکنالوجیکل ڈیوائس ہے جسے انسان آسانی سے اپنے جیب میں ہمیشہ رکھتا ہے اور کہیں بھی، کسی وقت اپنے رشتہ داروں، دوست اور احباب و اقارب سے گفتگو کر لیتا ہے۔ اس طرح سائنس اور ٹکنالوجی نے مواصلاتی اور ترسیلی شعبہ میں بہت زیادہ اثر ڈالا ہے۔

انفارمیشن ٹکنالوجی کے اثرات

سائنس کی وہ شاخ جس کا رشتہ اطلاع، خبر، معلومات اور حقائق کو پیدا کرنے، جمع کرنے اور ترسیل یا مراسلہ سے ہوتا ہے، انفارمیشن ٹکنالوجی کہلاتی ہے۔ موجودہ زمانہ اطلاع، خبر، معلومات اور حقائق کے انقلاب کا زمانہ ہے۔ انٹرنیٹ، ای میل، فائبر آپٹکس، ریڈیو، پیجنگ، سیلولر فون، ویڈیو کانفرنسنگ، الیکٹرونکس وغیرہ جیسی انفارمیشن ٹکنالوجی کی سہولتوں نے دنیا کو بہت چھوٹا بنا دیا ہے۔ آج ٹیلی کمیونکیشن، فائنانس، معاشیاتی، زراعتی، بینکنگ، انسانی ترقی، دفاع اور گاؤں کی ترقی میں مسلسل انفارمیشن ٹکنالوجی کا استعمال ہو رہا ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی وہ تکنیک ہے جس میں کوئی بھی مضمون، موضوع، جانکاری جو دنیا میں کہیں بھی دستیاب ہے، کسی بھی وقت کسی بھی انسان کے ذریعہ دستیاب کرائی جاتی ہے۔ کمپیوٹر ہارڈ ویئر، سافٹ ویئر اور انٹرنیٹ، انفارمیشن ٹکنالوجی کی بنیاد ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی نے روزہ مرہ کی کارکردگی، ریلوے اور طیارہ ریزرویشن، بینکنگ، Insurance، ٹیلی فون، موسم کی جانکاری، ریڈیو، اسٹرانومی، نیوکلیائی، علاج اور صحت زراعت، تعلیم وغیرہ شعبوں میں انقلابی تبدیلی کا آغاز کر یہ یقین دلایا ہے کہ اکیسویں صدی میں انفارمیشن ٹکنالوجی کا دبدبہ رہے گا۔ انفارمیشن ٹکنالوجی نے آج پوری دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ آج موبائل فون کو ایک Music System، ایک کمپیوٹر، ایک ٹیلی ویژن اور یہاں تک کہ ایک کریڈیٹ کے شکل میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ لوگ اس کا غلط استعمال کرتے ہیں اور سبھی ٹکنالوجی ایجادوں پر ایک امٹ داغ لگا دیتے ہیں۔ آج ATM-Debit Card سے کسی بھی وقت اے، ٹی ایم سے اپنا پیسہ نکال سکتے ہیں۔ ٹچ اسکرین کے ذریعے سے پلیٹ فارم ٹکٹ حاصل کر سکتے ہیں۔ انفارمیشن ٹکنالوجی ایک مکمل ٹکنالوجی ہے، جس میں کمپیوٹر اور ٹیلی کمیونی کیشن ٹکنالوجی دونوں ہی طرح کی ٹکنالوجی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر انفارمیشن کا ترسیل کرتی ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کی ترقی سے دنیا سمٹ رہی ہے، جس کے چلتے ریسرچ کے مواقع کھل گئے ہیں۔ Satellite کے ذریعہ سے سمندری طوفان کی آگاہی مل جاتی ہے، Inset Sattellite کا استعمال ڈاٹا ریلے، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگراموں کے نشر کے لیے کی جا رہی ہے۔

بایوٹکنالوجی کے اثرات

زندگی کے پوشیدہ رازوں کو کھولنے میں سائنس کی کافی مدد رہی ہے۔ آج انسان کا 'Genetic Code' معلوم ہو چکا ہے۔ سائنس نے 'Genes' کی 'Alphabet' دریافت کر لی ہے، جس سے نہ صرف Genetical Disease پر قابو پانا، بلکہ قدرت کی لکھی بھاشا کو پڑھ کر اس میں تبدیلی تک کرنا ممکن ہو چکا ہے۔ اہم بایوٹکنالوجی:

Biofertilizer, Genetic Engineering, Tissue Culture, Biogas, Tube Baby, Embryo Transplantation وغیرہ کے استعمال سے سماج میں انقلابی تبدیلیاں نمایاں طور پر اثر انداز ہیں۔ بایوٹکنالوجی کی پیداوار: خمیر (Yeast)، Enzymes، Antibiotic Drugs، Amino Acids، Alcohal، Citric Acid اور Lactic Acid وغیرہ کی ترقی سے روزگار میں اضافہ اور شب وروز کے عمل اور سرگرمی کے لیے ان پیداوار میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ 'Referigration' کے جدید طریقوں کے سہارے دودھ اور ڈیری کی پیداوار کو لمبے وقفہ تک محفوظ رکھا جاتا ہے۔

فضائے بسیط یا خلائی ٹکنالوجی

خلائی ٹکنالوجی اور سیٹلائٹ تکنیکوں نے بہتر ترسیلی

روابط، دور نمائی، نشریہ، تعلیم اور صحت، Disaster Management، موسم کی پیشن گوئی (Weather Forecasting)، Environment Protection، Drinking Water Resources پینے کے پانی کے وسائل کی کھوج اور قدرتی وسائل کے بہتر مینجمنٹ نے ہماری زندگی کو تبدیل کر دیا ہے۔ آج دنیا کے تمام ممالک خلائی ٹکنالوجی کے اثرات اور فائدے سے واقف ہیں اور اس لیے سبھی خلائی ٹکنالوجی کو بڑھانے میں کوشاں ہیں۔ چاند اور سیارہ پر پہنچنے کے بعد آج انسان دیگر سیارہ پر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ سیاروں پر زندگی کی تلاش کی کوشش جاری ہے۔ ان سیٹ سریز کے Satellite بہت زیادہ تعداد میں Launch ہو چکے ہیں۔ جس کی مدد سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن نشریات وغیرہ کا کام ہو رہا ہے۔ تعلیمی سیٹلائٹ کے لانچ ہونے کے بعد تعلیم کے شعبہ میں بھی انقلاب آنے کی امید ہے۔

سماج پر کمپیوٹر کے اثرات

پچھلی صدی میں سائنس اور ٹکنالوجی کی جو سب سے حیرت انگیز ایجاد رہی ہے وہ ہے کمپیوٹر۔ سچ مچ کمپیوٹر نے تو زندگی ہی آسان کر دی اور کمپیوٹر کے ذریعہ حاصل ہونے والی 'انٹرنیٹ' تو پوری دنیا کو ایک 'Global Village' کی شکل دے دیا ہے۔ کمپیوٹر کی ایجاد نے ہمارے پورے طریقہ کار کو بدل دیا ہے۔ آج زندگی کے ہر شعبہ میں کمپیوٹر کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ بینک، سرکاری دفتر، اسپتال، تعلیم، پریس وغیرہ ہر شعبہ میں صحیح اور معتبر شماریات اور اصلیت کے لیے کمپیوٹر کا استعمال ہو رہا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کی شکل میں آج، کمپیوٹر نے ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ ترسیلی میدان میں الیکٹرانک کی ترقی کے نتیجہ میں ٹیلی فون، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ نے حیرت انگیز کام کیا ہے۔ امیر سے لے کر غریب تک سبھی اس کی سہولت سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ سوپر کمپیوٹر کے ذریعہ جہاں مشکل کام لیے جا رہے ہیں وہیں دوری اور وقت پر مکمل عبور حاصل ہے۔ دنیا کے ایک کونے میں بیٹھا آدمی آسانی سے دوسرے کونے کی خبر حاصل کر سکتا ہے۔ یہ ساری سہولتیں سائنس اور ٹکنالوجی کے بغیر ناممکن تھیں۔

سماج پر سائنس اور ٹکنالوجی کے منفی اثرات

سائنس کی جڑیں ہماری روز مرہ کی زندگی میں بہت گہرائی تک داخل ہوگئی ہیں۔ ہم سائنس کے دور میں زندہ ہیں اور ہماری ساری سرگرمیوں پر سائنس کا کنٹرول ہے۔ ہمارے چاروں طرف ہر رشتے بالراست یا بالواسطہ سائنس سے متعلق ہیں۔ اس نے سوسائٹی کے پورے نقشہ کو بدل دیا ہے اور ہمارے سماجی اور طبعی ماحول کو متاثر کیا ہے۔ اس طرح سائنس کی ترقی نے ہمیں جہاں فائدے پہنچائے ہیں وہیں نقصانات بھی لاحق ہیں۔ سائنس کے یہ کارنامے اگر عوام کی بھلائی میں ایک طرف معاون ہیں تو دوسری جانب نقصانات بھی کم نہیں پہنچا رہے ہیں، جن کا اعتراف سنجیدہ سائنس داں طبقہ بھی کرتا ہے۔ جو کام پہلے کافی محنت طلب تھا، اب مشینوں کے ذریعہ جلد انجام پاتا ہے۔ اس سے انسان میں کاہلی اور سستی پروان چڑھ رہی ہے۔ اسی طرح سائنسی ایجادات و انکشافات سے جہاں بے شمار فائدے ہیں وہیں چند نقصانات بھی ہیں۔ زیادہ مہلک آلات حرب سے جنگیں زیادہ خطرناک ہوگئی ہیں۔ انسانی زندگی ارزاں ہوگئی ہے اور منٹوں میں دنیا کے صفایا کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

سب سے زیادہ نقصان مذہب، اخلاق اور تہذیب وتمدن کو پہنچایا ہے۔ اس کی ایجاد کردہ چیزوں کے استعمال سے عوام کی اخلاقی حالت کافی بگڑ گئی ہے۔ آج انسان سائنس کی بدولت بے رحم، بے وفا، کاہل اور رفتہ رفتہ سماج سے علیحدہ ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ گھر بیٹھے انسانی ضرورتوں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ جہاں ٹیلی ویژن کے بہت سارے فوائد ہیں وہیں اس کے کچھ نقصانات بھی ہیں۔ آج ٹیلی ویژن کے اتنے سارے چینل کھل گئے ہیں کہ دن بھر اور رات بھر کچھ نہ کچھ پروگرام چلتے رہتے ہیں۔ کہیں کہیں گندے پروگرام بھی دکھائے جاتے ہیں۔ آج فلموں اور فلمی گانوں کا بڑا زور ہے، جس کا اثر آج کل بچوں پر پڑ رہا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج ٹیلی ویژن اور سنیما علم کا ذریعہ کم اور خرافات کا ذریعہ زیادہ ہو گیا ہے۔ اس لیے جہاں سائنس سے بے شمار فائدے ہیں وہیں اس کے نقصانات کو بھی شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے۔ سائنس پر پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ، مشینی اور سائنسی ترقی نے روحانیت اور اخلاق کو غیر معمولی نقصان پہنچایا ہے۔ زندگی پیچیدہ اور دشوار گذار ہوگئی ہے کہ ہم حد درجہ خود غرض اور بد اخلاق ہوتے جا رہے ہیں۔ سائنس پر دوسرا بڑا اعتراض یہ ہے کہ سائنس نے بہت ساری ایسی چیزیں ایجاد کی ہیں جس کا غلط استعمال دنیا کی تباہ کاری کا سبب بن سکتی ہے۔ سائنس کا سب سے زیادہ غلط استعمال جنگ کے میدان میں کیا گیا ہے۔

اسی طرح بڑی بڑی فیکٹری سے زہریلی گیس کا رساؤ بھی بہت بڑی تباہ کاری کا باعث بنتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تباہ کاریوں کے پیچھے سائنسی کرشموں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ مختلف ممالک مسلسل اپنے نیوکلیائی ہتھیاروں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ نتیجتاً کچھ سوپر پاور کے پاس اتنے زیادہ نیوکلیائی ہتھیار ہیں کہ وہ پلک جھپکتے ہی پوری دنیا کو ختم کر سکتے ہیں۔ کمپیوٹر کی ایجاد تیزی سے کام کرنے، خبر کو جمع کرنے اور دنیا کے لوگوں کو ایک ساتھ باندھنے کے لیے کیا گیا تھا، لیکن اگر آج اس کا استعمال Cyber Sex، Cyber Pornography اور Cyber Terrorism کے لیے کیا جانے لگا ہے، تو کیا اس کے لیے آپ کمپیوٹر کو انٹرنیٹ کو یا پھر انفارمیشن ٹکنالوجی کو قصوروار مانیں گے؟ لیکن ایسی تمام باتیں جن کو ہم سائنس اور ٹکنالوجی کے نقصانات کے طور پر گنواتے ہیں، دراصل سائنس کے نہیں اس کے استعمال کرنے والوں کی خرابیوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ''ایٹم بم'' کو تعمیری کاموں کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بد خلق انسان نے اس کے غلط استعمال سے انسانیت کو نقصان پہنچایا ہے۔ ایسی صورت میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس اور ٹکنالوجی نے انسان کو فائدہ پہنچایا ہے، اس سے اگر کوئی نقصان پہنچا ہے تو اس کی ذمہ داری سائنسی ترقی پر ڈالنے کے بجائے ان لوگوں کو قبول کرنی ہوگی جنھوں نے اس کا غلط استعمال کیا ہے۔

■

سائنس کی جڑیں ہماری روز مرہ کی زندگی میں بہت گہرائی تک داخل ہوگئی ہیں۔ ہم سائنس کے دور میں زندہ ہیں اور ہماری ساری سرگرمیوں پر سائنس کا کنٹرول ہے۔ ہمارے چاروں طرف ہر رشتے بالراست یا بالواسطہ سائنس سے متعلق ہیں۔ اس نے سوسائٹی کے پورے نقشہ کو بدل دیا ہے اور ہمارے سماجی اور طبعی ماحول کو متاثر کیا ہے۔ اس طرح سائنس کی ترقی نے ہمیں جہاں فائدے پہنچائے ہیں وہیں نقصانات بھی لاحق ہیں۔

Dr. Md. Afroz Alam
Assistant Professor
Dept. of Education & Training
Maulana Azad National Urdu University
GAchibowli, Hyderabad - 500032 (Telangana)

هم نے جنہیں بھلا دیا

الماس فاطمہ

ایک گمنام شاعر
باذل عباسی

نغموں کی جستجو میں ترے حرف حرف کو
اظہار اعتبار کا پیکر بھی چاہیے
باذل نشاطِ روح کا سامان کچھ تو ہو
تجھ کو خیال عرصۂ محشر بھی چاہیے

اردو شاعری کی دنیا میں باذل عباسی کا نام ایک پروقار اور مہذب شخصیت کا ہے، جس کو بہت کم لوگوں نے جانا۔ جس نے ان کو جانا اس نے ان کی شاعری اور ان کی قلمکاری دونوں کو مانا۔ باذل عباسی نے اپنی شاعری میں عشقیہ رنگ بھرنے کے بجائے دنیا کے درد کو سمویا ہے۔ انھوں نے شاعری میں اپنے عہد کے تمام سیاسی، مذہبی ثقافتی اور شعری تقاضوں کو برتا ہے۔ ان کی شاعری میں سوز و گداز اور لفظوں کو برتنے کا سلیقہ بہت عمدہ ہے جس کے مطالعے سے قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ اس کی دلی کیفیت ہے یا شاعر کی۔ باذل عباسی نے بہت سی نظموں، غزلوں اور شخصی مرثیوں کی تخلیق کی ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں ہندوستان کے چھوٹے بڑے اخباروں میں چھپتی رہی ہیں۔

باذل عباسی کا سلسلۂ نسب فیض اللہ پور (اعظم گڑھ) کے ایک ایسے علمی خاندان سے ملتا ہے، جس کی جڑیں بادشاہ اکبر کے دور میں شیخ مبارک اور پھر ان کی اولاد فیضی اور ابوالفضل سے جا ملتی ہیں۔ جہاں کے لوگ حکمت کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے گھر کا ماحول ادبی تھا اور اسی ماحول نے باذل کو بچپن سے غزل اور نظم لکھنے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے آٹھویں جماعت میں اپنی پہلی غزل لکھی جس کی خوب پزیرائی ہوئی اور اسی پزیرائی نے ان کو اور غزل اور بعد میں نظم لکھنے پر مجبور کیا۔ شبلی نیشنل ہائی اسکول سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے اعظم گڑھ کو خیر باد کہہ دیا اور حیدرآباد چلے آئے۔ جہاں کے ماحول اور تہذیب میں ان کو جدیدیت کا اثر ملا۔ اس اثر نے ان کی فکر کو وسعت بخشی:

تنظیم دہر و نظم جہاں دیکھتے چلیں
ذہنوں کی روشنی کے نشاں دیکھتے چلیں
باذل غزل سرا ہے کہیں ذوقِ گفتگو
حسنِ زبان و طرزِ بیاں دیکھتے چلیں

باذل عباسی نے اپنی شاعری میں دنیا کی بے ثباتی اور غم کا اظہار کیا ہے۔ شاعری میں انھوں نے اپنے دل کے درد کو بڑے پراثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اردو میں بہت کم ایسے شعرا گزرے ہیں جن کی زندگی اور شاعری میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہ خوبی میر کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے اور باذل عباسی کے کلام میں بھی۔ باذل عباسی کو والد کی موت کے بعد سے آلام و مصیبت کا شکار ہونا پڑا۔ ان حالات نے ان کے حساس اور خوددار دل پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ ان کے دل سے بے ساختہ یہ شعر نکل پڑے:

شکستگی کی فضا راس آگئی باذل
میں اپنے ٹوٹے ہوئے جسم میں ہی بہتر ہوں

باذل جس دور میں حیدرآباد آئے اس عہد میں وہاں شاعری میں ایک نئی نسل کا آغاز ہو چکا تھا اور اس نسل کی ہم نوائی کا شرف باذل کو بھی ملا اور ان کے اساتذہ نے بھی ان کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ نظام کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ اسی دوران وہ کچھ خانگی اداروں میں درس و تدریس سے بھی جڑے۔ تعلیمی اخراجات کی تکمیل کی غرض سے تدریس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اشتہاری اداروں سے رابطہ قائم کیا، اور اپنے کلام پر بھی طبع آزمائی کرتے رہے۔ 1976 میں والدہ کے اصرار پر ان کو اپنے وطن فیض اللہ پور واپس لوٹنا پڑا۔ یہاں آکر ان کو اپنے تعلیمی اثاثہ کے تلف ہو جانے کا احساس تو تھا لیکن انھوں نے ماں کی خواہش کا احترام کیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد ماں کی ہی رضامندی سے انھوں نے دہلی کا رخ کیا۔

دہلی میں ان کو سرکاری، غیر سرکاری، نیم سرکاری اور خانگی بہت سے اداروں میں کام کرنے کے مواقع فراہم ہوئے لیکن چونکہ ادبی کام اور شاعری ان کی روح پر مسلط تھی لہٰذا انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو میں بحیثیت طالب علم داخلہ لے لیا۔ بعد میں ایک اخبار 'ان دنوں' سے وابستہ ہوگئے اور اس کے تحت سیاسی تحریروں میں بھی خوب رنگ جمایا اور صحافتی زندگی کے تجربات سے بھی روشناس ہوئے۔ دہلی میں اپنے کام کے متعلق باذل عباسی خود لکھتے ہیں:

"یہاں میں 1979 سے 1986 تک رہا لیکن اس دوران اپنے موضوع پر کم کام کیا لیکن شعبے کا 'وضاحتی کتابیات' کا کام چونکہ مستقل طور پر میرے ذمے تھا اس لیے 1979 سے 1985 تک کی چھ جلدوں کا کام میں نے مکمل کیا۔ اس کا آخری حصہ اردو اکادمی دہلی کے تحت اشاعت پزیر ہے۔ 1979 سے 1982 تک کا ترقی اردو بیورو کے تحت شائع ہوا۔

باذل عباسی نے اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز بنارس (یو پی) سے کیا اور شعری ذوق کے سلسلے کو بھی آگے بڑھایا۔ بنارس میں یہ 'آبھاس' کے تحت تحقیق، تدریسی اور تدوین و تصنیف کے کاموں میں بحیثیت ڈائریکٹر مصروف رہے اور ساتھ ہی شعروشاعری کا شغل بھی فرماتے رہے۔

باذل کی غزلوں میں افکار و محسوسات کی تازگی کے علاوہ پاکیزگی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ زبان و بیان میں سادگی نظر آتی ہے، اور ساتھ ہی ان کے کلام میں الفاظ کی موزونیت اور دل آویزی بھی نظر آتی ہے۔ باذل کے منفرد طرز احساس اور اسلوب کے اظہار سے پوری غزل سیراب ہوتی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنی ذہانت اور روشن طبعی کا ثبوت دیتے ہوئے مختلف دور کی ادبی صورت حال کو مدّ نظر رکھ کر ایک متوازن طریقہ اپنایا ہے:

ہزاروں قمقمے روشن ہیں سب راہیں منور ہیں
اندھیرا پھر بھی غالب ہے مسافر کے مقدر کا

———

الزام اپنے جذبوں پہ بھی ہے مجھے قبول
کرتا ہوں چاک دامن احساس بھی رفو

یہ ان کی فکر کی بلندی ہی ہے کہ ان کے اشعار زمانے اور حالات کے مطابق ڈھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ باذل نے خلیل الرحمٰن اعظمی، خان شیم اور وحید اختر کے نام بھی غزلیں لکھیں ہیں۔ جو ان کو بے حد عزیز تھے اور ان کے بے حد قریب تر تھے۔ ان غزلوں میں اپنے عزیز دوست کے بچھڑ جانے کے غم کا اظہار بڑے پر اثر انداز میں کرتے ہیں۔ شاعر اپنے ہمدرد دوست کے بچھڑ جانے پر افسوس ظاہر کرتا ہے۔ وحید اختر کے جانے کے غم نے شاعر کو بہت مایوس سا کر دیا۔ وہ وحید اختر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

سو گیا آخر شب نغمہ زن جشن بہار
بات اب اس کی گئی حرف و نوا سے آگے
تھی سر ریگ تپاں موج تبسم باذل
سائل آب تھا دریا کی فضا سے آگے

باذل عباسی کی ایک خصوصیت ان کی غیرت اور خودداری بھی ہے۔ عام طور سے وہ امرا اور روسا سے میل جول کو پسند نہیں کرتے تھے کہ اس سے ان کی خودداری کو ٹھیس نہ لگے۔ وہ بے حد کم گو اور آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ اگرچہ باذل عباسی کے کلام میں غم کی حکمرانی ہے لیکن یہ غم نہ تو روایتی ہے اور نہ تخیل کی پیداوار، بلکہ یہ غم داخلی اور خارجی زندگی کا حقیقی عطیہ ہے۔ باذل غم میں ڈوب کر بھی ابھرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور اس کا مردانہ وار مقابلہ بھی کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے غم میں ایک سنبھلتی ہوئی کیفیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ باذل کا غم انفرادی ہی نہیں بلکہ آفاقی بھی ہے اور اسی سے انسان کی عظیم جدوجہد کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ یہ غم ہی ہے جو باذل کی شاعری میں حسن، موسیقیت، معصومانہ تخیل اور روانی و تاثر پیدا کرتا ہے۔ مثال کے طور پہ یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

بھولے تھے جن کو دیکھ کے ہم زندگی کے غم
وہ ہم کو دیکھ کر نہ کبھی شادماں ہوئے

———

حصار ذات میں بالیدہ اضطراب سا ہے
دعا کرو کہ کوئی صاحب دعا آئے

———

مرے وجود کی صیقل ہے سارے شیشوں پر
یہ عکس میرا ہے، یہ آئینہ بھی میرا ہے

———

چھائی جو ذہن و دل پہ غم زندگی کی دھند
سگرٹ جلائی، شعر کہے، شادماں ہوئے

———

نشاط ہجر کی لذت سے آشنا تو ہوئے
بھلا لگے ہے تیرے انتظار میں رہنا

———

چشم ہنر سے خون ٹپکتا دکھائی دے
نغموں کا شہر درد کا سہرا دکھائی دے
ہر لمحہ ایک تازہ ہوس کا شکار ہوں
یہ بھی فسون چشم تمنا دکھائی دے

باذل عباسی ایک وسیع ذہن اور بلند فکر شاعر تھے۔ ان کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ سادگی اور خیالات میں روانی ملتی ہے جو رنگینی و سرمستی پیدا کرتی ہے۔ باذل کا کلام دل پہ ایسا اثر کرتا ہے کہ ہر دور کی ذہنی پرواز اور حدود فکر میں پناہ پاتا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جو تجربات حاصل کیے تھے خواہ وہ ذاتی زندگی کے ہوں یا زمانے کی ابتری، سماجی مسائل ہوں، سیاسی ہوں یا حالات کی افراتفری کے، اپنی شاعری میں انھوں نے اس کی حقیقی تصویر پیش کی ہے:

کھلی فضا تھی ہواؤں میں پیار تھا کتنا
تمہارے شہر میں پھر بھی غبار تھا کتنا
تمام چہروں پہ خوابوں کی دھوپ پھیلی تھی
حقیقتوں میں مگر انتشار تھا کتنا

باذل عباسی نے یوں تو غزل، نظم، مرثیہ اور سلام و نوحہ جیسی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے، مگر غزل گوئی سے ان کو زیادہ شغف تھا۔ ان کے کلام میں ایمائی کیفیتیں پائی جاتی ہیں، جس کی جھلک ان کی غزلوں میں صاف طور سے نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں غزل میں جذبے کی شدت زیادہ ہوتی ہے اور اظہار بیان کی قوت بھی۔ یہ جذبہ باذل کی شاعری میں نمایاں ہے۔ ان کا لب و لہجہ عام انسانی جذبوں کو متاثر کرنے والا ہے۔ ان کی غزلوں میں گہرائی، جذبات و احساس کی شدت کے ساتھ ساتھ وسعت بھی نظر آتی ہے۔ غزلوں کے مطالعے سے ان کی دلی کیفیات کا پتہ لگتا ہے۔ انھوں نے اپنے معاشرے کے درد و غم کو نہ صرف سمجھا بلکہ اس کو محسوس کیا ہے۔ اور پھر لفظوں کی مدد سے اس کو قاری کے دل تک پہنچایا ہے۔ ان کی یہ غزل ملاحظہ فرمائیے:

الفاظ کے صحرا میں بڑا شور بپا تھا
میں فکر کے خاموش سمندر میں کھڑا تھا
تخلیق کے ہر کرب سے میں پوچھ رہا تھا
کس رات میرے دل میں یہ طوفان بپا تھا
جس شہر کا آوازوں کے صحرا میں ہے چرچا
برسوں میں اسی شہر میں آوارہ پھرا تھا
تاریخ کی مانند پلٹ آیا ہوں ورنہ
میں وقت کے ہمراہ بہت دور گیا تھا

باذل عباسی نے زمانے میں اتنے زخم کھائے ہیں کہ ان کو زخم غم سہنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اور اگر یہ عادت نہ ہوتی تو زمانے کی بھیانک آندھی کے سامنے ان کی شخصیت اور شاعری کا چراغ گل ہو جاتا۔ یہی سبب ہے کہ باذل کی شاعری ان کی زندگی کی ترجمانی کرتی ہے۔ باذل کی تنہائی پسندی اور خلوت نشینی ان کو اپنے عہد اور ماحول کی ترجمانی سے باز نہ رکھ سکی۔ اس عہد کے ذہنی انتشار، سکون کی تلاش اور معاش کی قلت کی جیتی جاگتی تصویریں ہمیں ان کے کلام میں ملتی ہیں۔ مثلاً سانحہ، خوابوں کے جزیرے سے، تشنگی ہی تشنگی، شب زاد اور طنابیں خیموں کی ٹوٹی ہیں ایسی ہی نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی نظموں میں حب الوطنی کا جذبہ بھی نظر آتا ہے۔ وہ اپنے ملک اور اپنے وطن سے بہت محبت کرتے تھے۔ انھوں نے ایک نظم اپنے آبائی وطن اعظم گڑھ کے لیے بھی لکھی ہے۔ جس میں وہ اپنے وطن اعظم گڑھ کو سلام کرتے نظر آتے ہیں۔ اس نظم کا عنوان انھوں نے 'سلام ارض وطن' رکھا ہے۔ یہ ایک آزاد نظم ہے جس کے آغاز میں شاعر اپنے وطن کی فضا، اپنا بچپن اور اپنی محبت کو یاد کرتا نظر آتا ہے اور بعد میں وطن کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تجھ سے میں نے نہ جانے کتنی آرزوئیں کر رکھی تھیں مگر افسوس مجھے تیرے دامن سے کچھ نہ مل سکا، اور اگر کچھ ملا ہے تو وہ ہے فریب اور دھوکا۔ اس کے باوجود شاعر مایوس نہیں ہوتا اور امید کے

چراغ جلائے ہوئے یہ کہتا نظر آتا ہے کہ اے میرے پیارے وطن میں ایک بار پھر اس سرزمیں پر لوٹوں اور تیری زمیں کو گلزار بنا دوں گا۔ نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

میرے وطن میرے اجداد کے فکر و فن کے دیار
تیری فضا سے پھر اک بار جا رہا ہوں میں
شگفتہ یادوں کی مغموم دھڑکنیں لے کر
تیری فضا سے بہت دور دشت غربت میں
جہاں نہ دوست ہے نہ کوئی غم گسار اپنا
نہ کوئی درد سے واقف نہ کوئی درد شناس
ہر اک قدم پہ مصائب کا ہے جہاں انبار
میرے لیے ہے سحر بھی جہاں غموں کا پیام

نظم کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ اپنے وطن سے وعدہ کرتے ہیں کہ:

ہر ایک جادے کو اک کہکشاں بناؤں گا
تیری زمیں پہ بچھا دوں گا انجم و مہتاب
کہ جس پہ رقص کرے گی مسرتوں کی بہار
بدل ہی ڈالوں گا تیری فلاکتوں کا نظام
سلام ارض وطن تیری ہر روش کو سلام

اس کے علاوہ انھوں نے ایک نظم اپنی ماں کے لیے بھی لکھی ہے جس میں وہ ماں کی خدمت و محنت اور رفعتوں کا ذکر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ نظم انھوں نے یکم اگست 1978 کو جے این یو میں لکھی تھی۔ ایک ماں کی عظمت اور اس کے رتبہ کو لوگوں کے سامنے پیش کرتی ہوئی یہ نظم بتاتی ہے کہ کس طرح ماں اپنے بچوں کی، راتوں کو جاگ کر بھی، خدمت کرتی ہے۔ اور وہ دن رات اپنے بچوں کی رفعت کی دعائیں بھی کیا کرتی ہے۔ شاعر نے اس میں نظام کائنات میں انسان کا مقام اور اس کی عظمت کو بیان کیا ہے۔ باذل عباسی اپنی والدہ کو یاد کرتے ہوئے اپنے بچپن کو یاد کرتے ہیں کہ جب ماں ان سے پیار کرتی تھی، اور انھیں سینے سے لگاتی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ ماں میں کیسے تیرا قرض ادا کر سکوں گا، یہ قرض تو ایسا ہے کہ جس کی ادائیگی ہی ناممکن ہے۔ باذل نے اس نظم میں موضوع کی مناسبت سے معتدل، نرم اور دھیما لہجہ رکھا ہے۔ زبان صاف اور سادہ ہے۔

باذل کا انداز ہر نظم میں مختلف اور جداگانہ ہوتا ہے۔ یہ ان کی نظموں کی بڑی خوبی ہے کہ وہ ان میں حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اپنی حسن کاری کو استعمال کیے بغیر نہیں رہ پاتے ہیں۔ باذل اپنی نظموں میں وجدان کے بجائے تعلق پر زور دیتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں احساس پر شعور اور رومانیت پر دنیا کے غم و الم کو فوقیت دی ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے ان حقیقی نظریات کو خود پر یا اپنی شاعری پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنی تمام شاعری کو اعتدال پسندی کے قریب رکھتے ہیں۔ باذل نے نظموں میں 'نیا سال'، 'کوہ ندا'، 'یادوں کا قرض' اور 'سانحہ' کا ذکر کرتے ہوئے نظم نگاری کی دنیا میں اپنا الگ مقام بنانے کی کوشش کی ہے۔ اپنی نظم 'حصول علم' کے ذریعے وہ قوم کو علم کے حصول کا سبق دیتے ہیں۔ دنیا میں علم مال و زر سے بہتر ہے۔ علم ہی وہ شے ہے کہ جس سے دنیا و دل دونوں کو سکون ملتا ہے۔ علم ہی وہ شے ہے کہ جس کے ہونے سے فکر روشن ہوتی ہے اور زندگی کو سرور ملتا ہے۔

حصول علم ضروری ہے آدمی کے لیے
حیات دل کے لیے جذبہ خودی کے لیے
حصول علم سے روشن ہے بزم فکر و نظر
حصول علم عبادت ہے زندگی کے لیے
فروغ فطرت انساں ہے نور قلب و نظر
شعور قدرت یزداں عروج ذہن بشر
متاع عالم امکاں بہار زیست ہے علم
کمال جذبۂ ایماں شراب ہوش اثر

باذل عباسی کی نظموں کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نظم نگاری کے میدان میں پوری طرح سے کامیاب ہیں۔ وہ نظموں میں موضوع اور ماحول کے اعتبار سے ہم آہنگ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کا لہجہ نرم ہوتا ہے اور یہ بڑے دھیمے لہجے میں دل کی آگ باہر انڈیلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی آئینہ دار ہے۔ ان کی نظموں میں اس دور کی سیاسی، مذہبی اور اصلاحی تحریکوں کی واضح تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ باذل کی نظمیں اپنی ہیئت اور مواد دونوں اعتبار سے اردو شاعری میں ایک نیا رنگ و آہنگ پیش کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں سادگی، سلاست، برجستگی، فکری ربط و تسلسل کے ساتھ باذل کا خلوص، حب وطن اور دردانسانیت نمایاں ہے۔

غزلوں اور نظموں کے علاوہ ان کے دو شخصی مرثیے بھی ملتے ہیں جس کو انھوں نے اپنے بھائی 'فاضل عباسی' اور 'واصل عباسی' کی وفات پر لکھا تھا۔ فاضل عباسی کو نذر کیا گیا مرثیہ 20 بندوں پر مشتمل ہے۔ یہ مرثیہ 13 جولائی 1997 کی تخلیق ہے۔ یہ مرثیہ مسدس کی ہیئت میں نہ ہو کر غزل کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ باذل کو اپنے بھائی سے بہت محبت اور سچی عقیدت تھی، 'فاضل عباسی' کی موت باذل کے لیے ایک عظیم سانحہ تھی۔ باذل نے اپنے جذبات اور احساسات کی ترجمانی اس مرثیے کی شکل میں کی ہے۔ اس کے کچھ مصرعے پیش ہیں۔

شائستہ نصاب دعا ہو گئے تو کیوں
تم بے نیاز بیم و رجا ہو گئے تو کیوں
حکم سفر میں رنج جدائی تو کچھ نہیں
مجھ کو بلا کے مجھ سے جدا ہو گئے تو کیوں
چھوڑو بھی بات بیتے دنوں کی یہ کیا ہوا؟
تم اب میرے غموں سے رہا ہو گئے تو کیوں
تم کیوں چلے تھے لے کے ہوا میں چراغ جاں
تم خود ہی آج نذر ہوا ہو گئے تو کیوں
کیوں آفتاب ہو گیا مانوس تیرگی؟
پائے ثبات نقش فنا ہو گئے تو کیوں

ان کا دوسرا مرثیہ 5 مئی 2004 میں رقم ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے بھائی واصل عباسی کی خوش اخلاقی کا ذکر کرتے ہوئے غم کا اظہار کیا ہے۔ بڑے بھائی فاضل کے بعد واصل کا مرنا ان کے لیے شاک تھا۔ ان دونوں کی موت سے باذل کے لیے دنیا خوش اخلاقی اور خوش مزاجی سے محروم ہو گئی تھی۔ اس کا ذکر وہ بہت پر اثر انداز سے کرتے ہیں۔

خوش ادا خوش خلق تھی عاقل کی ذات
صاحب فضل و کرم فاضل کی ذات
صاحب اخلاق پیکر اٹھ گیا
بے ریا بے نقص تھی واصل کی ذات
رفتہ رفتہ سب گئے ملک عدم
رہ گئی اک نیم جاں باذل کی ذات
ذور بازو اس کا عاجل رہ گیا
تشنۂ جاں تشنۂ دل رہ گیا

زبان و بیان اور فنی محاسن کے اعتبار سے باذل عباسی کے مرثیے ایک بہترین اور کامیاب شخصی مرثیے ہیں۔ زبان سادہ، سلیس اور رواں ہے۔ مرثیے کے ہر ہر شعر میں بلا کا تاثر ہے۔ اس طرح باذل عباسی نے اردو شاعری کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ایک نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کرایا ہے۔ باذل کی شاعری میں اسلوب کی پختگی، مزاج میں ٹھہراؤ، سماجی مسائل پر مکمل نظر، حالات حاضرہ کا مشاہدہ، اشعار میں واردات قلبی اور فنی بالیدگی نظر آتی ہے۔

■

Almas Fatima
Plot No.: 209, Near T. Mandir
Arif Colony
Aurangabad- 431001 (Maharashtra)

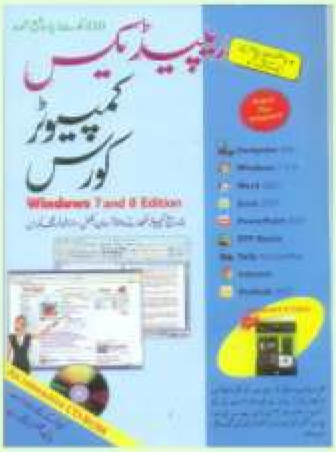

ونڈوز پر کام کی شروعات

(Getting Started with Windos)

ونڈوز پر کام شروع کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ صارف کے ساتھ کس طرح رابطہ بناتا ہے۔ کمپیوٹر پر کام کرنے کو آسان بنانے کے لیے یہ ہماری روزمرہ کے طرز زندگی کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عام طور پر ہم ایک میز (یا ڈیسک) اور اس پر رکھی فائلوں اور فولڈروں کی مدد سے کام کرتے ہیں، جس میں دستاویز اچھی طرح منظم رہتی ہے۔ میز پر بھی کام آنے والی چیزیں رکھی ہوتی ہیں، جیسے فولڈر، قلم، پنسل، ربڑ اور ایک ردّی کی ٹوکری۔ ونڈوز بھی ان سب چیزوں کی نقل آپ کی اسکرین (Desktop) پر تصویروں کے ذریعے کرتا ہے۔

آپ یہ جانتے ہی ہیں کہ ہر کمپیوٹر میں ایک ہارڈ ڈسک ہوتی ہے۔ ہارڈ ڈسک کو آپ ایک الماری سمجھ سکتے ہیں۔ جیسے ایک الماری میں کئی خانے ہوتے ہیں، ویسے ہی ایک ہارڈ ڈسک کے بھی کئی حصے (جنھیں ڈرائیو کہا جاتا ہے) ہوتے ہیں۔ ان حصوں کو انگریزی زبان کے حروف کے مطابق نام دیا جاتا ہے، جیسے کہ :C ڈرائیو، :D ڈرائیو، :E ڈرائیو وغیرہ۔ ان میں سے :C ڈرائیو سب سے عام ہے، کیونکہ ونڈوز سوفٹ ویئر (یا کوئی بھی دیگر آپریٹنگ سسٹم) اسی میں انسٹال کیا جاتا ہے۔ آپ کا بھی ڈاٹا جیسے کہ دستاویز، گانے، فلمیں، گیمس، سوفٹ ویئر وغیرہ کو ان خانوں (ڈرائیوز) کے اندر فائلوں اور فولڈروں میں اسٹور یا محفوظ کرکے رکھا جاتا ہے۔ آپ آگے کے ابواب میں فائلوں اور فولڈروں کے بارے میں تفصیل سے پڑھیں گے اور جانیں گے کہ کسی بھی ایک فولڈ کے اندر مختلف فائل اور فولڈر بنائے اور اسٹور کیے جاسکتے ہیں۔

ونڈوز کے آبجیکٹس (Objects of Windos)

ونڈوز میں فائلوں، فولڈروں، پروگراموں وغیرہ کو آبجیکٹ (Object) کہا جاتا ہے۔ یہ بھی آبجیکٹس کمپیوٹر میں اسٹور کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر، جس طرح ہم کسی فالتو کاغذ کو ختم کرنے کے لیے اسے ردی کی ٹوکری میں پھینکتے ہیں، اسی طرح ونڈوز میں غیر ضروری دستاویز کو ہم ری سائیکل بن (Recycle bin) میں ڈال دیتے ہیں۔ اصلی ردّی کی ٹوکری کی طرح یہ ٹوکری (بن) بھی کبھی کبھی پوری بھر جاتی ہے، اس لیے اسے وقت وقت پر خالی کرنا پڑتا ہے۔

ونڈوز میں دستاویز، ٹوکری اور پروگراموں وغیرہ سب کو 'آبجیکٹ' مانا جاتا ہے۔ مختصراً درج ذیل کو ونڈوز میں آبجیکٹ کہا جاتا ہے۔

• فائل • فولڈر • پروگرام • پرنٹر • موڈیم

عام طور پر کسی آبجیکٹ کو کھولا (Open) یا شروع (Start) کیا جاتا ہے۔ جیسے ہی ہم کسی پروگرام آبجیکٹ کو شروع کرتے ہیں اس پروگرام پر عمل (Execution) شروع ہوجاتا ہے۔

ہر آبجیکٹ کی اپنی خصوصیت (Characteristics) ہوتی ہے۔ یہ خصوصیت ہر آبجیکٹ کے لیے الگ الگ ہوتی ہے۔ ہر آبجیکٹ کے ساتھ پراپرٹی شیٹ (Property Sheet) جڑی ہوتی ہے، جس میں اس کی خصوصیتیں لکھی یا اسٹور کی جاتی ہیں۔ ہم جب بھی چاہیں، کسی بھی آبجیکٹ کی پراپرٹی شیٹ میں ترمیم و اضافہ کرسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، کسی پرنٹر کی پراپرٹی شیٹ میں بیچنے والے کا نام، پیپر کا سائز، پیپر کیسے فیڈ کیا جائے گا کتنی کاپیاں پرنٹ کی جائیں گی وغیرہ شامل کی جاتی ہیں۔ ان خصوصیات کی فہرست کو پرنٹر کی پراپرٹی شیٹ میں سیٹ کیا اور بدلا جاسکتا ہے۔

ایک ہی طرح کے تمام آبجیکٹ کا برتاؤ ایک جیسا ہوتا ہے۔ اگر آپ آبجیکٹ کا استعمال کرنا جانتے ہیں، تو ویسے بھی آبجیکٹس کا بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، اگر آپ ایک فولڈر ٹائپ کے آبجیکٹ کا استعمال کرنا جانتے ہیں، تو سبھی فولڈروں کا استعمال اسی طرح سے کرسکتے ہیں۔

ونڈوز لوڈ کرنا (Loading Windows)

اگر آپ کے کمپیوٹر پر ونڈوز 7 انسٹال ہوچکا ہے، تو ونڈوز کو شروع کرنا کمپیوٹر کو آن کرنا جتنا ہی آسان ہے۔ درحقیقت کمپیوٹر کا پاور آن کرتے ہی ونڈوز کا یہ پروگرام اپنے آپ شروع ہوجاتا ہے، کیونکہ بوٹ ریکارڈ سدھارا جاچکا ہوتا ہے۔ کمپیوٹر بوٹ ہوتے ہی تصویر W-2.1 کی طرح ونڈوز 7 کی بوٹنگ کی اسکرین دکھائی دیتی ہے یا اس سے ملتی جلتی ونڈوز XP کی اسکرین دکھائی دیتی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ونڈوز لوڈ ہورہا ہے۔

اس کے کچھ دیر بعد ہی تصویر W-2.2 کی طرح ونڈوز کا ویلکم ڈائیلاگ باکس آپ کا استقبال کرتا ہے اور آپ سے پاس ورڈ ڈالنے کے لیے کہتا ہے، جس سے کہ آپ ونڈوز پر لاگ آن (Log On) کرسکیں۔

پاس ورڈ اس لیے پوچھے جاتے ہیں کہ کوئی غلط آدمی اس کا استعمال نہ کرے۔

تصویر W-2.1: ونڈوز 7 کی بوٹنگ اسکرین

اس باکس سے باہر نکلتے ہیں، آپ کی اسکرین پر تصویر W-2.3 کی طرح ونڈوز 7 کا ڈیسک ٹاپ دکھائی دے گا۔

ڈیسک ٹاپ (Desktop)

ونڈوز لوڈ ہوجانے کے بعد (اور یوزر لاگ آن

تصویر W-2.2: ونڈوز کا ویلکم ڈائیلاگ باکس

ہوجانے کے بعد) وی ڈی یو پر جو ابتدائی اسکرین دکھائی دیتی ہے، اسے ڈیسک ٹاپ کہا جاتا ہے۔ ونڈوز کا ہر کام عام طور پر ڈیسک ٹاپ سے ہی شروع ہوتا ہے۔ یہ اکثر و بیشتر استعمال کیے جانے والے آبجیکٹ کو ترتیب وار ڈھنگ سے رکھنے میں کام آتا ہے۔ جو فولڈر یا دوسرے آبجیکٹ بار بار استعمال کیے جاتے ہیں، انھیں ڈیسک ٹاپ پر چھوڑ (رکھ) دیا جاتا ہے۔ اس طرح، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، یہ کسی حقیقی ڈیسک یا میز کی ہی نقل کرتا ہے۔ ڈیسک ٹاپ پر کئی چیزیں ہوتی ہیں، جن میں سے درج ذیل اہم ہیں۔

تصویر W-2.3: ونڈوز 7 کا ڈیسک ٹاپ

- Computer (کمپیوٹر)
- Documents (ڈاکیومنٹس)
- Start Button (اسٹارٹ بٹن)
- Recycle Bin (ری سائیکل بن)
- Gadgets (گیجٹس)
- Files (فائلس) اور Folders (فولڈرس)
- Network (نیٹ ورک)
- Taskbar (ٹاسک بار)
- Shortcuts (شارٹ کٹس)

ان سبھی اشیا کا ڈیسکٹ ٹاپ پر ہر وقت ہونا ضروری نہیں ہے اور ان کی ترتیب بھی الگ الگ ہوسکتی ہے، کیونکہ ہر آدمی اپنی میز کو اپنے ہی طریقے سے سجاتا ہے، لیکن ان میں سے ہر ایک کا مقصد اور برتاؤ ہمیشہ ایک جیسا ہوتا ہے۔ ڈیسک ٹاپ پر ہر ایک آبجیکٹ کو ایک چھوٹی تصویر کے ذریعے دکھایا جاتا ہے، جس کے نیچے اس آبجیکٹ کا نام بھی لکھا ہوتا ہے۔ نام سمیت اس تصویر کو اس آبجیکٹ کی علامت یا آئیکان (Icon) کہا جاتا ہے۔ ان میں سے چند کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

کمپیوٹر (Computer)

یہ آبجیکٹ ایک چھوٹے کمپیوٹر کے آئیکان کے ذریعے دکھایا جاتا ہے۔ اس آبجیکٹ میں آپ کے کمپیوٹر میں اسٹور کیے گئے ہر آبجیکٹ اور اطلاع کی تفصیل موجود ہوتی ہے۔ اس آبجیکٹ (کمپیوٹر) پر کام کرنے کے لیے پہلے اسے کھولا جاتا ہے۔ کسی آبجیکٹ کو کھولنے

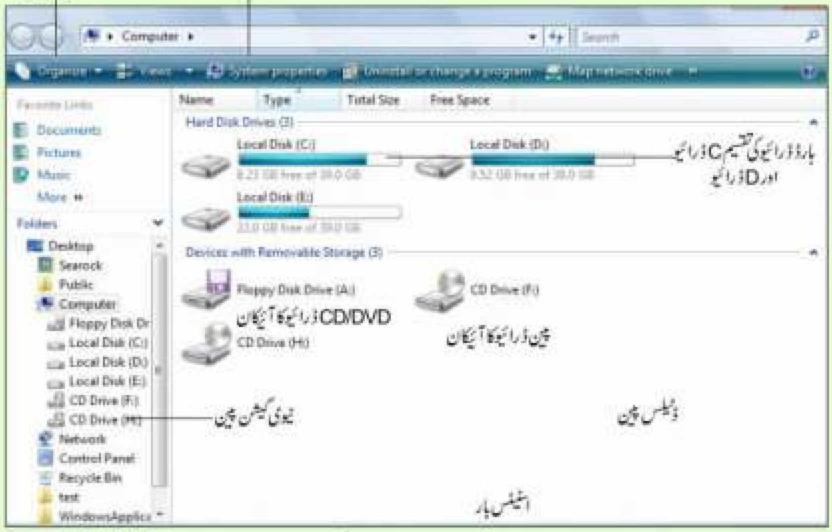

تصویر W-2.4: Computer کی ونڈوز

کے لیے ماؤس کے پوائنٹر کو اس کے آئیکان پر لے جاکر ڈبل کلک کیا جاتا ہے یا ایک بار کلک کرکے انٹر کی (Ener Key) دبائی جاتی ہے۔ ایسا کرتے ہی اسکرین پر Computer کی ونڈو تصویر W-2.4 کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ جس میں ہر ڈرائیو کا ایک آئیکان ہوتا ہے۔

اس ونڈو کے کسی ڈرائیو کے آئیکان کو ڈبل کلک کرنے سے اسی ونڈو میں Computer کی بجائے اس ڈرائیو میں شامل چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اس میں آپ پھر کسی فولڈر کے آئیکان کو ڈبل کلک کرکے اس کی ونڈو کو کھول سکتے ہیں۔ اس طرح سے فولڈروں کو بالترتیب کھولتے ہوئے آپ اپنے کمپیوٹر کے کسی بھی فولڈر کی کسی بھی فائل تک پہنچ سکتے ہیں اور اس کا استعمال کرسکتے ہیں۔

ری سائیکل بن (Recycle Bin)

یہ ونڈوز آپریٹنگ سسٹم کا ایک خاص فولڈر ہوتا ہے، جس کی مدد سے آپ اپنی ہٹائی ہوئی فائلوں اور فولڈروں کو آسانی سے دوبارہ برآمد کرسکتے ہیں۔ ہارڈ ڈسک سے ہٹایا ہوا ہر آبجیکٹ (Object) فوراً ری سائیکل بن میں چلا جاتا ہے۔ اس بن کو آپ بعد میں کبھی بھی کھول سکتے ہیں اور اگر ضروری ہو، تو ہٹائے ہوئے آبجیکٹ کو برآمد کرسکتے ہیں۔ ری سائیکل بن کو پوری طرح خالی کرنا بھی ممکن ہے۔ لیکن ری سائیکل بن کو اگر ایک بار خالی کردیا جائے، تو پھر ان چیزوں کو دوبارہ حاصل کرنا ناممکن ہے۔

ری سائیکل بن کا سائز پوری ہارڈ ڈسک کے سائز یا صلاحیت کے کسی فیصد کے روپ میں سیٹ کیا جاتا ہے۔

اس بن کا سائز جتنا بڑا ہوگا، یہ اتنی ہی زیادہ ہٹائی گئی فائلوں کو اسٹور کرے گی۔ جب ری سائیکل بن پوری طرح بھر جاتی ہے، تو نئی ہٹائی گئی فائلوں کے لیے جگہ بنانے کے لیے سب سے پرانی ہٹائی گئی فائلوں کو مٹا دیا جاتا ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر کسی فائل یا فولڈر کو پین ڈرائیو یا کسی دوسری ریموویبل ڈسک سے ہٹاتے ہیں، تو وہ فائل یا فولڈر ری سائیکل میں نہیں ڈالا جاتا، بلکہ یہ صرف ونڈوز میں ہارڈ ڈسک سے ہٹائی گئی فائلوں اور فولڈروں کے لیے ہی کارگر ہے۔

نیٹ ورک (Newwork)

یہ ایک ایسا فولڈر ہے، جس میں آپ کے کمپیوٹر سے جڑے ہوئے باقی سبھی کمپیوٹروں کے فولڈرس ہوتے ہیں۔ یہ اس نیٹ ورک کو ظاہر کرتا ہے، جس سے آپ کا کمپیوٹر جڑا ہوا ہے۔ یہ اس نیٹ ورک کے بارے میں چند تفصیلات سے ایک ونڈو میں دکھاتا ہے۔ اس میں عام طور پر درج ذیل معلومات ہوتی ہیں:

- مکمل نیٹ ورک (Entire Network)
- آپ کے ورک گروپ کے دوسرے ممبران کی تفصیل

ان میں سے 'Entire Network' میں دوسرے ورک گروپ (Work Groups)، سرورس (Servers)، مشترکہ فولڈروں (Shared Folders)، پرنٹروں اور مشترکہ دستاویزوں (Shared Documents) کے بارے میں اطلاعات بھری ہوتی ہیں۔ یہ معلومات 'Entire Network' کو ڈبل کلک کرکے دیکھی جا سکتی ہیں۔

نیٹ ورک کا تصور کسی نیٹ ورک کے ساتھ کام کو آسان بنانے کے لیے لاگو کیا گیا ہے۔ اس سے سبھی ورک اسٹیشن (Work Stations) کی بجائے صرف انھیں ورک اسٹیشن یا نیٹ ورک کے اس حصہ کو دکھایا جاتا ہے، جس سے آپ زیادہ پاس سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس طریقے سے آپ نیٹ ورک کے اس حصے کو اچھی طرح استعمال کر سکتے ہیں، جس کے ساتھ آپ زیادہ کام کرتے ہیں۔ حالانکہ باقی نیٹ ورک بھی 'Entire Network' آئیکان کے توسط سے آپ کو ہمیشہ دستیاب رہتا ہے۔ اگر آپ کا نیٹ ورک کسی نیٹ ورک سے جڑا ہوا نہیں ہے، تو نیٹ ورک کا آئیکان ڈیسک ٹاپ پر دکھائی نہیں دیتا۔

اسٹاٹ بٹن (Start Button)

ونڈوز 7 کے ڈیسک ٹاپ کے نچلے بائیں کونے میں 'Start' بٹن کو کلک کرکے اسٹارٹ مینو کھولا جاتا ہے۔

تصویر W-2.5: اسٹارٹ مینو

یہ مینو دراصل پورے کمپیوٹر کا ایک سہل کنٹرول پوائنٹ ہے۔ کمپیوٹر کے سبھی کام کاج اسی مینو سے شروع کیے جاتے ہیں۔ ونڈوز 7 میں یہ مینو تصویر W-2.5 کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

ونڈوز 7 کا اسٹارٹ مینو دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ مینو کے بائیں جانب ان پروگراموں کے آئیکان دیے جاتے ہیں، جن کو حال ہی میں کھولا گیا ہے یا ان پر کام کیا گیا ہے۔ بائیں جانب ہی نچلے حصے میں 'All Programs' آپشن ہوتا ہے۔ اس پر کلک کرنے سے بائیں حصہ میں ہی ان سبھی پروگراموں کی فہرست کھل جاتی ہے، جو آپ کے کمپیوٹر میں موجود ہیں۔ اس فہرست میں سے اپنی خواہش کے مطابق پروگرام کو منتخب کرکے اسے شروع کیا جا سکتا ہے۔ اسٹارٹ مینو کے دیگر آپشن دائیں طرف ہوتے ہیں، جن کو منتخب کرنے پر ہونے والے اثرات درج ذیل ہیں:

User Name: سب سے اوپر کمپیوٹر کے صارف کا نام (جسے یوزر نیم کہا جاتا ہے) ہوتا ہے۔ اس پر کلک کرنے سے User Name فولڈر کھلتا ہے، جس میں صارف کے دستاویزوں، تصویروں، آڈیو اور دیگر بقیہ فائلوں کے فولڈر ہوتے ہیں۔

Documents: یہ آپ کی دستاویزوں کا فولڈر ہوتا ہے، جسے کلک کرنے پر آپ اس فولڈر میں محفوظ کیے گئے مکتوب، رپورٹ اور دیگر دستاویز کھول سکتے ہیں۔

Pictures: اس فولڈر میں تصویر اور گرافکس فائلیں محفوظ ہوتی ہے۔

Music: اس فولڈر میں آڈیو فائلیں محفوظ ہوتی ہیں۔

Games: اس فولڈر کو کلک کرنے سے آپ کے کمپیوٹر میں پہلے سے ہی محفوظ ملٹی میڈیا کھیل (Games) نظر آتے ہیں۔ آپ کوئی بھی کھیل کھیل کر اپنا دل بہلا سکتے ہیں۔

Computer: آپ کے کمپیوٹر کے ڈیسک ٹاپ پر دیے گئے Computer کے آئیکان پر ڈبل کلک کرکے کھولنا اور اسٹارٹ مینو میں Computer کی ونڈو نظر آتی ہے، جس میں ہر ایک ڈرائیو کا ایک آئیکان ہوتا ہے۔

Control Panel: اس آپشن پر کلک کرنے سے Control Panel کھلتا ہے، جس کے ذریعے آپ اپنے کمپیوٹر ڈیسک ٹاپ کی شکل بدل سکتے ہیں، کمپیوٹر میں نیا پروگرام ڈال سکتے ہیں یا ہٹا سکتے ہیں، نئے نیٹ ورک جوڑ سکتے ہیں، یوزرا کاؤنٹس بنا سکتے ہیں وغیرہ۔

Devices and Printers: اس آپشن کے ذریعے آپ ان سبھی آلات کو، جو کہ آپ کے کمپیوٹر کے ساتھ کسی تار (Wired) یا بے تار (Wireless) جڑے ہوتے ہیں، دیکھ سکتے ہیں اور ان کے بارے میں ساری معلومات، جیسے کہ وہ کیا کام کر سکتے ہیں اور آپ ان سے کیا کام کرا سکتے ہیں، وغیرہ حاصل کر سکتے ہیں، جیسے کہ پرنٹر، کیمرہ، پین ڈرائیو وغیرہ۔

Default Programs: اس آپشن کو کلک کرنے سے ایک ونڈو کھلتی ہے، جس میں آپ مختلف کام، جیسے انٹرنیٹ سے معلومات تلاش کرنا، تصویریں ایڈٹ کرنا، ای میل بھیجنا، آڈیو یا ویڈیو چلانا وغیرہ کر سکتے ہیں۔

Help and Support: اس سے help and Support پروگرام شروع ہوتا ہے۔ اس سے آپ ونڈوز میں کوئی کام کرنے کے لیے مدد لے سکتے ہیں۔

ان سبھی آپشن کے علاوہ اسٹارٹ مینو کے بائیں حصہ کے نیچے Search باکس ہوتا ہے، جس کی مدد سے آپ کوئی بھی فائل، فولڈر وغیرہ تلاش کر سکتے ہیں۔ Search باکس میں خواہش کے مطابق آبجیکٹ کا نام ٹائپ کرکے EnterKey انٹر کی دبائیں۔ تلاش کے نتیجے (Search Results) فوراً آپ کی اسکرین پر دکھائی دینے لگیں گے۔

ٹاسک بار (Task Bar)

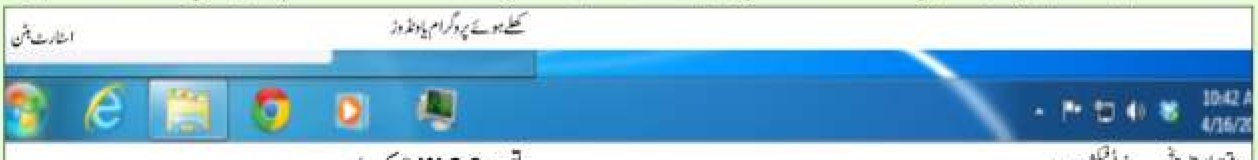

تصویر W-2.6: ٹاسک بار

جب بھی آپ کوئی پروگرام شروع کرتے ہیں یا کوئی ونڈو کھولتے ہیں، تو اسکرین پر سب سے نیچے ٹاسک بار میں اس ونڈو کو دکھانے والا ایک بٹن دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح ٹاسک بار ہمیں ابھی چل رہے پروگراموں پر فوراً پہنچنے کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ تصویر W-2.6 میں ایک ٹاسک بار دکھایا گیا ہے۔

ٹاسک بار کا پہلا بٹن اسٹارٹ بٹن ہوتا ہے۔ اس کے بعد ابھی کھلے ہوئے یا چل رہے پروگراموں کے لیے ایک ایک باکس یا بٹن ہوتا ہے۔ جب بھی آپ کسی ونڈو سے کسی دوسرے پروگرام یا ونڈو میں جانا چاہتے ہوں، تو صرف ٹاسک بار میں اس پروگرام یا ونڈو کے باکس کو کلک کر دیجیے۔ جب آپ کسی ونڈو کو بند (Close) کرتے ہیں، تو ٹاسک بار سے اس کا باکس غائب ہو جاتا ہے۔

آپ جو کام کر رہے ہیں، اس پر انحصار کرتے ہوئے ٹاسک بار کے دائیں کونے (جسے نوٹی فکیشن ایریا کہتے ہیں) میں دیگر نشان بھی نظر آ سکتے ہیں، جیسے آپ کے چھپائی کے کام کو ظاہر کرنے والا پرنٹر یا پورٹیبل کمپیوٹر دکھانے کے لیے ایک بیٹری۔ آخری سرے پر ایک ڈجیٹل گھڑی (Clock) دکھائی جاتی ہے۔ سیٹنگ دیکھنے یا بدلنے کے لیے ان آئیکان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر آپ تاریخ یا وقت کی سیٹنگ دیکھنا یا بدلنا چاہتے ہیں، تو صرف گھڑی کے نشان کو ڈبل کلک کر دیجیے۔ اس سے ایک ڈائیلاگ باکس کھلے گا، جس میں آپ وقت اور تاریخ کی سیٹنگ کو دیکھ یا بدل سکتے ہیں۔

گیجٹ (Gadget)

گیجٹس چھوٹے چھوٹے مکمل پروگرام یا آلات ہیں، جو آپ کی ڈیسک ٹاپ اسکرین پر پائے جاتے ہیں۔ ان آلات کے ذریعے آپ مختلف کام، جیسے کہ گھڑی، کیلنڈر، نیوز ریڈر وغیرہ کا استعمال کر سکتے ہیں۔

آلات جوڑنے کے لیے ڈیسک ٹاپ ایریا میں ماؤس کا دایاں بٹن کلک کیجیے۔ ایسا کرنے سے ایک چھوٹا مینو کھلے گا۔ مینو میں 'Gadgets' آپشن پر کلک کیجیے۔ اس سے گیلری تصویر W-2.8 کی طرح کھلے گی، جس میں آلات کے آپشن موجود ہوں گے۔ ان میں سے کسی بھی آلہ کو ڈیسک ٹاپ میں جوڑ سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر مان لیجیے کہ آپ کلاک یا گھڑی آلہ جوڑنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے 'کلاک' پر ماؤس کا دایاں بٹن کلک کیجیے، آپ کے سامنے دو آپشن آئیں گے Add اور Uninstall۔ Uninstall پر کلک کرنے سے یا یہ گیلری سے غائب ہو جائے گا، لیکن یہاں ہم آپ اسے ڈیسک ٹاپ میں جوڑنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے Add پر کلک کیجیے، آلہ فوراً آپ کے ڈیسک ٹاپ میں جڑ جائے گا۔

ان آلات (Devices) کو ہٹانے کے لیے آپ ان پر دیا گیا 'X' بٹن دبا سکتے ہیں۔ کچھ دوسرے قسم کے آلات اس طرح ہیں:

Calender: کیلنڈر دیکھنے کے لیے آلہ۔
Contacts: آپ کی جان پہچان کے لوگوں کے نام، پتہ اور ای میل وغیرہ رکھنے کا آلہ۔
CPU Meter: یہ آلہ بتاتا ہے کہ میموری اور سی پی یو کتنے فیصد استعمال میں ہیں۔
Currency: غیر ملکی کرنسی کی قدر جاننے کے لیے آلہ۔
Feed Headlines: خبر کی سرخیاں بتانے کے لیے آلہ۔
Stocks: شیئر بازار کی جانکاری دینے کے لیے آلہ۔
Weather: موسم کی جانکاری دینے کے لیے آلہ۔

تصویر W-2.7: کانٹیکسٹ مینو

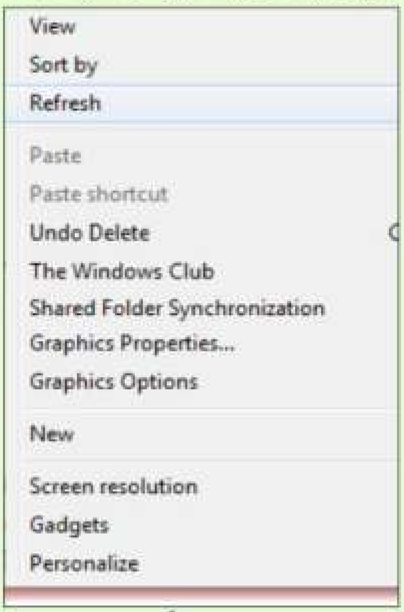

تصویر W-2.8: مختلف گیجٹس ونڈو

Picture Puzzle: بچوں کے لیے تصویر کی پہیلیوں والا آلہ۔

کوئی پروگرام شروع کرنا

(To Start a Program)

ونڈوز 7 میں کوئی بھی پروگرام شروع کرنا بہت ہی آسان ہے۔ آپ کو صرف اتنا معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کس فولڈر میں ہے۔ پروگرام شروع کرنے کے لیے درج ذیل ہدایتوں پر عمل کیجیے:

1۔ ڈیسک ٹاپ میں اسٹارٹ بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے اسٹارٹ مینو کھل جائے گا۔

2۔ اسٹارٹ مینو میں 'All Programs' آپشن کو کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی آپ کو اسی ونڈو میں پروگرام فولڈر میں موجود پروگراموں اور فولڈروں کی فہرست دکھائی دے گی۔ ایسی ایک فہرست تصویر W-2.9 میں دکھائی گئی ہے۔

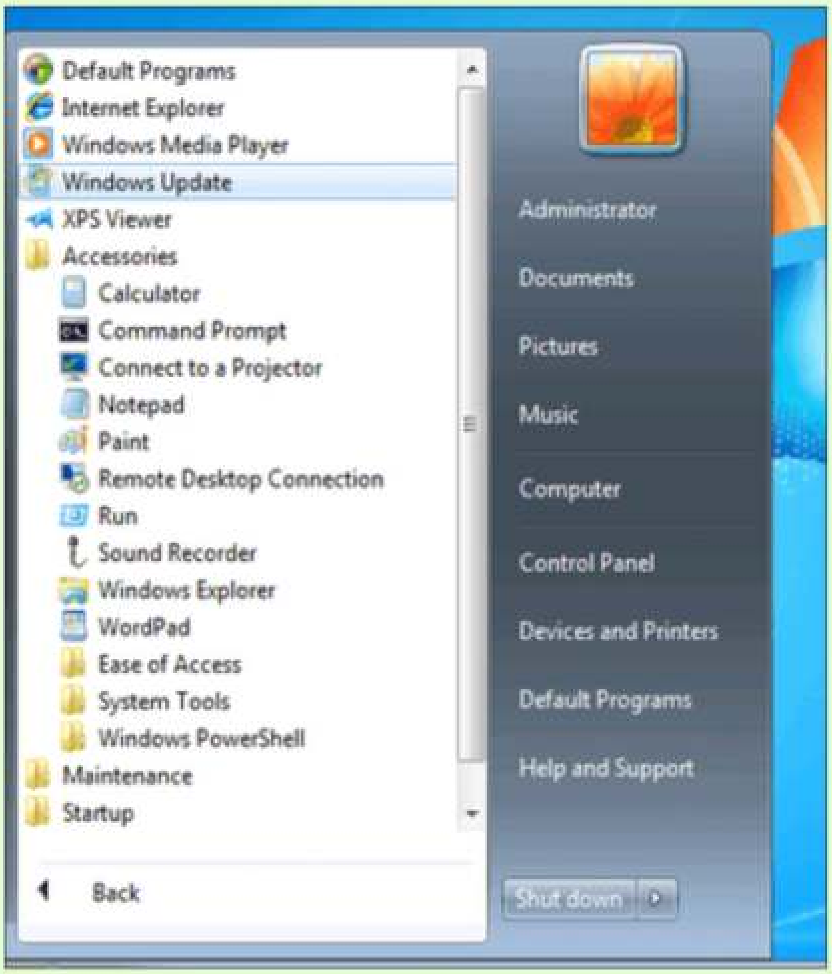

تصویر W-2.9: موجود پروگراموں اور فولڈروں کی فہرست

اس فہرست میں کئی پروگرام اور کئی فولڈر ہیں۔ اگر آپ کا پسندیدہ پروگرام اس فہرست میں ہے، تو آپ اسے کلک کر کے شروع کر سکتے ہیں۔ اگر وہ کسی فولڈر میں ہے، تو پہلے اس فولڈر کو کلک کریں، جس سے پھر ایک نئی ونڈو میں ایک نئی فہرست آئے گی۔ اسی طرح آپ کسی بھی گہرائی تک جا کر اپنا ضروری پروگرام شروع کر سکتے ہیں۔

کوئی پروگرام ختم کرنا

(To Quit a Program)

کسی پروگرام کو ختم (بند) کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ ان میں سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ اس پروگرام کی ونڈو میں اوپری دائیں کونے میں 'X' دکھانے والا جو بٹن ہے، اسے کلک کردیں۔ باقی طریقوں کے بارے میں آپ آگے پڑھیں گے۔

ونڈوز کو بند کرنا

(Shutting Down Windos)

ونڈوز میں کام کرنے کے بعد کمپیوٹر کی پاور سپلائی بند کرنے کے لیے ونڈوز سے ٹھیک طرح باہر آنا (یعنی اسے بند کرنا) نہایت ضروری ہے، ورنہ آپ کی فائلیں خراب ہوسکتی ہیں۔ جب ونڈوز کو صحیح طریقے سے بند کیا جاتا ہے، تو وہ ابھی چل رہے پروگراموں کو بند کرتا ہے اور سبھی کھلے ہوئے فولڈروں کو بھی بند کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر آپ کسی نیٹ ورک سے جڑے ہوئے ہیں، تو وہ سبھی کنکشن کو ہٹا دیتا ہے۔

ونڈوز 7 کو بند کرنا بہت آسان ہے۔ اس کے لیے درج ذیل ہدایتوں پر عمل کیجیے:

1۔ اسٹارٹ بٹن کو کلک کیجیے۔

2۔ اسٹارٹ مینو میں دائیں کونے پر دیے گئے 'Shut Down' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس آپشن کو کلک کرنے سے پہلے آپ کے سبھی پروگرام، پھر ونڈوز اور پھر آپ کا کمپیوٹر بند ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ اپنے کمپیوٹر کی پاور سپلائی بند کر سکتے ہیں۔

ونڈوز 7 کے اسٹارٹ مینو میں دائیں کونے پر ایرو بٹن کلک کرنے پر کھلنے والے مینو میں کل چھ آپشن ہوتے ہیں۔ ان کے اثرات درج ذیل ہیں:

Switch User: اس آپشن کے ذریعے آپ کوئی بھی پروگرام بند کیے بغیر ایک صارف کھاتہ (یوزر اکاؤنٹ) سے دوسرے کھاتہ میں جاسکتے ہیں۔ کوئی صارف منتخب کر لینے پر آپ کو صرف اسی صارف کی فائلیں دستیاب ہوں گی۔

Log Off: اس آپشن پر کلک کرنے پر صرف آپ کے پروگرام بند ہوتے ہیں۔ آپ دوبارہ پاس ورڈ ڈال کر اپنا کام پھر سے شروع کر سکتے ہیں۔

Lock: یہ بٹن کمپیوٹر کو تالا لگانے کے لیے ہے۔ اس آپشن کو کلک کرنے کے بعد جب تک آپ کمپیوٹر میں پاس ورڈ نہیں ڈالیں گے تب تک کام شروع نہیں ہوگا۔

Restart: اس آپشن کو چننے پر کمپیوٹر ری سیٹ ہو جاتا ہے اور پرانا ونڈوز پروگرام بند ہو کر پھر سے کھل جاتا ہے۔

Sleep: اس آپشن کو چننے پر کمپیوٹر کے سارے کام بند ہوجاتے ہیں، جب تک آپ کوئی بٹن نہ دبائیں۔ کوئی کنجی یا بٹن دبانے پر کام دوبارہ شروع ہو جاتے ہیں۔

Hibernate: مان لیجیے، آپ نے کمپیوٹر میں کوئی پروگرام کھولا ہے اور کسی وجہ سے آپ کو کمپیوٹر بند کرنا پڑ رہا

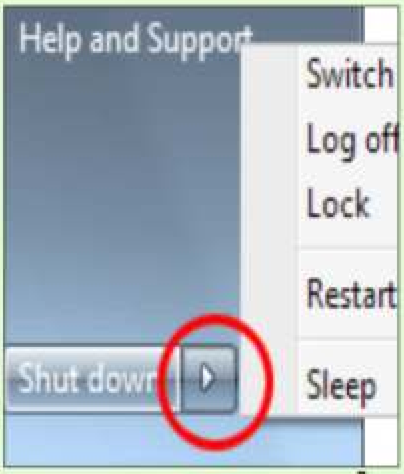

تصویر W-2.10: Tun off Computer

ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ جب آپ کمپیوٹر دوبارہ کھولیں، تو وہ پروگرام آپ کو کھلا ہوا ملے۔ ایسی ضرورتوں کے لیے Hibernate آپشن کا استعمال کریں۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8/آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2

فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ وتعارف

انتخاب سخن (جلد اوّل) سلسلۂ شاہ حاتم

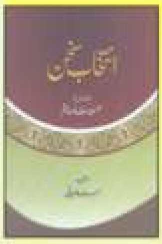

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 388، قیمت: 175 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ارشاد قمر، اے، بی 452 پہلی منزل،
امر پوری رام نگر، نبی کریم، پہاڑ گنج، نئی دہلی 25

مولانا حسرت موہانی اردو کے ایک عظیم شاعر ہیں، اس حیثیت سے انھیں ایسی شہرت ومقبولیت ملی کہ ان کے دیگر علمی وادبی، سیاسی وصحافتی کارناموں پر گمنامی کی گرد جم گئی۔ حالانکہ وہ ایک ممتاز صحافی، ایک اہم نقاد اور ایک بلند پایہ تذکرہ نگار بھی تھے۔ ان کی تخلیقی عظمت وانفرادیت اور تحقیقی وتنقیدی بصیرتوں کا ایک عظیم نمونہ انتخاب سخن ہے۔ انھوں نے گیارہ جلدوں میں کم وبیش 200 شعرا کے دواوین کے انتخابات شائع کرکے اپنے زمانے کی شعری خدمات اور ادبی لطافتوں کی نمائندگی کی۔ حسرت نے شروعاتی دور میں چند اہم شعرا کے انتخاب مرتب کرکے اردوئے معلی کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع کیے۔ چونکہ اردوئے معلی ان کی نگرانی میں نکل رہا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے انتخاب سخن کی ترتیب کی جانب اپنی توجہ مبذول کی جس کی پہلی جلد زیر تبصرہ ہے۔ اس پہلی جلد میں انھوں نے تقریباً 20 شعرا کے انتخابات کلام کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے جیسے انتخاب حاتم، انتخاب رنگین، انتخاب نثار، انتخاب بیدار وغیرہ۔ حسرت نے یہ انتخابات ایسے وقت میں مرتب کرنا شروع کیا، جب اردو شعر وادب ایک انقلاب سے دوچار تھا۔ مغربی اور خاص طور سے انگریزی ادب کے زیر اثر جہاں اردو شاعری نت نئے رجحانات سے آشنا ہو رہی تھی، وہیں اس کا ایک منفی پہلو یہ بھی تھا کہ اردو کے قدیم شعری سرمائے سے بیزاری بھی پیدا ہو رہی تھی۔

ایسے ناگفتہ بہ حالات میں حسرت کو اس کا شدید احساس ہوا اور انھوں نے ذوق شعری کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے اساتذہ اور اہم شعرا کے کلام کا مطالعہ کیا اور قدیم شعری سرمائے کو جامع انتخابات کے ذریعے عام کرنے کا عزم بھی کیا اور اس کے ذریعے شعرا اور قارئین کے ذوق کی تہذیب وتربیت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ حسرت نے شعرا کے کلام کا انتخاب کرتے وقت اس بات کی ہر ممکن کوشش کی ہے کہ غزل کے انتخابات میں غزل کی ہیئت اور ماہیت برقرار ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ انتخابات زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں دوسری اصناف کو بہت کم جگہ ملی ہے۔

حسرت کے مقصد، ماخذ اور طریق انتخاب کو سمجھنے میں خود ان کا ایک بیان بڑی حد تک معاون ہوگا۔ وہ 'انتخاب کلیات جعفر علی حسرت' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اردو زبان کی بدقسمتی ہے اور ناقدردانوں کی غفلت کی وجہ سے بہت سے زبردست استادوں کا کلام برباد ہوگیا۔ ایسا کہ اب تلاش کرنے پر بھی اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا اور بہت سا کلام ضائع ہونے کے قریب ہے یعنی یہ کہ اگر بہت جلد اس کی حفاظت اور اشاعت کا انتظام نہ کیا جائے گا تو کچھ دنوں میں دنیا سے ناپید ہوجائے گا۔''

اس خدشہ اور فکر کو مدنظر رکھتے ہوئے حسرت موہانی سے جہاں تک ممکن ہوسکا قدیم دیوانوں کو جمع کرلیا اور جو جمع ہوگیا اسے چھپوانے کی جانب توجہ دی تاکہ جلد از جلد منظر عام پر آسکے۔ اس لیے انھوں نے چند باتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کلام کا انتخاب اس طور پر کیا کہ دیوان کی صورت قائم رہے مثلاً منتخب غزلوں میں اصل غزلوں سے اشعار کم ہیں لیکن غزل کی حیثیت اپنی شکل میں باقی ہے۔ اس مقصد کے لیے زیادہ تر انھیں غزلوں کا انتخاب کیا گیا ہے جو منتخب ہونے کی حالت میں بھی غزل کی شکل وصورت برقرار رہے اور مطلع ومقطع کا پورا خیال رکھا گیا ہے اس کے باوجود بعض جگہوں پر غزلوں میں مطلع اور مقطع میں کمی اور بیشی پائی گئی ہے لیکن اس سے دو فائدے ہوئے ہیں ایک تو یہ کہ غزل کی صورت قائم رہی۔ دوسری یہ کہ شاعر کے کمزور کلام کا نمونہ بھی انتخاب میں موجود رہا۔ اس کا پورا امکان ہے کہ حسرت نے کچھ شعرا کے انتخابات اس مجموعہ انتخاب یا کسی اور مجموعے سے ہو بہو نقل کرلیے ہیں لیکن ہر شاعر کے انتخاب کے متعلق یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔

حسرت نے بیشتر شعرا کے دواوین اور کلیات کا بہ نظر غائر مطالعہ کرکے خود ہی انتخابات مرتب کیے ہیں۔ کچھ شعرا کے انتخابات تذکروں اور بیاضوں کی مدد سے بھی مرتب کیے ہیں جیسے مرزا مظہر جانجاناں کے اشعار تمام تر تذکروں سے ماخوذ ہیں اس سلسلے میں قاضی عبدالودود ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''یہ خیال کہ حسرت نے جو انتخابات شائع کیے ہیں وہ دواوین پر مبنی نہیں محلاً صحیح نہیں۔ ان کے پاس بہت سے قلمی اور مطبوعہ دواوین تھے اور ان سے انھوں نے انتخاب میں کام لیا ہے مگر ان کے ایسے انتخابات بھی ہیں جن کے اشعار تذکروں اور بیاضوں وغیرہ سے لیے گئے ہیں۔''

یہ انتخابات کئی لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ تھوڑے صفحات میں اردو کا تمام قابل قدر شعری سرمایہ ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے اور اس طرح کے انتخابات سے قاری کو دیگر کلیات اور دواوین کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ ان کے ذریعے عام لوگوں کی رسائی بھی کلاسیکی ادب تک ہوجاتی ہے کیونکہ تمام دواوین اور کلیات کا حصول عام شخص کے بس کی بات نہیں۔ تیسری بات یہ کہ ان میں حسرت کے ایسے معاصر شعرا کے انتخابات بھی شامل ہیں جن کا مجموعہ کلام اس وقت تک مرتب نہیں ہوا تھا۔ ایسے شعرا کے کلام کی ابتدا کی نوعیت کو سمجھنے اور ان کے کلام

کی تاریخ ترتیب میں ان انتخابات سے بڑی مدد ملے گی۔ چوتھی بات یہ کہ ان سے خود حسرت کی شخصیت اور ذوقِ شعری کا اندازہ ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود حسرت کا شاعری میں جو ضبط و نظم ہے اس کا علم ہوتا ہے اور حسرت سے قبل کے سارے شعری سرمایے کا نچوڑ مل جاتا ہے۔

حسرت نے یہ انتخابات مرتب کرکے اردو ادب کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ انھوں نے ان کے ذریعے بہت سے گمنام اور کم مشہور شعرا کو روشناس کرایا ہے۔ بہت سے اساتذہ کو بھی انھوں نے نئی زندگی عطا کی ہے۔ حسرت نے جس وقت یہ انتخابات مرتب کیے اس وقت تک حاتم، مظہر، سوز، قائم، مصحفی اور جرأت جیسے مشہور و معروف شعرا کے دواوین غیر مطبوعہ اور کمیاب بلکہ نایاب تھے۔ حسرت کے یہ انتخابات بڑی حد تک جامع ہیں اور ان سے متعلقہ شعرا کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

اردو میں اس طرح کے انتخابات کی ضرورت ہے تاکہ اس کے رموز و اوقاف سے واقفیت ہوسکے۔ این سی پی یو ایل مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے اس اہم کتاب کو شائع کرنے کی ذمے داری لی ہے جس کا نمونہ پہلی جلد کی شکل میں قارئین کی فہرست میں پیش ہے۔

علی سردار جعفری

مصنف: علی رضا

صفحات: 165، قیمت: 90 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عادل حیات، 37/89، گراؤنڈ فلور، ووڈ سائڈ اپارٹمنٹس گلی نمبر 1، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

علی سردار جعفری ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا شمار ایک اہم شاعر اور ترقی پسند تحریک کے نظریہ سازوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے افسانے، ڈرامے اور رپورتاژ جیسی نثری اصناف کو وقار اور تنقیدی مضامین کو معیار عطا کیا۔ وہ کئی ادبی رسالوں کے مدیر تھے۔ علاوہ ازیں سینما اور ٹیلی ویژن کے میدان میں بھی قسمت آزمائی کی۔ 'سرمایۂ سخن' کے ذریعے انھوں نے لغت نویسی کے چٹیل میدان میں قدم رکھا اور بحسن و خوبی اسے عبور بھی کیا۔ کئی شعری و نثری مجموعوں کے علاوہ ان کی کتابوں میں 'ترقی پسند ادب اور لکھنؤ کی پانچ راتیں' بے حد مقبول و معروف ہیں۔ علمی و ادبی خدمات کے عوض انھیں مختلف ایوارڈوں سے نوازا گیا، جن میں 'گیان پیٹھ سمان' بھی شامل ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اپنے سلسلۂ مطبوعات میں 'مونوگرف' کی طباعت کو بھی شامل کیا ہے۔ اس اسکیم کے تحت اہم ادبا و شعرا کی شخصی و ادبی جہتوں کا احاطہ سو، سوا سو صفحات میں کرکے، اسے مونوگراف کی شکل دی جاتی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر علی سردار جعفری کا مونوگراف بھی شائع ہوا ہے، جسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں عمر رضا نے جانکاہی سے کام لیا ہے۔

ابتدائیہ کے علاوہ موصوف نے اس مونوگراف کو مختلف عنوانات جیسے کہ شخصیت و سوانح، ادبی و تخلیقی سفر، تنقیدی محاکمہ، انتخاب شاعری اور انتخاب نثر کے تحت پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ شخصیت و سوانح کے باب میں لفظی مرقع کشی کرتے ہوئے جزیات اور اہم واقعات سے فائدہ جس کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ مصنفِ مونوگراف نے اٹھایا ہے، اس سے علی سردار جعفری کی واضح تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے منعکس ہوجاتی ہے۔ اس حصے میں سردار جعفری کی پیدائش، تعلیم و تربیت اور ادبی رویئدگی کے ساتھ سلطانہ جعفری سے ان کی پہلی ملاقات نیز ازدواجی زندگی کو آئینہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی ادبی اور سیاسی زندگی کے نشیب و فراز اور علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ملنے والے اعزازات کی مکمل تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اس باب کے آخری حصے میں جعفری صاحب کی لمبی بیماری کے بعد یکم اگست 2000 میں ان کی موت کی تفصیل بھی درج ہے۔ اس مونوگراف کا دوسرا حصہ 'ادبی و تخلیقی سفر' اس معنی میں اہم ہے کہ اس میں موصوف نے علی سردار جعفری کے ادبی و تخلیقی سفر کا مطالعہ باریک بینی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چنانچہ اس حصے میں وہ باتیں بھی سپردِ قلم ہوگئی ہیں، جو ابھی تک پردۂ خفا میں تھیں۔ عمر رضا کے مطابق علی سردار نے 1929 میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز مرثیہ گوئی کے ساتھ کیا۔ اس کے بعد دوسری اصناف شاعری میں بھی طبع آزمائی کی اور اپنی قادرالکلامی سے ہر صنف کو نقطۂ اوج تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے شاعری کے ساتھ تواتر کے ساتھ افسانے بھی لکھے۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے ادب کے درخشندہ ستارے ہیں۔ سردار جعفری کئی تنقیدی مجموعوں کے خالق بھی تھے۔ جس میں ترقی پسند نظریۂ ادب کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ان کی تنقیدی کتابوں میں 'ترقی پسند ادب' کافی مقبول ہوئی۔ اس کے علاوہ غالب، اقبال، کبیر اور دوسرے شعرا پر بھی ان کے مضامین اور کتابیں بھی دستیاب ہیں۔ عمر رضا نے سردار جعفری کی ان کتابوں کا تعارف سالِ اشاعت کی ترتیب کے ساتھ کرایا ہے۔ ان کی اس سعی سے سردار جعفری کی تمام کتابیں اپنی خصوصیات کے ساتھ ہمارے ذہن کا حصہ بن جاتی ہیں۔ علاوہ ان کا ادبی قد بھی واضح ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد موصوف نے سردار جعفری کی نظم نگاری، غزل گوئی، افسانہ نگاری، ڈراما نگاری، غیر افسانوی ادب، تنقید نگاری نیز پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے ان کی وابستگی کا تنقیدی محاکمہ مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ بقیہ دو حصوں میں سردار جعفری کی نظم و نثر کا انتخاب پیش کیا گیا ہے، جس سے مونوگراف کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

میں عمر رضا کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے علی سردار جعفری پر مختصر مگر معنویت سے بھرپور مونوگراف تحریر کرنے کی زحمت اٹھائی۔ اس موقع پر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ انھوں نے اس اہم مونوگراف کو بڑے ہی اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ مجھے امید ہے کہ اردو کی ادبی دنیا میں جس طرح علی سردار جعفری مقبول و معروف ہیں اسی طرح کی اس مونوگراف کو بھی مقبولیت حاصل ہوگی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

فکشن

سہیل عظیم آبادی کے منتخب افسانے

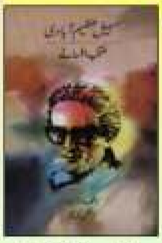

انتخاب اور ترتیب: ارتضیٰ کریم

صفحات: 303، قیمت: 290 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

مبصر: حقانی القاسمی، B-145/8، فورتھ فلور، ٹھوکر نمبر 8 شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

ہندوستان کے معتبر اور موقر ادارہ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا سے پروفیسر ارتضیٰ کریم کی مرتب کردہ 'سہیل عظیم آبادی کے منتخب افسانے' جیسی کتاب کی اشاعت اس لیے ضروری تھی کہ سہیل عظیم آبادی (1911-1979) جیسے اہم افسانہ نگار کی کہانیاں جس حلقے یا طبقے تک پہنچنی چاہیے تھیں وہ نہیں پہنچ سکیں اور نیشنل بک ٹرسٹ کی رسائی اس طبقے تک ہے جس کے موضوعات اور مسائل کے حوالے سے سہیل عظیم آبادی نے بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ دراصل جب کہانیاں یا افسانے کسی خاص حلقے/ طبقے/ زمرے تک محدود ہوجاتے ہیں تو پھر ان افسانوں کی خوبیاں بھی پردۂ خفا میں رہ جاتی ہیں۔ جن افسانوں کے کرداروں اور موضوعات سے زندہ معاشرے کے افراد جڑتے ہیں ان افسانوں کی زندگی بڑھ جاتی ہے اور وہ معاشرے کی اجتماعی سائیکی کا حصہ بننے میں بھی کامیاب ہوجاتے ہیں اور ایسے ہی افسانے اکثر تنقیدی ڈسکورس یا عوامی مباحثے کا حصہ بنتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی جیسے متنوع فن کار کے ساتھ المیہ یہ ہوا کہ ان کے افسانوں کو بہار اور چھوٹا ناگپور کے محدود تناظر میں رکھ کر دیکھا گیا اور پریم چند سے جوڑ کر انھیں دیہی زندگی میں محصور کردیا گیا۔ جبکہ سہیل عظیم آبادی کے افسانوں کے موضوعات میں تنوع ہے۔ انھوں نے دیہی زندگی کے علاوہ شہری زندگی اور خواتین کے مسائل اور موضوعات پر بھی کہانیاں لکھی ہیں۔ عام انسانی زندگی کے مسائل بھی ان کی کہانیوں کا حصہ بنے ہیں۔ اس لیے سہیل عظیم آبادی کو ایک خاص منطقے یا زاویے میں محدود کرکے دیکھنا ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔

سہیل عظیم آبادی کا موضوعاتی جہان بہت وسیع ہے اور ان کا طرز بھی مختلف ہے۔ اسی لیے اردو کے معتبر فکشن ناقد پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سہیل عظیم آبادی کو اپنی جستجو کا خاص مرکز بنایا ہے اور اس متھ کو توڑنے کی کوشش کی ہے کہ سہیل عظیم آبادی کا موضوعاتی دائرہ محدود ہے۔ انھوں نے اپنے بیش قیمت مقدمے میں سہیل عظیم آبادی کے افسانوں کے موضوعاتی تنوع کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے بہت اہم بات لکھی ہے:

''سہیل عظیم آبادی نے خوب لکھا اور اپنے عہد کے زیادہ تر مسائل کو اپنی تحریروں کا موضوع بھی بنایا ہے۔ ان پر خواہ مخواہ ہمارے ناقدین نے پریم چند سے کلی طور پر متاثر ہونے کا دعویٰ کیا یا یہ کہہ دیا کہ پریم چند اگر پورے ہندوستان کے گاؤں کی تصویر پیش کررہے تھے تو سہیل عظیم آبادی بہار کی دیہی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا رہے تھے اس لیے انھیں پریم چند کا پیروکار اور بہار کا پریم چند بھی کہا گیا، جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہے یہ بات جزوی طور پر درست ہوسکتی ہے کلی اعتبار سے نہیں۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے بہار اور چھوٹا ناگپور کو اپنی تحریروں میں نمایاں جگہ دی ہے، مگر ان کی کہانیوں میں پورا ہندوستان اور پورا انسان چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی کہانیاں شہری زندگی کے مسائل، عام انسانوں کے شب و روز، خواتین کی بعض سماجی اور نفسیاتی الجھنوں کو پیش کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔''

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سہیل عظیم آبادی کے افسانوی آرٹ کے حوالے سے بھی بہت سے اہم اشارے کیے ہیں۔ انھوں نے سہیل عظیم آبادی کو ایک سہل اور کامیاب افسانہ نگار قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ان کے افسانوں کی اساسی شناخت شاعری کی اصطلاح میں سہل ممتنع کہی جاسکتی ہے۔ ممکن ہے اردو افسانے کی تنقید میں اس اصطلاح کے استعمال پر روایتی ناقدین پہلو بدلیں مگر راقم السطور کے نزدیک جب میر اور دوسرے شعرا کے یہاں سہل ممتنع میں تہہ دار مضمون اور معنی آفرینی کی گنجائش نکل آتی ہے تو فکشن میں اس اصطلاح سے پرہیز کیوں؟''

میرے خیال میں اصطلاحات اور تراکیب کو کسی خاص صنف سے مختص کرنے کی روش بہتر نہیں ہے۔ اصطلاحات اور تراکیب کو تخصصاتی جبر سے آزاد کیے جانے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے یہ بڑی اچھی بحث اٹھائی ہے اور اس پر اہل نقد ونظر کو خاص طور پر غور کرنا چاہیے کہ لفظوں کی طرح ترکیبوں اور اصطلاحات کو خودمختاری اور آزادی دی جانی چاہیے الا یہ کہ کسی اور صنف میں اس اصطلاح یا ترکیب کے استعمال سے اس کی معنویت مجروح ہوتی ہو یا اسے گھٹن کا احساس ہوتا ہو۔ افسانے کے باب میں سہل ممتنع کا استعمال ممکن ہے کیونکہ شاعری کی طرح بہت سے افسانے بھی سہل ممتنع کے ذیل میں آسکتے ہیں۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم کے انتخاب کردہ اس مجموعے میں سہیل عظیم آبادی کے 28 افسانے شامل ہیں اور یہ الگ الگ موضوعات اور مسائل پر ہیں۔ ان کے افسانوں کی قرأت سے سہیل عظیم آبادی کے موضوعاتی تنوع کا اندازہ لگانا آسان ہوگا۔ ان افسانوں میں جو مسائل اور موضوعات پیش کیے گئے ہیں وہ آج بھی اتنے ہی اہم ہیں۔ تغیراتِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی ترجیحات کے عہد میں بھی ان کہانیوں کی معنویت قائم ہے۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اس انتخاب میں سہیل عظیم آبادی کے وہ افسانے شامل کیے ہیں جو مختلف مقتدر رسائل وجرائد میں بکھرے پڑے تھے۔ اس انتخاب میں جو افسانے شامل کیے گئے ہیں وہ ندیم گیا، چندن دہلی، صبا پٹنہ، ایشیا میرٹھ، ادب لطیف لاہور، ساقی کراچی، داستان لاہور، آجکل دہلی، معاصر پٹنہ، پگڈنڈی امرتسر، شاعر بمبئی، محور دہلی، سیپ کراچی، کتاب لکھنؤ کے علاوہ ان کے مجموعے 'الاؤ' اور 'نئے چہرے' میں شائع ہوئے تھے۔ جن قدیم رسالوں میں یہ افسانے شائع ہوئے ہیں ان میں سے بہت سے رسائل کی فائلیں اہم کتب خانوں میں بھی محفوظ نہیں ہیں اور ان میں سے بعض رسائل سے ہماری نئی نسل بھی واقف نہیں ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سہیل عظیم آبادی کے ان افسانوں کا انتخاب شائع کرکے اردو افسانے کے قاری کو سہیل عظیم آبادی کے فکروفن کے نئے آفاق سے روبرو کرایا ہے۔ اس انتخاب میں سہیل عظیم آبادی کا پہلا افسانہ 'پاگل چچی' بھی شامل ہے۔ جبکہ دوسرے محققین کے نزدیک 'سحر نغمہ' اور 'لالہ صحرا' سہیل عظیم آبادی کی پہلی کہانی ہے۔ لیکن داخلی اور خارجی شواہد سے پروفیسر ارتضیٰ کریم نے 'پاگل چچی' کو پہلا افسانہ قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ جہیز، سرلا کا بیاہ، پیاس، قیدی، چار آنے، دو مزدور، رام اور راون، پھوڑا، اسٹیشن پر، روشنی، کمزوری، الاؤ، جوار بھاٹا، چوکی دار، دبی چنگاری، دونوں غلطی پر تھے، گناہ کی یادگار، مصنف کی زندگی، سڑک بن رہی تھی، رانی، جھوٹے وعدے، کیچڑ، ناک، عجائب خان، گرم راکھ، بدصورت لڑکی، ساوتری جیسے افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کے مطابق سہیل عظیم آبادی نے تقریباً 139 افسانے لکھے ہیں۔ ان میں سے 28 کہانیوں کا انتخاب سہیل عظیم آبادی کے افسانوی رویے، اسلوب اور ان کے طرز فکر کی تفہیم میں معاون ہوسکتا ہے۔

سہیل عظیم آبادی کا تعلق بہار سے تھا مگر وہ اردو کے افسانوی افق کے ایک درخشاں ستارے تھے جن کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کے مطابق بہار میں انھیں محرک افسانہ نگار کی حیثیت حاصل ہے۔ صوبہ بہار کی حد تک وہ ایک رجحان ساز افسانہ نگار بھی ہیں۔ یہاں پروفیسر ارتضیٰ کریم کی اس بات سے اختلاف کیا جانا چاہیے کیونکہ سہیل عظیم آبادی جیسے متنوع صفات فن کار کو بہار تک محدود کرنا بہتر نہیں ہے۔ وہ اردو فکشن کا ایک اہم نام ہیں جنھیں کسی مخصوص علاقے یا دائرے میں قید نہیں کیا

جاسکتا۔ ان کی تخلیقی عظمتوں کی شہادتیں ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔ اس لحاظ سے نیشنل بک ٹرسٹ جیسے ملک گیر ادارے سے 'سہیل عظیم آبادی کے منتخب افسانے' کی اشاعت بہت معنی خیز ہے کہ سہیل عظیم آبادی کو صرف خاص خطے یا طبقے تک محدود کرکے پڑھنے کی روش کو ترک کیا جانا چاہیے اور ان کے افسانوں کی قرأت مجموعی ملکی اور قومی تناظر میں کیا جانا چاہیے تبھی ان کے فکشن کی ساری طرفیں کھلیں گی اور ان کے فن کے تمام جوہر سامنے آئیں گے۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے سہیل عظیم آبادی کے افسانوں کا ایک جامع اور عمدہ انتخاب آج کے عہد کے اس قاری کے سامنے پیش کیا ہے جو سہیل عظیم آبادی کو ایک نئے تناظر اور نئے زاویے میں دیکھنے کا خواہش مند ہے۔

سہیل عظیم آبادی کے ان افسانوں کا ترجمہ انگریزی اور ہندی کے علاوہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں کیا جائے تو سہیل عظیم آبادی کے Creative genius کا صحیح اندازہ ہوگا اور ان کی عظمتوں کی اور بھی جہتیں روشن ہوں گی کیونکہ سہیل عظیم آبادی نے جس طرح کے موضوعات اور مسائل کو اپنے افسانوں کا محور بنایا ہے اور جس اسلوب میں لکھا ہے اس کی پذیرائی شاید دیگر زبانوں میں زیادہ ہوگی۔

تحقیق و تنقید

اردو فکشن کے پانچ رنگ

مصنف: ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

صفحات: 560، قیمت: 600 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر صالحہ رشید، الہ آباد یونیورسٹی

'اردو فکشن کے پانچ رنگ' ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جو حال ہی میں عرشیہ پبلی کیشنز سے طبع ہوکر منظر عام پر آیا ہے۔ یہ پانچ سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ حسب عنوان اردو فکشن کے پانچ رنگ میں داستان، ناول، ناولٹ، افسانہ اور افسانچہ جیسی اصناف ادب پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

فکشن تنقید پر اس سے قبل بھی ان کی کئی کتابیں جیسے جدیدیت اور اردو افسانہ (2001)، ترقی پسند اردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار (2002)، اردو افسانہ: تعبیر و تنقید (2006)، اردو فکشن: تنقید و تجزیہ (2012) وغیرہ زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کی تازہ کتاب کا وصف یہ ہے کہ اس کی ابتدا انھوں نے داستان سے کی ہے۔ حالانکہ اس ضخیم کتاب میں داستان جیسی اہم صنف کے لیے فقط پچیس صفحات مختص ہیں۔ جن میں اردو داستان کے ارتقا کے ساتھ ساتھ سب رس اور باغ و بہار پر انتہائی دلچسپ گفتگو شامل ہے۔

کتاب میں ناول پر مبنی حصہ ایک سو پچیس صفحات پر ممتد ہے۔ 'اس میں اردو ناول سمت و رفتار' عنوان سے ایک مضمون ہے جس میں ڈپٹی نذیر احمد سے لے کر آج تک کے ناول نگاروں کا تذکرہ ہے۔ اس میں جہاں مشاہیر کے نام لیے گئے ہیں وہیں ایسے ناول نگاروں کا بھی ذکر شامل ہے جنھوں نے اچھی تحریر تو پیش کی لیکن شہرت کی دہلیز پر اپنے قدم نہ رکھ سکے۔ یہ ڈاکٹر اسلم کا بڑا کارنامہ ہے۔ ساتھ ہی پاکستان کے ناول نگاروں کے بھی نام درج ہیں جو ناول کی تحقیق میں مفید ثابت ہوں گے۔ نئے ناول کا اسلوب، نئے ناول کا نیا پن، نئی صدی کا نیا ناول وغیرہ مضامین اپنی نوعیت میں منفرد ہیں۔ ڈاکٹر اسلم کا خاصہ ہے کہ وہ جس صنف پر گفتگو کرتے ہیں اسے عصری تناظر میں ضرور پرکھتے ہیں اور حال کے لکھنے والوں سے قاری کو واقف کرا دیتے ہیں۔

کتاب کا اگلا حصہ ایسی صنف ادب پر مبنی ہے جس کی ہیئت کا ابھی حتمی تعین نہیں ہو سکا ہے اور وہ ناولٹ ہے۔ اردو میں ناولٹ نگاری کا آغاز و ارتقا عنوان سے ایک مضمون شامل ہے جس کے توسط سے ناول اور ناولٹ کے فرق کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

لندن کی ایک رات سے بات شروع کرکے رحمن عباس، شائستہ فاخری، محمد علیم، نصرت شمسی، اقبال مجید اور غضنفر تک آ گئی ہے۔

لندن کی ایک رات: ایک رومان انگیز ناولٹ، بیانات: رومان اور فلسفے کا ترجمان جدید ناولٹ، اوڑھنی: عورت کی عزت و عصمت کا شامیانہ عنوان سے تین ناولٹ کے تجزیے شامل ہیں جن میں تازہ لفظیات کے دخول، موضوعات اور اسلوب میں تبدیلی پر فکر مندی کا اظہار ہے۔ ڈاکٹر اسلم کی یہ فکر مندی ناولٹ پر مزید گفتگو اور تحقیق کی دعوت دیتی ہے۔

اس کے بعد وہ افسانے کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ خود بھی ایک اچھے افسانہ نگار ہیں اور ان کے مطابق اکیسویں صدی افسانوں کی صدی ہے، اس لیے اس کتاب میں افسانے پر دو سو بیس صفحات میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اردو افسانہ: آغاز و ارتقا میں اردو افسانے کے اولین نقوش سے لے کر انٹرنیٹ، فیس بک، افسانے کے آڈیو البم اور افسانہ کلب تک کی بات کی ہے۔ وہ افسانے کا مستقبل موضوع اور فن دونوں اعتبار سے تابناک دیکھتے ہیں۔ ان سے متعلق کئی مفید مضامین کا احاطہ اس باب میں کیا گیا ہے۔ 'اکیسویں صدی میں اردو افسانہ' اپنی نوعیت کا ایک منفرد مضمون ہے۔ اس میں افسانوں میں در آئے تازہ مسائل اور موضوعات انتہائی سلیقے سے زیر بحث آئے ہیں۔

یہ اقتباس پریم چند، پریم چند تنقید، ماضی اور حال کی کیفیات اور ان کے تقاضے وغیرہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس باب میں انھوں نے دو افسانوی خاکے 'کہانی کا درویش: جوگندر پال' اور 'م۔ ناگ کی خالی چوتھی سیٹ' عنوان سے پیش کیے ہیں جو انتہائی پر لطف ہیں۔ جن افسانوں کے تجزیے شامل ہیں وہ موضوع کے اعتبار سے متنوع ہیں۔ انھیں ان کی خصوصیات کی بنا پر انتخاب کیا گیا ہے نہ کہ لکھنے والے کے نام کا خیال پر۔ ان کے مطابق فکشن کی زبان ہر قدم چست و درست ہونی چاہیے۔

افسانچہ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، ہیئت کے اعتبار سے افسانے کا چھوٹا روپ ہے۔ ہم کتابچہ، قالیچہ، روزنامچہ جیسے الفاظ سنتے ہی رہتے ہیں۔ دراصل چہ کا لاحقہ تصغیر کا اشاریہ ہے۔ چونکہ یہ صنف اپنی ساخت میں کوتاہ ہے، شاید اسی لیے اس کتاب میں بھی اسے محض پچیس صفحات میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو، اردو افسانچہ: آغاز و ارتقا عنوان سے جو گفتگو ہوئی ہے وہ کارآمد ہے۔ اس میں منٹو کے سیاہ حاشیے اور البنا کا ذکر کرکے کئی زاویے سے افسانچہ کی ساخت اور دیگر لوازم پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہاں بھی ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کا تاریخ وار محاکمہ موجود ہے جس سے افسانچہ نویسی کی شروعات، مختلف جرائد و رسائل میں ان کی اشاعت اور دسمبر 2012 میں باقاعدہ ایک افسانچہ اکادمی کی چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں تشکیل کی اطلاع فراہم ہوتی ہے۔

افسانچہ کو اردو فکشن میں اس کا خاطر خواہ مقام دلانے کی کوشش جاری ہے۔ یہ ایک دن کا کام نہیں ہے۔ اس جانب مسلسل پر خلوص کوشش عنقریب اپنے مقصد کو پا ہی لے گی۔ غرض کہ افسانچہ پر جب بھی گفتگو ہوگی، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی کتاب میں درج خیالات ہمیشہ رہنمائی کریں گے۔

کتاب اپنے عنوان کے اعتبار سے یہاں پہنچ کر ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ابھی موصوف کے ترکش میں کچھ تیر بچے رہ گئے تھے، سو وہ بطور ضمیمہ عینی آپا کی فکشن نگاری، 2015 کا فکشن: ایک جائزہ، 2016 کا فکشن: ایک جائزہ کے عنوان سے شامل کتاب ہوئے۔ مجملہ 'اردو فکشن کے پانچ رنگ' فکشن سے متعلق تمام ضروری امور پر معتبر دستاویزی حیثیت کی حامل کتاب ہے جو اپنے وجود میں اردو فکشن کے حوالے سے متعدد ادبی حقائق سموئے ہوئے ہے۔ بالخصوص اردو فکشن کی تازہ ترین اطلاع فراہمی کے اعتبار سے بہت وقیع ہے۔ امید ہے یہ کتاب نئی نسل کے لیے تحقیق، تنقید و تجزیے کے نئے در وا کرنے کے ساتھ جویان دانش کے لیے مشعل راہ بھی ثابت ہوگی۔

نقش معنی

مصنف: رؤف صادق
صفحات: 428، قیمت: 216 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: فیروز عابد، 12-3-H/1، پٹواری بگان لین،
کولکاتا۔ 700009 (مغربی بنگال)

رؤف صادق مصور اور ایک اچھے شاعر ہیں۔ نوک قلم پر لہوان کا شعری مجموعہ ہے۔ 'نقش معنی' کے سلسلے میں ان کا یہ بیان بھی اہم ہے۔ "نقش معنی' کے مضامین مختلف نوعیت کے ہیں۔ اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر لکھے گئے میرے مضامین میں کمیاں رہ گئی ہیں کیونکہ بہت سا مواد میری دسترس سے باہر رہا۔ ادھوراپن ہی زندگی کا حصہ ہوتا ہے۔ یہی میرے مضامین کا قصہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی مضمون کا حصہ یا مضمون باذوق قاری کو پسند آجائے اور اس کے دل کو چھو جائے۔ یہی میری محنت کا ثمرہ اور نقش معنی کا حاصل ہوگا۔"

رؤف صادق نے نقش معنی کو مختلف عنوانات کے تحت سجایا ہے۔ 'رنگ اور روشنی' اس عنوان کے تحت فن افسانہ پر چودہ مضامین ہیں۔ 'رنگ اور نقش' اس میں تیرہ افسانوں کے تجزیے ہیں۔ 'رنگ اور آہنگ' اس میں مختلف شاعروں پر چودہ مضامین ہیں۔ رنگ رچنا میں 3 نظموں (حمید سہروردی، حامد اکمل اور قطب سرشار) پر محاسبہ ہے۔ 'رنگ آمیزی' اس عنوان کے تحت ڈاکٹر وہاب عندلیب کی خاکہ نگاری، ڈاکٹر غضنفر اقبال کی کتاب معنی مضمون اور گلبرگہ کے فن کاروں پر ایک گفتگو ہے۔ 'رنگ دار' اس میں رؤف صادق نے غزل اور مصوری، کتھک رقص اور ٹھمری پر اپنے خیالات نقش کیے ہیں۔ 'رنگ برنگ' اس عنوان کے تحت مختصر سات تبصرے ہیں۔ رنگ نما میں شاہق بجنوری، رؤف خوشتر احمد، عثمانی، جاوید ندیم، سلیم بریلوی، شجاع الدین شاہد، سردار سلیم، اطہر اعظمی، حبیب الہ آبادی، رفیق سوداگر، شاذ رمزی، ندیم مرزا، جمیل مرزا، سجاد اختر، ظفر خاں ناز، ن جاوید، شکیل احمد خان، عبدالشکور قاسمی، ارشد صدیقی، حسین اختر، مجتبیٰ نجم، اور غلام ثاقب کو قلم کار کی حیثیت سے یہ پہچان کروائی ہے۔

اس کتاب کا آخری باب 'رنگِ دگر' ہے جس میں انھوں نے شرون کمار ورما، اختر یوسف، حیدر سہروردی اکرام باگ، شوکت حیات، انور قمر، م ناگ، نورالحسنین، عارف خورشید، شائستہ فاخری، مقصود اظہر، اشتیاق سعید، حمید سہروردی، حامد اکمل اور قطب سرشار کے افسانوں اور نظموں پر اظہار خیال کیا ہے۔

جدید افسانے سے متعلق رؤف صادق لکھتے ہیں: "پیراجی سگارا کی 'کولاژ' کھڑی اور کیلوں کی بنی پینٹنگ میں اداس سورج چیختے چلاتے گھوڑوں کے بے ترتیب اشکال جگہ جگہ پیوست سورج مکھی کے پھول اور کیلیں، عالم انسانیت پر ہورہے ظلم و جارحیت کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں جبکہ جنسی پر یمو کی تصویر 25 اور وکاس بھٹاچاریہ کی 'تاثیر' میں فرد کی داخلی حسیت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔"

رؤف صادق نے جدید افسانے میں منظر کشی، علامت، کردار نگاری، حرکات و سکنات پر بھی اپنی رائے دی ہے۔ رفیق جعفر، احمد رشید، مظہر سلیم، مقصود اظہر، ایم مبین اور مسرور تمنا کے افسانوں میں تجربہ، مرکزی خیال، اسلوب کی نئی یافت اور افسانوں میں زیریں لہریں کا ذکر بہت خوبصورتی اور ایمانداری سے کیا ہے۔

شرون کمار ورما، اختر یوسف، حمید سہروردی (دو افسانے)، اکرام باگ، شوکت حیات، انور قمر، م ناگ، نورالحسنین، عارف خورشید، شائستہ فاخری، مقصود اظہر اور اشتیاق سعید کی کہانیوں پر مختصر مگر جامع تبصرہ کیا ہے۔ ان تبصروں میں رؤف صادق نے لفظوں سے پینٹنگ کی ہے۔

رنگ اور آہنگ کے تحت اصناف سخن، سرسری مطالعہ پر رؤف صادق کا مضمون معلوماتی ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی میں شائع ہوا۔ اصناف سخن پر گفتگو کرتے ہوئے رؤف صادق نے عتیق اللہ، خلیل مامون، احسن یوسف زئی، عبدالرحیم نشتر، جاوید ناصر، عبدالاحد ساز، جمیل مجاہد، صابر فخرالدین، عثمان جوہری، اقبال خسرو قادری، قسیم اعظمی، شکیل ابن شرف اور عبدالخالق ساغر کی شاعری پر تین تین، چار چار صفحوں کا مضمون لکھا ہے جس میں صفحات کا پھیلاؤ تو نہیں، معنی کی گہرائی ہے۔

'رنگ رچنا' کے تحت رؤف صادق نے حمید سہروردی، حامد اکمل اور قطب سرشار کی نظموں پر اپنے تاثرات بیان کیے ہیں۔ تاثرات مختصر ہیں۔

'رنگ آمیزی' میں ڈاکٹر وہاب عندلیب کی خاکہ نگاری، ڈاکٹر غضنفر اقبال کی کتاب معنی مضمون اور گلبرگہ کے فن کاروں پر رؤف صادق نے اپنی رائے دی ہے۔ وہاب عندلیب کی خاکہ نگاری پر رؤف صادق نے ان کے لہجے کی شگفتگی کا ذکر کرتے ہوئے ان کے رواں اسلوب کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے جیسے اسکرین پر کوئی فلم چل رہی ہے۔

رؤف صادق نے غضنفر اقبال کی کتاب معنی مضموں کی تحریر کو، کولاج کہا ہے— ایسا اس لیے کہا ہے کہ یہ کتاب تبصرہ اور مضمون کی ملی جلی شکل ہے۔ گلبرگہ کے فن کار میں خواجہ بندہ نواز، گیسو دراز کو حوالہ بنا کر رؤف صادق نے حمید سہروردی، وہاب عندلیب، حامل اکمل، اکرام باگ، خالد سعید، سید مجیب الرحمٰن، منظور وقار، انیس صدیقی، صابر فخرالدین اور غضنفر اقبال کی جستجو، شوق اور ادب میں ان کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

'رنگ دار' میں رؤف صادق نے غزل اور مصوری کو اپنے دل کے بہت اندر لے جاکر ٹٹولا— شاعر رؤف صادق نے مصور رؤف صادق کے ساتھ مل کر غزل کی رچنا کی اور کنوس پر رنگوں کی آمیزش سے زندگی نامہ لکھا اور پھر آخر میں یہ کہا "ہم سب اس کشتی کے سوار ہیں جس کو ہوائیں اپنی مرضی سے جدھر چاہے لے جارہی ہیں۔ ہماری سمت متعین نہیں ہے۔ بادبان کھلے ہوتے ہیں۔ 'رنگ برنگ' میں خواجہ منظور الدین، سلیم شہزاد، مظہر سلیم، پروفیسر عبدالرب استاد، سید فاروق قادری، ...... دلکش، اور چشتی سلیم بے درد کی کتابوں پر تبصرے ہیں۔ ان تبصروں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بہت مختصر ہیں لیکن باوزن ہیں۔

رنگ نما میں قلم کار حضرات کا ذکر ہے۔ ہم اس سے قبل ان حضرات کا ذکر کر چکے ہیں۔ ہم یہاں اتنا عرض کرنا چاہیں گے کہ رؤف صادق نے ان کا ذکر دل کی گہرائیوں سے انتہائی محبت کے ساتھ کیا ہے۔

رؤف صادق نے انتہائی ایمانداری اور لگن سے 'نقش معنی' کو آراستہ کیا ہے۔ زندگی جینے اور حوصلوں کو پر دینے کے لیے تنقید کو تیر نہیں محبت اور حوصلہ چاہیے۔ رؤف صادق نے اپنی کتاب میں 'تخلیق اور خالق' کو اپنے زاویہ نگاہ سے پرکھا ہے جو شاعر سے زیادہ مصور کی ہے۔ اس عمل میں وہ کامیاب رہے ہیں۔

شعور تنقید

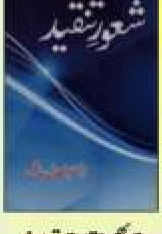

مصنف: ڈاکٹر افضال عاقل
صفحات: 496، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: انجمٰی پبلی کیشن، کشیپ چند اسٹریٹ، کلکتہ 700009
مبصر: ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف، میاں سرائے، سنبھل، یوپی۔

اردو میں تنقید کے حوالے سے افضال عاقل کا نام اب کسی طرح بھی محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ کولکاتا کے بھیرب گنگولی کالج کے شعبۂ اردو میں تدریسی خدمات انجام دینے کے ساتھ ہی تصنیف وتالیف کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے تھوڑے ہی عرصے میں متعدد کتابیں اردو دنیا کو عطا کر کے اپنا نام اردو ادب کے جدید صفحۂ قرطاس پر

رقم کرادیا ہے۔ تحقیقی وتنقیدی مضامین ومقالات پر مشتمل ان کی تازہ تخلیق 'شعور تنقید' اس وقت تبصرہ کی غرض سے راقم کے پیشِ نظر ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے نثری وشعری ادب پاروں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جن کا سرسری تعارف اس طرح ہے۔

باب اول 'تحقیق وتنقید' کے عنوان سے ہے۔ جس میں بنگال کی ادبی اصناف جیسے غزل، افسانے، تنقید، صحافت، ڈرامہ، ادب اطفال، ماہیے اور بنگال کی شاعرات کے حوالے سے اپنے رشحاتِ قلم پیش کیے ہیں۔ اسی حصے میں نئی صدی کا انسان اور اس کا ادب، مولانا ابوالکلام آزاد: قومی یکجہتی کے علم بردار، اور تحریک آزادی میں نثری وشعری ادب کا کردار کے عنوانات سے تین اہم مضامین بھی ہیں۔ باب دوم 'حمد ونعت' کے عنوان پر ہے۔ جس میں علقمہ شبلی: وادیِ حمد ونعت میں اور عقیدت کا آئینہ گر: ناز قادری کے عنوانات سے مذکورہ شعرا کے حمدیہ ونعتیہ اسلوب کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کتاب کا تیسرا باب قدرے تفصیلی واہم ہے۔ جس میں 'شاعری کی تنقید' کے عنوان سے اردو کے اہم شعراء کے کلام، تخلیقات اور فکروفن پر تحقیقی وتنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس حصے میں احمد فراز، مظفرحنفی، اعزاز افضل، مضطرعظیم آبادی، نصر غزالی، ابراہیم اشک، شاہد جمیل، حشمت کمال پاشا، حشم الرمضان، ارمان شام نگری، نسیم فائق اور کمال الدین کمال کے شعری متن پر تنقیدی مضامین پیش کیے گئے ہیں۔ اس حصے میں مصنف کتاب نے مضامین پر سرسری نظر ہی نہیں ڈالی ہے بلکہ شاعر کے شعری اسلوب کی تفہیم اور اس کی جمالیاتی قدر کے نقوش بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ باب چہارم 'نثر کی تنقید' ہے۔ اس باب میں اردو ادب کے قدآور تخلیق کار: علقمہ شبلی، ادب کا ایک روشن باب: حامدی کاشمیری، میزان قدر، ادب کا آگہی نامہ، سچ کا ورق: زندگی کا استعارہ، ہجرت کے تماشے، ایک تجزیہ، برف میں چنگاری، ایک جائزہ، 'چلتے ہیں تو چمن کو چلیے'، کے تناظر میں، ناول اور مشتاق انجم کا 'رانگ نمبر'، عکس درعکس، تنقیدی جائزہ، آگہی گر نہیں کا ناقد: کلیم حاذق اور صابرہ خاتون حنا کا تخلیقی شعور مضامین دیے گئے ہیں۔

کتاب کا آخری باب 'باب پنجم' ہے جس میں میر، غالب، اقبال کے حوالے سے اردو شاعری کے سرخیل ادب کے اسالیب اور فکرونظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب کے مضامین کے عنوانات یہ ہیں۔ مجھ کو شاعر نہ کہو میر، میر کی مثنوی نگاری، غالب کا انداز بیان، غالب بحیثیت مکتوب نگار، اقبال کی غزل اور اقبال کی قومی ووطنی شاعری۔ تینوں ہی شاعروں پر دو دو مضامین دیے گئے ہیں۔ اس طرح اس حصے میں کل چھ مضامین ہیں۔ جن میں محدود الفاظ میں مذکورہ شعراء کے فکروفن کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس کتاب میں شامل مضامین کے معیار کو پرکھنے اور افضال صاحب کے اسلوب تنقید کو سمجھنے کے لیے ایک مضمون 'احمد فراز: دریدہ پیرہن کا شاعر' پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ جس میں موصوف نے احمد فراز کے فن کو پرکھنے کے لیے ان کی فکرونظر کا عمیق جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے شاعری کے اصل مغز 'عشق' کا جائزہ لیتے ہوئے احمد فراز کی غزلیات پر نظر ڈالی ہے۔ ان کے الفاظ میں ''غزل کے حوالے سے فراز نے انسانی زندگی اور اس کے ماحول کے جداگانہ انداز کو نمایاں کیا ہے۔ ان کے اشعار میں معانی کی بیک وقت متعدد سطحیں ابھرتی ہیں۔ جن سے ان کے عہد کے کئی رجحانات ومیلانات کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔'' اسی طرح آپ اپنے ایک اور مضمون 'اقبال کی قومی ووطنی شاعری' میں اقبال کی نظم نگاری کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ ''اقبال کی نظموں کی ایک نہایت نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں غنائیت یعنی نغمگی بہت زیادہ ہے۔ نیز ان کی نظموں میں تمثیل کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ انھوں نے استعارہ اور تشبیہ کی مدد سے نظم میں زندگی کی تصویر اتاردی ہے۔'' افضال صاحب نے اقبال کے کلام سے کچھ نظمیں 'سوامی رام تیرتھ'، رام، ہمالہ، جگنو، ایک آرزو، تصویر درد، شکوہ، جواب شکوہ، نیا شوالہ اور ہندوستانی بچوں کا گیت سے اقتباسات پیش کیے ہیں اور پھر ان پر ناقدانہ بحث کرکے ان کے محاسن بیان کرتے ہوئے اردو ادب میں ان کا مقام متعین کیا ہے۔ ان نظموں کے ذریعہ وہ اقبال کے جذبۂ حب الوطنی کو اجاگر کرنے کے ساتھ ہی فطرت کے تئیں بھی ان کے پاکیزہ جذبات کو واضح کرتے ہیں۔ اور اقبال کو فطری اور فطرت کا شاعر ثابت کرتے ہیں۔ جو اقبال کی شاعری کی اصل روح ہے۔

انھوں نے ان مضامین میں صرف اپنی رائے ہی قلم بند نہیں کی بلکہ دیگر اساطین ادب اور قلم کاروں کے اقوال بھی رقم کردیے ہیں۔ جن سے ان کے زیرِ قلم مصنف، شاعر اور ناقد پر دوسرے حضرات کی آرا بھی قارئین کے سامنے آجاتی ہیں۔ اس طرح کتاب کے مضامین کو تنوع حاصل ہونے کے ساتھ ہی صحت ومعیار بھی حاصل ہوجاتا ہے اور قاری کو کسی شخصیت کے حوالے سے متفرق حضرات کے اقوال بھی پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ یہ خصوصیت اکثر مضامین میں دیکھنے کو مل جاتی ہے، جو ایک طرح سے افضال عاقل صاحب کا اعجاز قلم ہے۔ جو ان کے زورِ تحریر کو تقویت عطا کرنے کے ساتھ ہی ان کے معیارِ تنقید کو بھی رفعتیں اور بلندیاں عطا کرتا ہے۔

مضامین کی انھیں خصوصیات کی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ زیرِ تبصرہ کتاب اپنے موضوع پر شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور ہر طرح کی فنی اور معنوی خامیوں سے پاک ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ تنقیدی ذوق رکھنے والے اردو قارئین اس کتاب کو پسند کریں گے اور مصنف کو حوصلہ افزائی سے نوازیں گے۔

ہمارے عہد کے نعت گو

مصنف: ڈاکٹر تابش مہدی، ترتیب وتدوین: شاہ اجمل فاروق ندوی

صفحات: 160، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: ادبیاتِ عالیہ اکادمی، نئی دہلی

مبصر: عبدالرزاق زیادی، 204، مہاندی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی 67

ڈاکٹر تابش مہدی کا نام اردو کے علمی وادبی حلقوں میں کئی حیثیتوں سے مسلم ہے اور میں بھی ان کو ایک عرصے سے جانتا ہوں۔ قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک معتبر ناقد وادیب اور صحافی بھی ہیں۔ اگرچہ انھوں نے کم عمری ہی میں اشعار کہنے شروع کردیے تھے اور مختلف دینی وادبی پروگراموں میں شرکت کرنا ان کے معمول کا حصہ بن گیا تھا مگر اپنی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز اپنے پہلے شعری مجموعہ 'نقش اول' سے 1970 میں کیا۔ اس مجموعے کے منظرعام پر آتے ہی وہ ایک شاعر کی حیثیت سے کافی معروف ہوگئے اور پھر یکے بعد دیگرے ان کے متعدد شعری مجموعے سامنے آتے چلے گئے۔ یوں تو ان کے یہاں شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی نظر آتی ہے اور وہ ہر صنف میں اپنے علیحدہ رنگ وآہنگ کی وجہ سے پہچانے بھی جاتے ہیں لیکن پھر بھی ان کی بنیادی شناخت ایک غزل گو شاعر کی ہی ہے اور کئی ایک غزلوں کے مجموعے بھی دستیاب ہیں۔ مگر غزلوں کے بعد جس صنفِ سخن کی طرف ان کا رجحان نظر آتا ہے وہ ہے نعت گوئی۔ اس میں بھی انھوں نے اپنا شعری جوہر خوب دکھایا ہے۔ لمعاتِ حرم، سلسبیل، صبحِ صادق اور طوبیٰ ان کے وہ شعری مجموعے ہیں جن میں ان کے صرف نعتیہ کلام ہی شامل ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ ابتدا ہی سے ڈاکٹر تابش مہدی کا میلان تنقید کی طرف بھی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک تحقیق وتنقید میں ان کی 20 کے قریب کتابیں سامنے آچکی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ان کی نووارد کتاب 'ہمارے عہد کے نعت گو' بھی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب 'ہمارے عہد کے نعت گو' دراصل ڈاکٹر تابش مہدی کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ادبیاتِ عالیہ اکادمی کی بزم شہباز، جس کے وہ خود بانی بھی

ہیں، کی ایک سیریز کے تحت گا ہے بگا ہے مختلف نعت گو شعرا پر پیش کیے تھے اور جنھیں اب ادبیات عالیہ اکادمی کے سکریٹری شاہ اجمل فاروق ندوی نے مرتب و مدون کر کے کتابی شکل میں شائع کرا دیے ہیں۔ مرتب کے 'سخنِ گفتنی' اور مصنف کی 'نعت: مفہوم اور تقاضے' پر تفصیلی گفتگو کے بعد کتاب میں چودہ نعت گو شعرا حافظ رؤف امروہوی، مولانا ابوالوفا عارف شاہ جہان پوری، مولانا ماہر القادری، زائرِ حرم حمید صدیقی امروہوی، مولانا بلالی علی آبادی، مولانا ثانی حسنی ندوی، مولانا ابوالمجاہد زاہد، ہمسر قادری، مظفر وارثی، اعجاز رحمانی، ابرار کرت پوری، ناز قادری اور افسر امروہوی پر ڈاکٹر تابش مہدی کے گراں قدر تحقیقی و تنقیدی مقالات شامل ہیں۔ ان مقالات کے علاوہ کتاب کے آخر میں 'چند نعت گویانِ امروہہ' کے عنوان سے بھی ایک مضمون شامل کتاب ہے، جس میں امروہہ کے ان چند اہم اور معروف نعت گو شعرا پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن پر علیحدہ طور پر اس کتاب میں کوئی مقالہ یا مضمون موجود نہیں ہے۔ ان نعت گویانِ امروہہ میں مولانا نسیم احمد فریدی، سیفی امروہوی اور بقا امروہوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر تابش مہدی چونکہ خود ایک معتبر ناقد اور اہم نعت گو شاعر ہیں اور وہ نہ صرف تنقیدی مباحث اور شاعری کے رموز و نکات سے بخوبی واقف ہیں بلکہ فن نعت گوئی کے تمام تر لوازمات سے بھی وہ پوری طرح باخبر ہیں۔ ان کے نزدیک نعت محض دماغی ورزش کا نام نہیں، بلکہ نعت دراصل اللہ کے رسولؐ سے عقیدت و محبت اور قلبی تعلق کا اظہار ہے۔ چنانچہ انھیں نکات کو سامنے رکھتے ہوئے مصنف موصوف نے نہ صرف متذکرہ بالا نعت گو شعرا کا ایک تعارف بلکہ ان کی نعتیہ شاعری کا تجزیہ بھی ہمارے سامنے پیش کیا ہے جو کہ کئی اعتبار سے بہت ہی اہم ہے۔ بقول مرتب کہ "ہمارے عہد کے نعت گو، میں گزشتہ آٹھ دہائیوں کے دوران نعت کے میدان میں تابندہ نقوش چھوڑنے والے نعت گو شعرا کے نعتیہ رویوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مطالعے کی اہمیت اس لیے بھی دو چند ہو جاتی ہے کہ اس کے محترم و مکرم مصنف ڈاکٹر تابش مہدی ایک معتبر نقاد بھی ہیں اور جانے پہچانے نعت گو بھی۔ انھوں نے ایک طرف معاصر اردو نعت کو ایک منفرد رنگ عطا کیا ہے تو دوسری طرف بڑی تعداد میں نوجوان شعرا کی تربیت کر کے انھیں صفِ نعت گویاں میں شامل کیا ہے۔"

بلاشبہ قدیم ادوار کی طرح موجودہ دور میں بھی شعرا کی ایک بڑی تعداد ایسی موجود ہے جو نعت کو بطور ایک صنف برت رہی ہے اور ان شعرا پر لکھا جانا اس وجہ سے بھی بے حد ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ ابھی تک اس پر کوئی ایسی کتاب سامنے نہیں آسکی ہے، جس میں ہمارے عہد کے نعت گو شعرا کو باقاعدہ طور پر جگہ دی گئی ہو۔ پیش نظر کتاب کو دیکھ کر بادی النظر میں خیال آتا ہے کہ اس میں موجودہ عہد کی نعت گوئی کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ ضرور موجود ہوگا۔ لیکن جب ہم اس کتاب کی ورق گردانی کرتے ہیں تو یکلخت ہمارے خیال پر پانی پھر جاتا ہے کیونکہ اس میں ہمیں اس نوع کا کام نظر نہیں آتا جس طرح کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ تو محض چند نعت گو شعرا اور وہ بھی کچھ خاص علاقوں سے تعلق رکھنے والوں تک ہی محدود ہے۔ مزید برآں اس میں ہمارے عہد کی نعت گوئی کا سرسری جائزہ تک موجود نہیں ہے۔ اس لیے مشمولات کے اعتبار سے اس کتاب کا نام 'ہمارے عہد کے نعت گو' کی بجائے 'ہمارے عہد کے کچھ اہم نعت گو' ہوتا تو بہتر ہوتا۔

لیکن باوجود اس کے زیر تبصرہ کتاب 'ہمارے عہد کے نعت گو' اردو کے سرمائے میں ایک قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے لیے مصنف و مرتب دونوں ہی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ زبان و بیان کے علاوہ ظاہری اعتبار سے کتاب بہت ہی عمدہ اور پرکشش ہے۔ سرورق سادگی کے باوجود حد درجہ جاذب نظر اور خوبصورت ہے۔ کاغذ بھی بہتر استعمال ہوا ہے۔ نیز ضخامت کے اعتبار سے قیمت بھی مناسب ہے۔ کتاب کے بیک پیج پر مرتب شاہ اجمل فاروقی ندوی کی تحریر کتاب کی زینت کو بڑھا رہی ہے۔ قوی امید ہے کہ قارئین اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اہل علم کے مابین اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

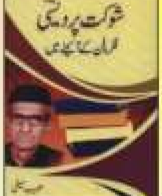

شوکت پردیسی فکر وفن کے آئینے میں

مصنف: حبیب سیفی

صفحات: 294، قیمت: 260 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ماسٹر نثار، 413 مین روڈ کردم پوری، دہلی 110094

ادب بڑی مشکل سے تخلیق پاتا ہے، خون جگر جلا کر اس بزم میں روشنی ہوتی ہے، اس روشنی میں صرف لوگ اپنے چہرے نہیں دیکھتے بلکہ قومیں اپنا مقدر تلاشتی ہیں، ماضی وحال کے جھروکوں سے لوگ اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کا مشاہدہ کرتے ہیں، نسلیں اپنے ماضی سے حال اور اپنے بہتر مستقبل کے لیے رہنما اصول حاصل کرتی ہیں۔ حبیب سیفی نے شوکت پردیسی کے نام سے ہمیں ایک ایسی شخصیت سے روشناس کرایا ہے جن کو نہ زندگی میں وہ پذیرائی حاصل ہو سکی جس کے وہ حق دار تھے اور نہ ہی بعد از مرگ وہ اس طرح نوازے گئے جس طرح نوازے جانے چاہیے تھے۔ حبیب سیفی کی اب سے قبل تین کتابیں جن میں ایک غزلیات کا مجموعہ اور دو کتابیں ادب اطفال کی نظموں کے حوالے سے منظر عام پر آچکی ہیں۔ حبیب سیفی نے شوکت پردیسی کے تعلق سے تنقیدی اور تجزیاتی کام کر کے ہمیں شوکت پردیسی سے متعارف کرایا ہے۔ بلاشبہ شوکت پردیسی شاعری کے حوالے سے بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں، حبیب سیفی نے فکر وفن کے آئینے میں شوکت پردیسی کی تصویر کو قارئین کے سامنے پیش کر کے نئی اسکین بلکہ یہ کہیے کہ ایم آر آئی کر کے کمال کی منظر کشی کی ہے اس کی کھلی مثال کتاب تو ہے ہی لیکن گواہ ڈاکٹر عبید الغفار، اور ڈاکٹر تابش مہدی کی مختصری وہ تحریریں ہیں جو کتاب میں شامل ہیں جسے کتاب کی تعارفی تقریظ کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ دراصل جب ایک قلمکار کسی موضوع پر قلم کو حرکت دیتا ہے تو اس کے اندر جو جوہر تخلیقی و تنقیدی ہوتے ہیں وہی باہر آتے ہیں۔ حبیب سیفی نے شوکت پردیسی فکر وفن کے آئینے میں کی تصنیف و تالیفی دور میں شروع سے آخر تک اس کیفیت سے کتاب کو سجایا ہے جس سے شاعری میں حسن کاری آتی ہے۔ تجزیہ نگاری کی حیثیت سے بلاشبہ حبیب سیفی نے جس شخصیت پر اپنا قلم اٹھایا ہے وہ حق دار کو حق دینے کی نیک و بہتر کاوش کا درجہ رکھتی ہے۔ انھوں نے شوکت پردیسی کو بڑی گہرائی سے پڑھا ہے، سمجھا ہے، اور تنقیدی نگاہ سے ان کی شاعری کا جائزہ بھی لیا ہے۔ تبھی ہم جان پائے کہ شوکت پردیسی کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے، غزلیں بھی کہتے تھے اور نظمیں، گیت، قطعات اور رباعی وغیرہ بھی، دلچسپ بات یہ ہے کہ کئی فلموں کے لیے نغمے بھی لکھے مگر گمنامی میں پڑے رہے۔ ادب اطفال کی نظمیں بھی لکھیں جو آپ کی مہارت فن کی اور کثرت مشق و ممارست کی دلیل ہے کہ ہم انھیں جس صنف ادب میں دیکھتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے پوری توجہ اسی صنف پر صرف کی ہے۔ اس کے باوجود میرا خیال ہے کسی کو پڑھ لینا کافی نہیں، بلکہ پڑھ کر تنقید اور تجزیہ کا حق ادا کرنا کمال ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ کتاب کی نثر کا مطالعہ کرتے جائیے اور زبان و بیان سے محظوظ ہوتے رہیے کیونکہ حبیب سیفی کی تحریر برجستگی پختگی اور سلاست سے پُر ہے، اور جگہ جگہ کلاسیکل الفاظ کا ذخیرہ آپ کی تحریر میں دیکھنے کو ملتا ہے، جس کو بروقت استعمال کر کے تحریر کے حسن کو دوبالا بنا دیا ہے۔

کتاب میں فکر کا موضوع بنے شوکت پردیسی قادر الکلام شاعر ہیں اپنی بات کو یا اس خیال کو وسعت دیتے ہوئے یا یہ کہہ لیجیے کہ خفیف سے خفیف قلبی کیفیت کو نظم کا جامہ پہنا کر پیش کرنے کا ہنر شوکت کو آتا تھا، صنفی اعتبار سے نظم کے پہلو کا تجربہ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں چند مصرع حوالے کے طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

کس قدر کیف میں ڈوبے ہوئے ہیں لیل ونہار
روح کو بھی ہے خوشی دل کو بھی حاصل ہے قرار

آج تو خوب ہنسو خوب کرو سیر وبہار
اپنا دامن نہ مسرت سے چھڑانا ہرگز
اور میں کل جو چلا جاؤں افق کے اس پار
تم میری یاد میں آنسو نہ بہانا ہرگز

یا ایک نظم کے یہ اشعار ملاحظہ کریں۔

بار ہا شام کی ظلمات میں دل ڈوبا ہے
بارہا نیند سے محروم رہی ہیں آنکھیں
وقت کے ساتھ گزرتے ہوئے لمحوں کی طرح
نہ کوئی آس نہ ہنگامہ نہ افتاد نئی
بارہارات کے سناٹے میں اک ہوک اٹھی
بارہا فکر کا انجام رہی خاموشی
کچھ سوالات لیے کتنی ہی راتیں گزریں
ایسے لمحات لیے کتنی ہی راتیں گزریں

اس طرح کے اشعار جب تخلیقی شکل اختیار کرتے ہیں تو یہ سمجھیے کہ وہ کس ہیئت وکیفیت کا پرتو ہوتے ہیں، جو دراصل فروعی نہیں حقیقی صورتِ حال سے عبارت ہوتے ہیں، اور یہی چیز حبیب سیفی نے شوکت پردیسی کے یہاں ڈھونڈی، جسے تلاش کر سامنے لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ قابل مبارکباد ہیں حبیب سیفی جنہوں نے شوکت سے اہل اردو یا اردو دوستوں کو متعارف کرا کر اس امانت کو محفوظ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور ادبی سرمایے میں ایک عمدہ قسم کا خوب صورت اضافہ کیا ہے، جو ہر طرح سے انفرادیت کا حامل ہے۔ حبیب سیفی کی نثری صلاحیت کے پیش نظر یہ سلسلہ روز افزوں ترقی پذیر ہو، امید کی جاسکتی ہے کہ نظر انتخاب قارئین کس کو ممنون ہونے کا موقع دیتا ہے۔ کتاب کی نثر پڑھنے کے بعد یقین ہی نہیں ہوتا کہ یہ ادبی پارے اس نوعمر قلم کار کے ہو سکتے ہیں۔ قبل آزادی ہند اور بعد کے ہندوستان کے سماجی، سیاسی، معاشی صورت حال کی جو آئینہ گری اپنے اشعار میں شوکت پردیسی نے کی ہے اس کا انتخاب بھی حبیب سیفی نے بہت ہی لاجواب کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ہر ایک پہلو سے کتاب مطالعے کے قابل ہے، جو فیض وفراز اور جوش وساحر کی نظموں سے مسحور ہوتے ہیں وہ شوکت کی نظموں سے ضرور حظ اٹھائیں گے۔ کل ملا کر جو بھی اس کتاب کو پڑھے گا وہ استفادہ ضرور کرے گا، کیونکہ تقسیم ہند کے سانحے کے تناظر میں بعض نظمیں لکھی گئی ہیں۔ کتاب جاذب نظر ہے اور عمدہ گیٹ اپ کے ساتھ شوکت پردیسی کی تصویر سے سجی ہے۔

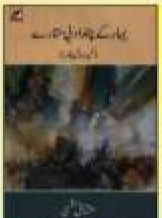

بہار کے چند ادبی ستارے (فن اور فن کار)

مصنف: مشتاق شمسی
صفحات: 104، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 95
مبصر: ڈاکٹر شبیر عالم، ستیوتی کالج، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

بہار کی سرزمین بڑی مردم خیز ثابت ہوئی ہے۔ یہاں ہر زمانے میں نابغۂ روزگار ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے زندگی کے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ موجودہ عہد میں بھی جسے 'قحط الرجال' کا عہد کہا جاتا ہے، سرزمینِ بہار پر عظیم شخصیات جنم لے رہی ہیں۔ میدان چاہے سیاست کا ہو یا علم کا، تحقیق کا ہو یا ادب کا، ٹیکنالوجی کا ہو یا سائنس کا، بہار سے جڑے افراد اپنے کاموں کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند سارے عالم میں پہچانے اور جانے جارہے ہیں۔ جہاں تک اردو زبان وادب کی بات ہے تو فی الوقت بہار میں اردو کی صورت حال دوسرے صوبوں کے مقابلے میں بہتر نظر آتی ہے۔ یہاں اردو کے صحافیوں، ادیبوں، محققوں اور شاعروں کی روشن کہکشاں موجود ہے۔ بہار کی سرزمین پر اردو ادب کے حوالے سے جو کام ہوا اور ہورہا ہے، وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اسے دنیا کے سامنے لایا جائے۔ بعض اہل قلم اس جانب توجہ دے رہے ہیں اور بہار میں اردو کے حوالے سے کتابیں لکھ رہے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'بہار کے چند ادبی ستارے، فن اور فنکار' بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب کے مصنف مشتاق شمسی ہیں جنھوں نے خاصی محنت کے بعد یہ کتاب تصنیف کی ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے، کمپوزنگ بھی اچھی ہے اور طباعت وکتابت کو بھی معیاری کہا جاسکتا ہے، پروف کی غلطیاں کم ہیں۔ اس کتاب میں زیادہ تر مضامین ان شخصیات پر ہیں جو ابھی بقیدِ حیات ہیں اور علمی وادبی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ صرف دو ایسے اشخاص پر مضامین کو کتاب میں شامل کیا گیا ہے، جو دار فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ مصنف نے جس شخصیت پر بھی لکھا ہے، دل کھول کر لکھا ہے اور اس کی زندگی اور کارناموں کا مختلف پہلوؤں سے احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب میں بعض شخصیات ایسی ہیں جو زیادہ معروف نہیں ہیں، لیکن ان کی خدمات واقعی بڑی ہیں۔ ایسا کرکے مصنف نے گم نام اشخاص کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ خود صاحب کتاب رقمطراز ہیں:

''اس کتاب میں ایسے لوگوں کا ذکر ہے جن کے کارنامے (خدمات) تو بہت ہیں لیکن کمزور پروپیگنڈہ اور گروپ بندی کی وجہ سے لوگوں کے سامنے کھل کر نہیں آئے۔''

کتاب میں جن شخصیات پر مضامین ہیں ان کے نام اس طرح ہیں: شاداں فاروقی، شبنم کمالی، ڈاکٹر ذکی احمد، پروفیسر غلام قدوس، رفیق انجم، خلیق الزماں نصرت، ڈاکٹر نجیب اختر، مفتی اعجاز ارشد قاسمی اور ڈاکٹر مبین صدیقی۔

جہاں کتاب میں خوبیاں موجود ہیں، وہیں بعض کمزوریاں بھی صاف نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ کتاب کا نام 'بہار کے چند ادبی ستارے' ہے، جس سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ اس میں پورے بہار کے منتخب ادیبوں کا تذکرہ ہوگا، لیکن کتاب میں صرف دربھنگہ ضلع یا اس کے گرد ونواح کی ہی شخصیات نظر آتی ہیں۔ حالانکہ بہار ایک بڑا صوبہ ہے اور اس میں درجنوں اضلاع ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دوسرے بہت سے اضلاع میں بھی اردو کے بڑے بڑے نام پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں، مگر مصنف نے ان سب کو یکسر نظر انداز کردیا ہے، اور دربھنگہ کی شخصیات تک اپنی کتاب کو محدود کر رکھا ہے۔ ایسے میں اگر کتاب کا نام 'دربھنگہ کے چند ادبی ستارے' ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اس وقت صاحب کتاب پر یہ سوال قائم نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ مصنف نے کتاب کے نام کے ساتھ 'فن اور فنکار' بھی جوڑا ہے۔ لیکن فن پر کوئی گفتگو نہیں کی گئی ہے۔ پوری کتاب میں ایک بھی مضمون فن کے حوالے سے موجود نہیں ہے۔

اپنی پسندیدہ شخصیات پر صاحب کتاب نے کافی طول طویل مضامین تو لکھے ہیں مگر ان سے متعلقہ شخصیات کے ادبی کارناموں کا مفصل ذکر نہیں کیا ہے۔ مضامین تعارفی انداز کے ہیں، تنقیدی انداز کے نہیں ہیں۔ مضامین پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسا کہ مصنف ان شخصیات سے بہت زیادہ متاثر ہیں جن پر وہ قلم اٹھا رہے ہیں۔ اس لیے کتاب میں مدحیہ پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ اگر متعلقہ شخصیات کی کتابوں اور فن پر تنقیدی نگاہ بھی ڈال لی جاتی تو کتاب کی افادیت بڑھ جاتی اور معتبریت بھی۔ فن کار کے کلام پر ناقدانہ بحث کرنے سے فنکار کی اہمیت کم نہیں ہوجاتی۔ کمزوری اور خامیاں ہر ایک شخص میں اور ہر شخص کے کلام وفن میں ہوتی ہیں۔ ناقد کے لیے ضروری ہے کہ جہاں وہ ان کی خوبیوں کو اُجاگر کرے، وہیں ان کے کلام کے معائب اور کمزوریوں کو بھی زیر تذکرہ لائے۔ پیش نظر کتاب اس پہلو سے خالی ہے۔ اس کے باوجود کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کتاب سے بعض ایسی شخصیات ضرور سامنے آئی ہیں جنھیں لوگ کم جانتے ہیں، حالانکہ اپنے کارناموں کی وجہ سے وہ اس بات کی مستحق ہیں کہ انھیں جانا اور پہچانا جائے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ کتاب کو ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

خواتین

نسائی شعری آفاق

مصنف/ناشر: کہکشاں تبسم

صفحات: 344، قیمت: 173 روپے

مبصر: فردوس بانو فلاحی، A-187/3، دوسری منزل، شاہین باغ، نئی دہلی

یہ امر نہایت تعجب خیز ہے کہ کسی اور کے درد و کرب کو کوئی دوسرا بیان کرے اور وہ بھی بغیر کسی منفعت کے۔ سیاسی قائدین ہوں یا شعرا و ادبا، ہر ایک کے یہاں غرض کا پہلو مخفی ہوتا ہے۔ شعرائے متقدمین کی عشقیہ شاعری کا محبوب مرد ہوتا تھا جس کے خط و رخسار اور ناز و ادا زنانہ صفت ہوتے تھے۔ گویا عورت ہر دور کے شعر و ادب کا جلی عنوان رہی ہے۔ اس کی نسوانیت تمام شعبۂ حیات کو متاثر کرتی رہی ہے۔ درباروں سے لے کر بازاروں اور مزاروں تک اس کے حسن و شباب کو ایک جنس کے طور پر برتا گیا۔ دانشوروں کے یہاں بھی نسائی و تانیثی مسائل سے صرف نظر کیا گیا اور ان کا جنسی استحصال ہوا۔

علم کے میدان میں جب عورتوں کا ورود ہوا تو تانیثی تحریک پیدا ہوئی، ان کے اندر حقوق نسواں کا احساس بیدار ہوا۔ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے اس تحریک نے بھی صیغۂ حیات میں اپنی موجودگی درج کرائی اور خاطر خواہ حقوق کا مطالبہ کیا۔ جگہ جگہ ان کی انجمنیں اور کمیشن قائم ہوئے تاکہ انھیں ہر طرح کا تحفظ فراہم کیا جائے۔ تقریر و تحریر سے لے کر سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں اس جنس نے اپنی قدر و اہمیت کا احساس دلایا۔ اور معاشرے کو رفتار و ترقی سے ہمکنار کیا۔

عورت وہی جنس ہے جو کبھی چھپ چھپ کر کتابیں پڑھا کرتی تھی۔ آج پیچیدہ موضوعات پر مبنی موٹی موٹی کتابوں کی مصنفہ ہے۔ لاینحل عقدوں کا پانی کی طرح تحلیل و تجزیہ کر کے مردانہ عقل و خرد کو ورطۂ تحیر میں ڈال دیا۔

آج وہی عورت شعر و ادب کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر نور افشانی کر رہی ہے۔ شعر و ادب کی کوئی بھی محفل اس کے فن پاروں کے بغیر سونی رہتی ہے۔ اس کی تخلیقات میں مطالبات بھی ہوتے ہیں اور سماج سے منسلک مسائل و نکات بھی۔ روشن دماغی بھی ہوتی ہے اور روشن ضمیری بھی۔

زیر غور کتاب 'نسائی شعری آفاق' کہکشاں تبسم کی شاعرات پر مبنی تصنیف ہے۔ یہ کتاب اردو شاعرات کا تعارف نامہ بھی اور 51 شاعرات کا تذکرہ بھی۔ اس تصنیف میں زیادہ تر وہ شاعرات ہیں جو گزر چکی ہیں۔ کہکشاں تبسم کا انتساب بھی انھیں سے ہے جو گم نام ہیں۔ اس انتساب میں بھرپور بلاغت پائی جاتی ہے۔ انتساب ملاحظہ ہو:

''ان روحوں کے نام—
جنھوں نے اپنی لوریوں اور گیتوں سے زندگی کو آہنگ بخشا
لیکن تہذیبی جبر کے باعث بے دستخط رہیں
اور تاریخی جبر نے انھیں بے شناخت رکھا۔''

یہ انتساب ایک ایسی تہذیب کا اشاریہ ہے جس میں عورت صرف احساس کرسکتی تھی اظہار نہیں۔ اس تہذیب کی عورت میں فکر و شعور کی پختگی بھی تھی اور تخلیقی وفور بھی تھا لیکن انحراف کی جرأت نہیں تھی۔ فکر کی بالیدگی، شعور کی پختگی تخلیقات میں در تو آئی مگر اسلوب کی حد تک پابند روایت ہی رہی کیونکہ اس وقت شاعری بنت حوا کے لیے شجر ممنوعہ تھی۔ کلیے کو توڑنا، پرانے بت کو مسمار کرنا کوئی آسان کام نہیں تا آنکہ کوئی نیا کلیہ یا نیا بت نصب نہ کر دیا جائے جس کی طرف پرستاروں کو مائل کیا جائے۔

اس وقت جن شاعرات نے شاعری کی دنیا میں قدم رکھا ان کا طرز گفتار بھی روایتی تھا۔ ان کی تخلیقات میں نسائی آگہی تو ہے لیکن مطالبات و احتجاج کی آنچ شکوۂ زیر لب کی صورت جس پر محرومی و ناکامی کا احساس غالب ہے۔ تاہم پھر بھی ایک نہج پر نسائی احساس کا شعوری احتجاج کا ابتدائیہ ہے جو بعد میں چل کر اپنے نام اور دستخط کو عیاں کرنے کا وسیلہ بنا اور آج کی شاعرہ لذت نسواں بہم پہنچانے کے برعکس حقوق نسواں کا مطالبہ اپنے شعر پاروں وفن پاروں میں یہ بانگ دہل کرتی ہے جس میں مضبوط دلائل مکمل تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں کیونکہ تخلیق مرد و زن کی کاریگری میں ایک ہی خالق کا ہاتھ ہے اس لیے دونوں کے حقوق اپنی اپنی حدود میں مکمل ہیں لیکن مرد اساس معاشرے نے حقوق نسواں پر غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے جس کی بازیافت کے لیے آج نسائی آواز کا اٹھنا فطری امر ہے۔

ہر دور اپنے وقت میں ترقی پسند ہوتا ہے۔ روایت کا احساس ہی ترقی پسندی کی علامت ہے۔ پھر اظہار، احتجاج کی اگلی منزل ہے۔ کہکشاں تبسم نے جن شاعرات کا ذکر کیا ہے ان میں فن کی پختگی تو ہے ہی اسلوب میں ایک سلسلہ ہے جو احساس، اظہار اور احتجاج تک پہنچتا ہے جن میں نمایاں نام راضیہ خاتون جمیلہ، نثار فاطمہ کبریٰ، وحیدہ بیگم شروانی، حیا لکھنوی، ادا جعفری، زہرا نگاہ، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، جمیلہ بانو، کشور ناہید، پروین شاکر کے علاوہ ایک لمبی فہرست ہے جنھوں نے اپنے اپنے احساس کو اپنی اپنی تخلیقات میں خود پیش کیا۔ جو ایک شاعر نہیں کرسکتا۔ عورت آج اپنے کرب و محسوسات کو زبان دینے پر مکمل دسترس رکھتی ہے۔ حسب حال شاعرانہ لوازمات کو برتتے ہوئے فن اور فکر کا مکمل اظہار کیا ہے۔

ان کے اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعرات جنسی جذبات سے اوپر اٹھ کر نسائی تقاضوں کو اپنی تخلیقات کا حصہ بناتی ہیں تو دوسری طرف معاشرے کے دیگر امور میں بھی دلچسپی لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ذات کا غم بھی ان کی شاعری میں ہے اور کائنات کا درد بھی ہے۔ ان شاعرات کی شاعری غم جاناں بھی ہے اور غم دوراں بھی۔ گویا ان کے موضوعات آفاقی ہیں۔ باطنی حوالوں کے ساتھ خارجی حوالوں کو بھی اپنی شاعری سمونے کا ہنر سیکھ لیا۔

کہکشاں تبسم کی یہ کاوش اردو داں حلقوں میں پسند کی نظر سے دیکھی جائے گی۔ کتاب ہر اعتبار سے مناسب ہے۔

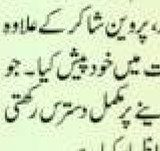

کشف ذات (انٹرویو)

مصاحبہ نگار: ڈاکٹر شگفتہ یاسمین

صفحات: 304، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: ٹریبل ایف پبلی کیشنز، جامعہ نگر نئی دہلی 25

مبصر: فاروق اعظم قاسمی، 160، پیریار ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

خطوط کے بعد کسی کے اندرون میں جھانکنے کا بہترین ذریعہ انٹرویو ہے۔ ذاتیات سے جڑی بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں ایک انسان دوسروں پر ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا اور نہ ہی وہ ان باتوں کو سپرد قرطاس کر پاتا ہے۔ حالانکہ اس رویے سے اکثر قیمتی اور کار آمد چیزوں سے دنیا محروم رہ جاتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ آج تک ایسا کوئی آلہ ایجاد نہ ہو سکا کہ جس کے ذریعے کسی کے دل کے راز کا علم ہو سکے۔ تاہم سوال و جواب یا باہمی گفتگو ایک ایسا روزن ہے جس کے ذریعے سے ایک انسان دوسرے انسان کے درون خانہ میں جھانک سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے مفید و مضر دونوں پہلو سامنے آسکتے ہیں۔

سوال و جواب اور باہمی گفتگو کا یہ سلسلہ قدیم ہے۔ لیکن گزشتہ چند برسوں سے اہل علم و ادب کا رجحان اس کی طرف بڑھا ہے جو خوش آئند ہے۔ یوں تو مصاحبہ کی کئی قسمیں کی سکتی ہیں۔ مثلاً: بالمشافہ، مراسلاتی، ذاتی، اجتماعی، وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ان مصاحبات کو کبھی صوتی وسیلے (ریڈیو) پر اور کبھی نظری وسیلے (ٹیلی ویژن) پر پیش کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی کبھی ان دونوں سے ہٹ کر انٹرویو کو کتابی شکل دے دی جاتی ہے۔ پھر بھی

ایک ہی شخص سے لیے گئے مختلف انٹرویو کو یکجا کر دیا جاتا ہے اور کبھی مختلف اشخاص سے لیے گئے مصاحبات کو کتاب کا روپ دے دیا جاتا ہے۔

پیشِ نظر کتاب 'کشفِ ذات' کا تعلق آخر الذکر سے ہے جو وقت کی تیرہ معروف خاتون ادیبات وشاعرات سے کیے گئے انٹرویو کا مجموعہ ہے۔ان خواتین فنکاروں میں زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، نور جہاں ثروت، ذکیہ مشہدی اور غزال ضیغم وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ بقول مولفہ: "یہ تمام انٹرویوز الیکٹرانک میڈیا کے لیے گئے تھے، بعد میں انھیں ضبطِ تحریر میں لاکر مرتب کیا گیا ہے"(مقدمہ' کتاب) کتاب کی مولفہ یا مصاحبہ نگار ڈاکٹر شگفتہ یاسمین ایک بے حد متحرک وفعال خاتون ادیبہ ہیں۔اس سے قبل ان کی تین کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ میڈیا سے بھی موصوفہ کا بڑا گہرا شغف ہے بطور خاص الیکٹرانک میڈیا سے۔ شگفتہ یاسمین کی ہر کتاب اپنے مشمولات، زبان و بیان، اچھوتے لب و لہجے اور دیدہ زیب گٹ اپ کے ذریعے صاحبِ کتاب کی اعلیٰ ذوقی کا ثبوت پیش کرتی ہے۔

ہر انٹرویو کے شروع میں صاحب انٹرویو کا چند سطری تعارف بھی شامل ہے جو بیشتر انٹرویو ہی سے ماخوذ ہے۔اس کے بعد انٹرویو اور انٹرویو کے بعد متعلقہ فنکار کی کسی نثری تحریر یا منظوم کلام کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ان مصاحبات سے مذکورہ فنکاراؤں کی ذات و صفات سے بھی پردہ ہٹتا ہے اور ساتھ ہی ان خواتین کے فن کی مختلف جہات بھی وا ہوتی ہیں تاہم کہیں کہیں فن پر گفتگو کا انداز روایتی محسوس ہوتا ہے۔ شگفتہ یاسمین کے اس خیال سے انکار مشکل ہے کہ عورتیں ستائی گئیں، ان کی حقوق تلفی ہوئی اور انھیں نصف بہتر کا نام دیا گیا۔ یہ بھی سچ ہے کہ عورت کے مسائل کو ایک عورت بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے لیکن چند سوالات اور بھی کھڑے ہوتے ہیں کہ اس کے پس پردہ صرف مرد ذمہ دار ہیں؟ کیا مرد مظلوم نہیں؟ کیا ایک مرد عورت کے بغیر یا ایک عورت کسی مرد کے بغیر مکمل ہو سکتی ہے؟ کیا تانیثیت عورت بمقابلہ مرد کا نام ہے؟

بقول غزال ضیغم "عام طور پر یہ ذہن میں رہتا ہے کہ عورتیں بڑی مظلوم ہیں۔ کچھ تو واقعی مظلوم بھی ہوتی ہیں، استحصال بھی ہوتا ہے لیکن تصویر کے دونوں رخ دیکھیے، کہیں ان کا استحصال ہوتا ہے اور وہ کہیں دوسروں کا استحصال بھی کرتی ہیں" (ص 205)

ایسے ہی ذکیہ مشہدی نے بھی بڑی متوازن بات کہی ہے "تانیثیت کا مطلب میرے نزدیک یہ ہرگز نہیں کہ عورتوں کو مردوں کے خلاف صف آرا کر دیا جائے۔ میرے نزدیک تانیثیت یہ ہے کہ عورتوں کو ان کے بنیادی حقوق ملنے چاہئیں" (ص 69)

یہ حق ہے کہ ظلم ظلم ہے خواہ مرد پر ہو یا عورت پر۔ کوئی بھی سماج نہ صرف عورتوں سے بنا ہے اور نہ محض مردوں کے دم پر اس کی تعمیر وترقی ہوئی ہے بلکہ اس سلسلے میں دونوں کی حصے داری برابر کی ہے۔ بغیر کسی خطِ امتیاز اور بغیر کسی محاذ آرائی کے ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھنے اور سماج کو مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ تانیثیت اس مغرب کی ایجاد ہے جہاں عورتوں کی حیثیت ایک موبائل کوپن سے زیادہ نہیں۔ مشرق میں اس تانیثیت کی ضرورت ہی نہیں جیسا کہ افسانہ نگار ترنم ریاض نے لکھا: "مشرق میں ہم کو تانیثیت کی ضرورت نہیں"۔ (ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی، مارچ 2016)

'کشفِ ذات' کے ایک انٹرویو میں زاہدہ زیدی نے کہا: "میں اس بات کو واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میرا تانیثی تحریک سے تعلق نہیں ہے، میں اس کو خواتین کے لیے مضر سمجھتی ہوں کہ اپنی شاعری کو صرف چند مسائل کے اوپر مرکوز کر دیں" (ص 94)

'تانیثیت' اگر عورتوں کے حقوق کی بازیابی کے لیے قلمی و عملی جدو جہد کا نام ہے تو بڑھ چڑھ کر اس کا استقبال ہونا چاہیے اور اگر اس کے علاوہ کچھ اور شے ہے تو مشرقی معاشرے میں اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ جیسا کہ سینئر خواتین قلم کاروں کی مذکورہ بالا تحریروں سے ظاہر ہے۔

چند سطری تعارفی تحریر میں اگر صاحب انٹرویو کی تاریخ پیدائش، جائے پیدائش اور تعدادِ تصنیفات وغیرہ کی تفصیلات مذکور ہوتیں تو اس کی افادیت مزید دوبالا ہو جاتی۔ اسی طرح جملہ تصاویر میں ناموں کی نشاندہی بھی ضروری تھی۔ مجموعی طور پر اپنی نوعیت کی یہ ایک انیلی کتاب ہے اور قابلِ مطالعہ بھی۔ اس خوبصورت کاوش کے لیے شگفتہ یاسمین مبارکباد کی مستحق ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اہلِ علم وادب کے حلقے میں کتاب پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

شاعری

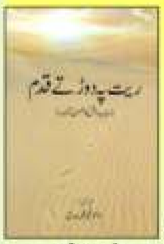

ریت پر دوڑتے قدم

مصنف: وہاب دانش، مرتب: ڈاکٹر محمد طلحہ ندوی

صفحات: 184، قیمت: 250 روپے

ناشر: انعم پبلی کیشنز، رانچی

مبصر: معاذ احمد، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'لب مماس' کے بعد 'ریت پہ دوڑتے قدم' وہاب دانش کا دوسرا شعری مجموعہ ہے وہاب دانش کی شاعری آج اردو کے ادبی حلقوں میں ایک اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔ وہاب دانش کی شاعری میں عشقِ حقیقی کے ساتھ عشقِ مجازی بھی ہے۔ ان کی محبت میں وصال کی لذت بھی ہے اور ہجر کی تڑپ بھی، زندگی کی نارسائی، زندگی جینے کا حوصلہ، انسان کی درندگی وسفاکی، خود آگہی، ماضی کی پاسداری، حال سے رشتہ اور مستقبل کی جستجو اور سب سے بڑی خاصیت ایک رجائی اسلوب فکر جو ان کی شاعری کو ایک انفرادی شان عطا کرتا ہے۔

ایسے متعدد مسائل، لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت حال کی عکاسی ان کی شعری کائنات میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتی ہے زندگی کے ان تمام مشاہدات کو جذبات کے پیکر میں ڈھال کر استعاروں اور لطیف اشاروں کے ذریعے پیش کرنا نہ صرف وہاب دانش کا امتیاز ہے بلکہ شاعری کی دنیا میں قدم رکھنے والے مبتدئین کے لیے ایک مشعل راہ بھی ہے۔ غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ریزہ ریزہ تو ہوا سنگ ملامت کھا کے　　اب ہواؤں سے بکھرنے کا تجھے غم کیوں ہے
میں منتشر ہوا تو مجھے دکھ نہ کچھ ملال　　محفوظ میری چیخ تو اب تک ہوا میں ہے
ذکر چھڑ جائے تو الفاظ کے ملبوس نہ دے　　برہنہ لاکھ سہی نام مگر دل میں رہے
جو نگاہوں میں تھی تحریر وہ چہرے پہ نہیں　　اس حکایت کے کئی شبد تو آپ بھی تھے

وہاب دانش کی زندگی کی حکایت صرف ان چند اشعار میں ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کے تجربات کا نچوڑ ان کی متعدد غزلوں میں پنہاں ہے ان کا یہ شعری مجموعہ زندگی کی دھوپ چھاؤں کا سپاس نامہ ہے۔ شاعری کے حوالے سے لطف اندوزی کا وہ وافر حصہ جو عام قارئین کے ذوق کی دادرسی کرتا ہے وہ وہاب دانش کے یہاں نہیں ہے۔ وہاب دانش اپنی شاعری میں سادہ شستہ اور خوبصورت زبان کے ساتھ ساتھ مؤثر علامتیں، نایاب استعارات اور مذہبی تلمیحات سے خوب کام لیتے ہیں۔ ان کا ایمائی انداز بیان اور مجتہدانہ اسلوب ان کی شاعری کے معنوی امکانات بڑھا دیتے ہیں۔ تاہم اپنی انفرادی شان کو قائم رکھنے میں انھوں نے حتی الامکان سعی کی ہے لیکن کہیں کہیں تعقیدِ معنی اور ابہام کی کیفیت بھی در آئی ہے۔ تاہم وہ اپنی زندگی کے کڑے کوس کو اس طرح سے شاعرانہ پیکر میں پروتے ہیں کہ گنجینۂ معنی کا طلسم ابھرتا چلا جاتا ہے:

وہ ہمارا ریت میں دھنسنے کا عالم ہائے ہائے　　وہ کسی کی ضد کہ یہ منظر بھی دیکھیں گے ضرور
مری بھی آخری خواہش عجیب ہے دانش　　کہ دکھ بھرا مرا لہجہ اسے سنا آؤ

ریت میں دھنسنے کا عالم، دکھ بھرا لہجہ، اک آنسو اور غم کی مختصر روداد ایسے اشارے اور کنایے ہیں جو صوتی اور معنوی اعتبار سے مقناطیسیت رکھتے ہیں اور نئی نسل کے قارئین کو بھی

اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ زندگی اور زندگی کے حقائق کے شانہ بہ شانہ یہاں کائنات کی وسعتیں اور بے کرانیاں بھی آب وتاب کے ساتھ آپ کو دیکھنے کو ملے گی، یوں تو انھونے بہت ساری پابند نظمیں بھی کہی ہیں لیکن اس مجموعے میں آزاد نظموں کا ایک وافر حصہ ہے، بنیادی طور پر وہاب دانش ایک جدت پسند شاعر ہیں اور اس جدت پسندی کو آزاد نظم کی ہیئت کی شکل میں انھیں تسکین کا سامان نظر آیا۔ چنانچہ آزاد نظم کے شعری لبادے میں انھوں نے زندگی کا جو رس بھرا ہے وہ بہت ہی پرسوز اور سبک رفتار ہے ایسی نظموں میں 'ہم عمر کشکول، سرابی ریت بڑھنے دے، آدمی اور ریت، لفظ کا المیہ، ابابیل کو ست دو، نہ صرف اپنے عنوانات سے ہی قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں بلکہ ان کے اندر زندگی کی بے ثباتی اور فطرت کی عکاسی کا جو منظر نامہ تخلیق ہوا ہے وہ ہماری اور آپ کی دنیا کے بالکل مماثل ہے۔ نظم 'ہم عمر کشکول' کے یہ بند ملاحظہ ہوں:

بھیک میں سکے نہیں تو/ لفظ ہی دے/ ایسے جن کو جوڑ کر رکھوں...

نظم 'لفظ کا المیہ' کے یہ اشعار دیکھیے:

یاد گویا کچھ نہیں اب/ ذہن کا سرمایہ یکساں گزرتے زرد لمحوں کے ہجوم میں
صرف ہوکر رہ گیا ہے
اور حاصل زندگی تین مانوس لفظوں کا ایک مثلث ہے
(اور یہ تین مانوس لفظ، گھر، دفتر، حادثہ ہیں)

وہاب دانش کی یہ نظم بڑے عزم سے روبہ رفتار ہے۔ ان نظموں کا لہجہ رجائی ہے حالات زندگی سے مسلسل نبرد آزمائی کی کیفیت ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے:

نئی پسند نئی روشنی کی چاہ مری/ کہیں ٹھہر نہ سکی جدت نگاہ مری
اڑان مری نئے آسمان کی کھوج میں ہے/ بساط اپنی تنگ وہ وہ ہے بے پناہ مری

زیر تبصرہ کتاب 'ریت پہ دوڑتے قدم' وہاب دانش کا شعری مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر محمد طلحہ ندوی نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ انعم پبلی کیشنز، رانچی سے شائع ہوئی ہے۔ 184 صفحات پر مشتمل یہ شعری مجموعہ، جس میں چالیس نظمیں، اور اکتالیس غزلوں کے علاوہ متفرق اشعار بھی ہیں، کتاب کی ضخامت کے اعتبار سے اس مجموعے کی قیمت زیادہ ہے۔

رسائل و جرائد

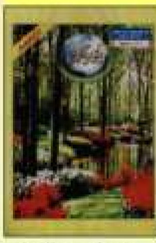

عالمی 'انوار تخلیق' رانچی

صفحات: 80، قیمت: 50 روپے، سنہ اشاعت: 2017
پتا: حق منزل، گھوش کمپاؤنڈ، سنٹرل اسٹریٹ، ہند پیڑھی 9
مبصر: وکیل رضوی، گھوش کمپاؤنڈ، سنٹرل اسٹریٹ ہندپیڑی، رانچی، جھارکھنڈ

رانچی جھارکھنڈ سے گذشتہ تین برسوں سے نکلنے والا چہار ماہی رسالہ 'عالمی انوار تخلیق' اپنی نوعیت کا دنیا کا واحد رسالہ ہے، جس نے تخلیقیت کو فروغ دینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ آج ہمارے درمیان سے معروف ادبی ہستیاں ایک ایک کر کے ہمیں داغ مفارقت دے کر اس دار فانی سے رخصت ہوتی جارہی ہیں جس کی بھرپائی کرنے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ رسالے کے اعزازی مدیر اعلا اور عالمی انوار تخلیق کے افسانچہ نگار ڈاکٹر ایم۔اے۔حق نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ آج ہماری نئی نسل اردو ادب سے ہی نہیں اردو زبان سے بھی بے بہرہ ہوتی جارہی ہے۔ موجودہ دور میں فلمیں، فیس بک، ٹوئیٹر، وہاٹس ایپ، اینڈرائڈ فون کے دلچسپ ایونٹس (Events) جیسے ڈھیروں تفریح کے ذرائع کی موجودگی میں ادب کی جانب بیشتر لوگوں کا رجحان مبذول ہونا دشوار ہوتا جارہا ہے۔ اس لیے ادب کو بھی دلچسپی سے بھرپور انداز میں پیش کرنے کی تکنیک اپنائی جا رہی ہے۔ عالمی انوار تخلیق کے صفحات پر اور اس کے خاطر خواہ نتائج بھی برامد ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر رسالے میں شائع مکتوبات میں قرعہ اندازی سے ایک نام نکالا جاتا ہے جن کے شخصی کوائف کو مع تصویر رسالے کے اگلے شمارے میں شائع کیا جاتا ہے۔ اس سے قارئین میں مکتوبات ارسال کرنے کی رفتار میں مزید اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

رسالے میں یہ بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ گمنام افسانچے اور غزل پر تجزیہ نگاروں کے تبصرے پیش کیے جائیں۔ ساتھ ہی قارئین کو بھی دعوت دی جاتی ہے کہ وہ بھی اُن تجزیوں کی روشنی میں اپنے تاثرات اور آرا پیش کریں۔ رسالے کے معاونین کی فہرست میں سے ایک معاون کا نام بہ ذریعہ' قرعہ اندازی کے منتخب کیا جاتا ہے جن کا مختصر اداریہ بہ عنوان 'مجھے بھی کچھ کہنا ہے' شائع کیا جاتا ہے۔

'کہانی ہے ادھوری، آپ کریں پوری' کالم کے تحت کسی معروف کہانی کار کی کوئی کہانی شائع کی جاتی ہے جس کا اختتام حذف کردیا جاتا ہے۔ ادارے کو موصول سارے اختتامات خود مصنف کو بھیج دیے جاتے ہیں۔ مصنف کو پسند آنے والی تحریروں کو انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ اگر غور کریں تو رسالے کی ساری اسکیموں کی تہہ میں تخلیقیت کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ رسالے کی انفرادیت کو عالمی سطح کے اس کے قارئین نے تسلیم کیا ہے۔

اردو ادب میں پہلی مرتبہ 'تو شاہین ہے..' کالم کے تحت ایم اے اردو میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہونے والے طلبا وطالبات کا انٹرویو شائع کیا جاتا ہے۔ نوجوان طبقے کے انٹرویو سے ادب میں ان کے خیالات، ان کی پسند و ناپسند کا پتا چلتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نئی نسل کس قسم کا ادب چاہتی ہے اور مختلف اصناف کن کن ادیبوں اور قلم کاروں سے متاثر ہے۔

عالمی انوار تخلیق صرف نام کو ہی عالمی نہیں ہے۔ اس میں ساری دنیا کے قلم کاروں کی تخلیقات شامل اشاعت ہوتی ہیں۔ گذشتہ شماروں میں فرانس کے مصنف ژولیاں کولومو کا انٹرویو، چین کے اردو شاعر چینگ شی شوان (انتخاب عالم) کی غزل، امریکہ کے پہلے اردو شاعر میکس بروس نادر کی غزل مع احوال زندگی، جاپان کے اردو شاعر پروفیسر سویامنے (Soyamane) کی غزلیں اور جاپان کے ناصر ناکاگاوا کے سفرنامۂ ہند پر مضمون شائع ہوئے ہیں۔

عالمی انوار تخلیق کے تازہ شمارے میں پاکستان کی تین کہانیاں، امریکہ کی غزل، ہانگ کانگ کی دو غزلیں، دو افسانچے اور کئی مکتوبات شائع ہوئے ہیں۔ اس کے ادارتی بورڈ میں سلام بن رزاق، مشرف عالم ذوقی، ڈاکٹر رؤف خیر، علیم صبا نویدی کے علاوہ جرمنی کے سرور غزالی اور کناڈا کے ڈاکٹر بلند اقبال شامل ہیں۔

اس کے معاونین خصوصی کی فہرست میں ڈاکٹر سید احمد قادری، خورشید حیات، پرتپال سنگھ بیتاب، ڈاکٹر مسعود جامی، وحشی سعید، ڈاکٹر فراز حامدی، رونق جمال، ڈاکٹر محمد کلیم ضیا جیسی معروف ادبی ہستیاں رونق افروز ہیں۔ رسالے کے سرپرستان میں جمشید پور کے دنیائے ادب کے صدر سید آر۔اے۔ عباس رضوی عرف چھمن، معروف شاعر بی۔ ایس جین جوہر، معروف اردوداں وصدر انجمن ترقی اردو، جھارکھنڈ جناب ابوذر عثمانی اور ماہر تعلیم کریم سٹی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد زکریا جیسے لوگ موجود ہیں۔

مدیران کی ٹیم میں ڈاکٹر صفدر امام قادری (سینئر ایڈیٹر)، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری (مینجنگ ایڈیٹر)، ڈاکٹر ایم۔اے۔حق (چیف ایڈیٹر)، ڈاکٹر محبوب حسن اور ڈاکٹر تسلیم عارف (اسسٹنٹ ایڈیٹر) اور مدیر منظومات میں ملک کے شہرت یافتہ شاعر جناب پرویز رحمانی شامل ہیں۔

قاری کی ذہنی تفریح کے لیے رسالے میں جابہ جا ادبی وغیر ادبی لطائف نظر آتے ہیں۔ ملک میں پہلی بار اردو رسالے کو فروغ دینے کے لیے فروغ اردو ایوارڈ کی شروعات کی گئی ہے۔ اس رسالے کو دیکھتے ہوئے امید کی جاسکتی ہے کہ آنے والے وقت میں یہ رسالہ اردو ادب میں اپنی الگ شناخت قائم کرے گا۔

مختصر تبصرے

ہر سانس محمدؐ پڑھتی ہے

مصنف: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی/صفحات 80، قیمت 100 روپے

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا تازہ ترین نعتیہ شعری مجموعہ 'ہر سانس محمدؐ پڑھتی ہے' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں اول مصنف نے 'گفتنی' کے ضمن میں عندیہ مدحت جناب رسولؐ پیش کیا ہے، دوم چار حمد اور باقی نعت پاک شامل مجموعہ ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو:

محمدؐ سر لفظ کن، محمدؐ راز یزدانی　　بنائے بزم دو عالم بقائے نظم حقانی
ہر شے میں ان کا نام ہے اس کائنات کی　　خلق خدا سے رشتہ ہے کیا حضورؐ کا
معراج مصطفیؐ سے صداقت ہے یہ عیاں　　کی جس نے انبیاؑ کی امامت حضورؐ ہیں
بھیجوں درود اس پہ مناظر نہ کیوں بھلا　　دافع مرے غموں کا محمدؐ کا نام ہے
جس نے پتھر آپ کو مارا اس کے حق میں وہ تھے دعا گو
پائیں ہدایت ہی فرمایا صلی اللہ علیہ وسلم

عاشق ہرگانوی کے نعتیہ کلام کے چار اہم موضوع ہیں: اول اللہ کے نبیؐ کے اخلاق حسنہ، دوم اہم واقعات اور معجزات کا ذکر، سوم آپ کی رفعت وعظمت اور چہارم اتباع رسول ذریعۂ نجات دنیا وآخرت۔ انہیں چاروں عناصر سے ان کا نعتیہ کلام تشکیل پاتا ہے۔ انھیں عناصر کے پیش نظر مذکورہ بالا اشعار منتخب کیے گئے ہیں۔ بہر کیف امید ہے عاشق ہرگانوی کے نعتیہ کلام کو پڑھ کر قارئین کو قلبی سکون اور عملی تحریک ملے گی۔ ان شاء اللہ یہ مجموعۂ نعت صاحب تصنیف اور تحریک دونوں کے توشۂ آخرت میں اضافے کا سبب ہوگا۔

چاک دیوار

مصنف: معصوم انصاری

صفحات: 112، قیمت: 150 روپے/ ناشر: کائنات پبلی کیشنز، بھیونڈی مہاراشٹر

یہ معصوم انصاری کا شعری مجموعہ ہے۔ جو دو 'حمد'، ایک 'نعت' اور پچانوے غزلوں کو محیط ہیں۔ مجموعے کا آغاز خلیق الزماں نصرت کے ایک مضمون ''معصوم.... میرا دوست میرا بھائی'' سے ہوتا ہے۔ اس میں معصوم انصاری کی روداد مراحل زیست اور کلام کی خصوصیات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد محسن امیدی برہان پوری کا ایک منظوم خراج عقیدت بھی شامل مجموعہ ہے۔ جس کو پڑھ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ کیوں کہ اس خراج میں شاعر نے ان کی رحلت کی ایسی منظر کشی کی ہے جو بیان سے باہر ہے۔ معصوم کی پہلی حمد لمبی بحر میں ہے، عام شاعر اس زمین میں کلام کہنے سے عاجز نظر آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس حمد میں جو ردیف باندھی کی گئی وہ غیر معمولی ہے لیکن معصوم انصاری نے اسے بڑی خوبصورتی سے برتا ہے کہ نہ فن مضمحل ہوا ہے نہ فکر۔ نمونہ کے طور پر اس حمد کا مطلع اور ایک شعر آپ کے پیش نظر ہے:

تو میرا اعتماد ہے تو ہی مرا یقین، اے رب العالمین ایاک نستعین
تیرے حضور خاک پہ رکھ دی ہے اب جبین، اے رب العالمین ایاک نستعین
مینار عظمتوں کا زمیں بوس ہو گیا، خورشید زندگی کا سیہ پوش ہو گیا
اس دور کے غلام ہیں ماضی کے فاتحین، اے رب العالمین ایاک نستعین

دیکھا آپ نے کیسا پیارا استعارہ 'مینار' لایا گیا ہے اور اسی مناسبت سے آگے لفظ 'خورشید' کا التزام کیا گیا ہے۔ اور پھر مصرعۂ ثانی کی نزاکت دیکھیے کہ ''اس دور کے غلام'' اور 'ماضی کے فاتحین' میں کیسا خوبصورت اور لطیف تضاد پیدا کیا گیا ہے نیز لف ونشر غیر مرتب کا بھی اہتمام۔ بہر کیف یہاں تجزیہ کا موقع نہیں، بلکہ اشارتاً شعری خصوصیات کا ذکر کرکے ان کی قادرالکلامی کا ثبوت فراہم کرنا تھا۔ اسی طرح نعت پاک کے دو شعر ملاحظہ فرمایئے:

جھک سکتا نہیں پرچم حق، بازوئے باطل　　ناکام تھا ناکام ہے ناکام رہے گا
بوجہل کے کردار سے واقف ہے زمانہ　　بدنام تھا بدنام ہے بدنام رہے گا

حالاں کہ کلام مختصر ہے لیکن جامعیت کے باعث پس منظر بہت وسیع ہے اسی کو فن شاعری کہتے ہیں کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ اب دونوں شعر کے مصرعۂ ثانی پر ذرا غور کیجیے کہ شاعر نے کتنی چابک دستی سے 'ماضی، حال اور مستقبل' مصرعے میں داخلی لفظ کی تکرار سے صوتی آہنگ پیدا کیا ہے۔ یہ ان کے فنی کمال کا بین ثبوت ہے۔ اب چند اشعار غزل کے بھی سماعت فرمایئے:

اس کا لہجہ اس کی فطرت سے ہے کتنا مختلف　　آتی ہوں ٹھنڈی ہوائیں جیسے ریگستان سے
میں بھول بیٹھا ہوں رفتار اپنے قدموں کی　　پھر ایک بار ذرا دور چل کے دیکھنا ہے
ہم تو اس گاؤں کے باسی ہیں جہاں آج بھی لوگ　　چاک دیوار کو مٹی سے رفو کرتے ہیں

غزل کے مختلف النوع سبھی اشعار یہاں پر تو نقل کرنا ناممکن تھا لیکن علاحدہ علاحدہ مضامین پر مبنی کچھ اشعار درج کیے گئے ہیں۔ ان سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ معصوم کے کلام کی آواز بالکل نئی ہے جس میں اضمحلال کے بجائے استقلال ہے۔ مایوسی کے بجائے امیدی ہے۔ پستی کے بجائے حوصلہ ہے۔ کرختگی کے بجائے نرمی ہے۔ تصنع کے بجائے حقیقت ہے۔ ماضی کے بجائے حال ہے۔ پیچیدگی کے بجائے سادگی ہے۔ شور کے بجائے سنجیدگی ہے۔ یہ جملہ خوبیاں انھیں معاصرین شعرا میں ممتاز کرتی ہیں۔

دو دونی پانچ (منظوم ڈرامے)

مصنف: معصوم انصاری

صفحات: 88، قیمت: 65 روپے/ ناشر: معصوم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی بھیونڈی

'دو دونی پانچ' معصوم انصاری کے منظوم ڈراموں کی کتاب ہے۔ جس کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے کائنات پبلیکیشنز بھیونڈی مہاراشٹر نے شائع کیا۔ اس کتاب میں پیڑ کی گواہی، انصاف، دو دونی پانچ، کالی گڑیا، پانڈو حولدار، لالچ کا انعام، ایک مشاعرہ ایسا بھی، ناخدا، اور فریادی کے عنوان سے 9 ڈرامے شامل ہیں۔ یہ سبھی ڈرامے اصلاً بچوں کے لیے ہیں اس لیے معصوم انصاری نے بچوں کی سطح سے ہی کلام کیا ہے۔ یہاں وہ غزل والے نہیں بلکہ بچوں والے معصوم ہیں۔ منظوم ڈرامہ لکھنا ایک مشکل فن ہے کیوں کہ ایک طرف ڈرامہ کے فن سے واقفیت اور بنیادی لوازمات کو برتنے کا سلیقہ ہونا چاہیے، تو دوسری طرف مضمون کو نظم کرنے کی خداداد صلاحیت۔ یہ دونوں صلاحیت بدرجۂ اتم معصوم انصاری میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے ڈراموں کی خصوصیت یہ ہے کہ پلاٹ بہت دلچسپ ہوتا ہے، کرداروں کے مکالمے بہت جامع اور برجستہ ہوتے ہیں۔ مکالموں میں ظریفانہ رنگ کے ذریعے حسن کاری کی گئی ہے۔ منظر کشی عمدہ ہے۔ ان ڈراموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان ڈراموں کا تانا بانا ایسی کہانیوں سے بنا گیا ہے جو بچوں کے لیے دلچسپ بھی ہے اور نصیحت آمیز بھی۔ ''پیڑ کی گواہی'' سے ایک مثال ملاحظہ ہو:

'پیڑ کی گواہی' بہت اچھا ڈرامہ ہے۔ اس کی مختصر کہانی یہ ہے کہ زید نے اپنے دوست قیس کو تنگی کے وقت دو لاکھ روپے بطور قرض دیے، لیکن بعد مدت قیس نے انکار کر دیا کہ کوئی پیسہ میں نے نہیں لیا، یہ قضیہ عدالت پہنچا، قاضی نے دونوں کی بات سن کر زید سے گواہ طلب کیا، لیکن زید گواہ پیش کرنے سے قاصر تھا کیوں کہ اس نے کسی کو گواہ نہیں بنایا تھا، تو قاضی نے جگہ کی نشان دہی کے طور پر پوچھا کہ جہاں پیسہ دیا تھا وہاں کچھ تھا، تو مدعی نے کہا کہ ہاں قریب میں ایک پیڑ تھا۔ قاضی مدعی کو، پیڑ کو بلانے کا اور مدعا علیہ کو اس کے واپس آنے تک وہیں کھڑا رہنے کا حکم دیتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد تھکاوٹ کے باعث قیس پریشان ہونے لگا، تو قاضی نے کہا اب تو وہ واپس آ ہی رہا ہوگا، تب قیس نے

قاضی سے کہا کہ ابھی تو وہ وہاں تک پہنچا بھی نہیں ہوگا، اسے وہاں جانے اور آنے میں ایک گھنٹہ لگے گا۔ بہر کیف تھکا ماندہ زید آتا ہے اور مایوسی سے کہتا ہے، پیڑ تو آیا نہیں لیکن میں آپ کا حکم سنا کر واپس چلا آیا ہوں، قاضی زید کی طرف مخاطب ہو کر کہتا کہ تمھارے آنے سے پہلے پیڑ گواہی دے کر چلا گیا ہے اور پھر فیصلہ سناتا ہے کہ:

رب اگر چاہے تو پتھر بھی پگھل سکتا ہے　　پاؤں والوں کی طرح پیڑ بھی چل سکتا ہے
سچ سے انکار کی اب کوئی نہیں گنجائش　　ہر جگہ جھوٹ کا سکہ نہیں چل سکتا ہے
جب وہاں زید سے منگوائے نہیں تھے پیسے　　فاصلہ پیڑ کا پھر تم نے بتایا کیسے
جرم جو تم نے کیا ہے نہ چھپے گا ہرگز　　کوئی مجرم نہ بچا ہے نہ بچے گا ہرگز

اسی طرح کے دلچسپ اور سبق آموز ڈرامے 'دو دونی پانچ' میں نظم کیے گئے ہیں، جو بہت ہی اچھے ہیں۔ ان ڈراموں کی وجہ سے معصوم انصاری ادب اطفال میں بھی زندہ رہیں گے۔ اور جب بھی بچوں کے ادب کی تاریخ مرتب ہوگی تو معصوم انصاری کا نام نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

حوادث ہجراں

مصنف: سیدہ ناہید حسین کرہانی/صفحات: 216، قیمت: 150 روپے

سیدہ ناہید کرہانی کا شعری مجموعہ 'حوادث ہجراں' زندگی کا داستان عشق ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں زندگی کے ان احساسات کو نظم کیا ہے جو انسان کی ناکامی کا پیش خیمہ ہیں، یعنی ''عشق''۔ عشق ایک ایسا فطری زہر ہے جس کا تریاق مطلوب محض ہے۔ اس کوچہ میں جس نے اپنے کو با معنی بنایا وہ بھی تکمیل زندگی کا متمنی ہے اور جو اس لذت درد سے نا آشنا رہا وہ بھی کامل زندگی کا حریص۔ غالب کو بھی اس کا احساس تھا کہ آدمی کی پرواز میں بنیادی رکاوٹ عشق ہے کیوں کہ عشق ہی انسان کو نکما بناتا ہے، ورنہ وہ یہ ہرگز نہ کہتے ''عشق نے غالب نکما کر دیا۔ ورنہ ہم بھی تھے آدمی کام کے''۔ ناہید نے ناکام عشق کی لسیاتی کیفیت کو اس شد ومد سے بیان کیا ہے جو بذات خود ان کا کلام حوادث ہجراں کا شکار ہو گیا۔ مثال کے لیے چند اشعار آپ کے پیش نظر ہیں:

نہ زندگی کو چاہو نہ زندگی سے پیار کرو　　یہ تو بے وفا ہے اس کے لیے نہ آہیں بھرو
اب تو کٹ رہی ہے بری بھلی اپنی　　کس کس طرح رلا رہی ہے ہمیں زندگی اپنی
میں نے جس کو چاہا تھا جان سے زیادہ　　اس نے چھوڑ دیا یہ کہہ کر تو لڑکا غریب ہے

بقول شخصے: ناکام عاشق شاعر بنتا ہے اور کامیاب عاشق ولی۔ شاعری وہ فن ہے جو جذبات وکیفیات کو در پردہ پیش کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر نثر آئینہ خانہ ہے تو نظم میخانہ۔ کسی دوسرے کے ذاتی خیالات کو دو بنیادی وجہ سے پڑھا جاتا ہے یا تو اس میں ہمیں کوئی نیا مضمون ملے یا پھر حظ۔ اگر ان دونوں صفت کی ہم آہنگی سے کوئی شے وجود پذیر ہو، تو اسے کہتے ہیں تخلیق، اور اگر یہ دونوں صفت جدا جدا ہوں، تو ایک کو کہتے ہیں معلومات اور دوسرے کو لطیفہ۔ ناہید نے جن مضامین کو نظم کیا وہ نئے نہیں ہیں بلکہ روز اول سے بطن غزل میں سموئے ہیں اس لیے ان کا کلام 'معلومات' نہیں ہے۔ دوسرے ہر شخص عشق ومحبت کی کامیابی یا ناکامی کے مراحل سے گزرتا ہے، اس لیے باعث حظ بھی نہیں۔ اور نہ ہی دونوں کا باہمی ربط ہے اس لیے فنون لطیفہ بھی نہیں۔ ہاں ان کی کوشش کو سراہنا ہمارا فریضہ ہے کیوں کہ ہر آدمی کو یہ بھی میسر نہیں کہ اپنے خیالات کو شعری شکل عطا کر سکے۔ اگر ناہید نے اپنا مشق سخن جاری رکھا تو امید ہے کہ بہت جلد مضمون کو نظم کرنے کا فن اور ارتقائے سخن کا ہنر ان کی شاعری میں پیدا ہو جائے گا۔

حرف شرر

مصنف: ڈاکٹر حبیب عادل، مرتب: وقار قادری/صفحات: 200، قیمت: 250

'حرف شرر' حبیب عادل کا شعری مجموعہ ہے۔ اس کے اولین 80 صفحات عادل کی شخصیت اور شاعری کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس کتاب کے دوسرے حصہ میں عادل کا کلام شامل ہے، جس میں حمد، نعت، منقبت، غزل، آزاد نظم اور گیت بھی کچھ شامل ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

منظر سے پوچھیے پس منظر سے پوچھیے　　کیوں خامشی ہے شہر میں پتھر سے پوچھیے
ترے آنے سے معطر ہو گیا حمام بھی　　مجھ کو پانی میں ترے تن کی مہک اچھی لگی
سڑک کی بھیڑ میں تم، کھو نہ جانا　　ہمیشہ پاس میں اپنا پتا رکھ
من کا تالاب کتنا گندہ ہے　　ذمہ دار اس کی ایک مچھلی ہے

عادل کا شمار جھارکھنڈ کے معروف شعرا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی شناخت غزل گوئی سے قائم ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں روایت کا احترام کیا ہے اور اس کے ساتھ عصری تقاضوں کا بھی۔ ان کی شاعری میں جو چیز سب سے زیادہ ابھر کر سامنے آتی ہے، وہ ہے سماج کا عصری منظر نامہ۔ کیوں کہ انہوں زیادہ تر مضامین زندگی کے حقائق اور اس کی قدروں کے نشیب وفراز سے اخذ کیے ہیں جن کا تعلق گرد وپیش کے محسوسات سے ہے۔ ان کی شاعری میں کسی طرح کی پیچیدگی، ابہام اور تصنع نہیں پایا جاتا ہے، وہ بہت سادہ اور عام فہم زبان بلکہ روز مرہ میں اپنے خیالات کو پیش کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں اس لیے ان کا اظہار بیان سادہ اور سپاٹ ہے لیکن معنوی اعتبار سے بہت پر اثر ہے۔ جس کی گونج دیر پا ثابت ہوتی ہے۔

بھیگے موسم کی صدا

مصنف: محسن باعشن حسرت/صفحات: 208، قیمت: 200 روپے/ ناشر: گلستان پبلی کیشنز، کلکتہ

محسن باعشن حسرت کا تخلیقی سفر بچوں کی نظموں سے شروع ہوتا ہے۔ ان کا بچوں کی نظموں کا پہلا مجموعہ 'بچے پھول ہوتے ہیں' 2000 میں شائع ہوا، جس پر اتر پردیش اور مغربی بنگال اردو اکادمی کی جانب سے انعامات تفویض کیے گئے۔ تیرہ سال کے وقفے میں ان کے دو اور شعری مجموعے 'بچے ہوتے ہیں معصوم' (بچوں کی نظمیں) اور 'بھیگے موسم کی صدا' (غزلوں کا مجموعہ) 2013 میں مشتہر ہوا۔ نیز ان کا متفرق کلام ادبی رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ان کی ایک دو نظمیں مغربی بنگال اور مہاراشٹر کے نصابی کتاب میں بھی شامل ہیں۔ ایسے تو حسرت کا شمار ادب اطفال میں ہوتا ہے۔ لیکن ان کی غزلوں کے مجموعے کی اشاعت سے اب ان کا شمار بڑوں کے ادب میں بھی ہونے لگا ہے۔ ان کی غزلوں کا پیرایہ اظہار بہت ہی سیدھا سادہ ہے، لیکن فکر مضمون بڑا بالیدہ ہے۔ انہوں نے عصر حاضر کے ان مسائل کو اپنی غزلوں میں جگہ دیا ہے جو آج عام انسانوں کا مقدر بنا ہوا ہے۔ مثلاً: تنہائی، الجھن، بے چینی، بے رخی، مایوسی، اخلاقی فقدان، ضمیر فروشی، زندگی کے پیچیدہ مسائل اور انسانی قدروں کی پامالی وغیرہ۔ چند مثالیں آپ بھی دیکھیے:

اوب گیا ہوں اک کمرے میں تنہا بتے رہتے　　اس تنہائی کو اک شام سہانی بھیج دے مولا
ملتا نہیں کسی سے کوئی اب خلوص سے　　حسرت تو ہی بتا کہ کدھر جائے آدمی
جہاں ہوا ہو نہ تقسیم پیار دل کا بھی　　کہاں اب ایسا کوئی گھر دکھائی دیتا ہے
اخلاص، فرض، پیار، محبت کو چھوڑ کر　　انسانیت کو آج مٹانے لگے ہیں لوگ

حسرت حالات سے مایوس نہیں، بلکہ اسے بدلنے کا بلند حوصلہ رکھتے ہیں۔ اگر وہ ایک طرف اپنی غزل میں عصری مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں تو دوسری طرف اس کے ازالے کے اسباب وعلل بھی بیان کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے مضامین میں فکر کی بلندی بے مثال ہے، لیکن ان مضامین کو نظم کرنے کا فن نیم پختہ ہے جس کی وجہ سے ان کی غزل میں وہ حسن نہیں، جس کی فکر متمنی تھی۔

شاکر علی صدیقی
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

عالمی اردو نامہ

شارجہ عالمی کتاب میلہ میں قومی اردو کونسل کی شرکت

شارجہ: شارجہ بک اتھارٹی (ایس بی اے) کی جانب سے منعقدہ عالمی کتابی میلہ 2017 میں پہلی بار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کو شرکت کا موقع ملا۔ قومی اردو کونسل کے اسٹال کو ناظرین نے بہت سراہا اور کتابوں کے تعلق سے اچھے تاثرات کا اظہار کیا اور قومی اردو کونسل کو ایک توصیفی سند سے بھی نوازا گیا۔ شارجہ تک کا یہ سفر قومی اردو کونسل کے لیے یقیناً باعث مسرت ہے اور اس کا سہرا پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال کے سر ہے کہ انھی کی کوششوں سے قومی اردو کونسل کو ایک ایسے کتاب میلے میں اپنی کتابوں کی نمائش کا موقع ملا جس میں تقریباً 60 ممالک سے ایک لاکھ چھ ہزار پانچ سو ناشرین کتب نے شرکت کی تھی۔ گیارہ دن تک چلنے والی اس تقریب میں تقریباً ایک سو پانچ ملین ٹائٹل کا ڈسپلے کیا گیا تھا۔ یہ دنیا کا چوتھا بڑا کتاب میلہ ہے جس کا آغاز شیخ سلطان بن محمد القاسمی کی سرپرستی میں 1982 سے ہوا تھا۔ یہ اس میلے کا چھتیسواں ایڈیشن تھا اور اس کا تھیم تھا اے ورلڈ ان مائی بک (A World in My Book)۔ اس میلے میں نئی ثقافت کی کھڑکیاں کھولنے کے علاوہ نئی نسل میں قرأت کی اہمیت کو اجاگر کرنے اور ترقی پسند معاشرے کی تشکیل پر زور تھا۔ اس میں پوری دنیا سے مصنفین اور دانشوروں نے شرکت کی تھی۔ اس شارجہ عالمی کتاب میلہ (SIBF) میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے شرکت کی اور انھوں نے وہاں ناظرین اور قارئین کے ہجوم کو دیکھتے ہوئے کہا کہ فروغ اردو کے لیے یہ خوش آئند بات ہے کہ شارجہ جیسے علاقے میں اردو سے جذباتی محبت کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ

'اردو زبان و ثقافت اور موجودہ عالمی مسائل' کے موضوع پر
قومی اردو کونسل کی پانچویں عالمی اردو کانفرنس

نئی دہلی: عمومی اور سطحی موضوعات پر کانفرنس اور سیمنار کے انعقاد سے گریز اور نئے مفید موضوعات پر زور دیتے ہوئے مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے ماہرین اور دانشوروں پر مشتمل قومی اردو کونسل کی عالمی اردو کانفرنس بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے اس کا پیغام پوری اردو دنیا تک جاتا ہے۔ اس لیے پانچویں عالمی اردو کانفرنس کے لیے بھی ایسے موضوع کا انتخاب کیا جائے جس کے مثبت اور مفید نتائج برآمد ہوں۔

کانفرنس کمیٹی کے ممبران نے پانچویں عالمی اردو کانفرنس کے لیے 'اردو زبان و ثقافت اور موجودہ عالمی مسائل' کو مرکزی عنوان کے طور پر اتفاق رائے سے منظور کیا ہے۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے موضوع کے تعین، کانفرنس کے طریق کار پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل نے کانفرنس کے اعلیٰ علمی اور ادبی معیار کو ہمیشہ قائم رکھا ہے۔ کونسل کی عالمی

انڈیا انٹرنیشنل سینٹر نئی دہلی میں منعقدہ اس میٹنگ میں ممتاز ناقد پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، شاہد مہدی (سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ)، پروفیسر طارق منصور (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)، ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ (سابق ڈائرکٹر قومی اردو کونسل)، پروفیسر اعجاز علی ارشد (سابق وائس چانسلر مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی پٹنہ)، عزیز برنی (سابق گروپ ایڈیٹر روزنامہ راشٹریہ سہارا)، امتیاز کریمی (ڈائرکٹر اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ)، پروفیسر عین الحسن (جواہر لعل نہرو یونیورسٹی)، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی (سابق پروفیسر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی)، پروفیسر قدوس جاوید (سابق پروفیسر کشمیر یونیورسٹی)، کیول دھیر (لدھیانہ)، ڈاکٹر قاسم خورشید (پٹنہ) اور سید فیصل علی (گروپ ایڈیٹر روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو) نے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کیا۔ تمام ممبران نے متفقہ طور پر یہ کہا کہ کانفرنس کے لیے ایسے موضوع کا انتخاب کیا جائے جس سے عالمی تناظر میں اردو کی معنویت، مقام، اہمیت اور رسائی کا اندازہ ہو سکے اور یہ پتہ چل سکے کہ اردو نے دنیا کی تہذیب و ثقافت کو کیا دیا

ہے۔ خاص طور پر موجودہ عالمی مسائل مثلاً دہشت گردی، ہجرت، پناہ گزینی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی پر موضوع کو مرکوز رکھا جائے اور یہ کانفرنس کثیر جہتی مقاصد پر محیط ہو۔ مختلف ذیلی عنوانات کے ذریعے اردو کے عصری عالمی منظرنامے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ ممبران نے اس بات پر بھی توجہ دلائی کہ ہمیں اپنے حدود سے باہر نکل کر نئے امکانات اور موضوعات تلاش کرنے چاہییں۔ خاص طور پر کراس کلچرل اسٹڈیز پر بھی توجہ دیے جانے کی ضرورت ہے۔

اس میٹنگ میں ممبران نے اردو میں تراجم اور انٹرنیٹ پر دستیاب اردو مواد کے تعلق سے بھی اظہار خیال کیا اور یہ بتایا کہ انٹرنیٹ پر اردو کے لغات اور دوسری اہم اطلاعات مہیا نہیں ہیں اس پر بھی دھیان دیے جانے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ کانفرنس کے فارمیٹ کو بھی تبدیل کرنے پر زور دیا گیا تاکہ زیادہ سے زیادہ عوامی شرکت ممکن ہو سکے اور اردو زبان کو عام آدمی سے جوڑا جا سکے۔

واضح رہے کہ قومی اردو کونسل ہر سال عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کرتی ہے جس میں ملک اور بیرونی ممالک کے مندوبین متعلقہ موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ قومی اردو کونسل کی پانچویں عالمی اردو کانفرنس 23 تا 25 مارچ 2018 کو متوقع ہے جس میں پوری دنیا کے دانش وراور علمائے ادب وثقافت شرکت کریں گے۔

قومی اردو کونسل کی اس میٹنگ میں پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، محمد افضل، محمد شہاب الدین، آبگینہ عارف، حقانی القاسمی اور محمد طاہر بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 6 ستمبر 2017

کونسل مشاہیر عربی ادب پر کتابیں شائع کرے گی: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں عربی پینل کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دھلی: (پریس ریلیز)، دوسری زبانوں کی ادبیات سے اردو زبان وادب کی ثروت میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ اردو ادب میں عالمی ادب کے بہت سے شاہ کار ترجمے کی صورت میں اردو قارئین تک پہنچے ہیں اور ان

سے نہ صرف ہماری آگہی میں اضافہ ہوا بلکہ مختلف ملکوں کی ثقافتوں کے مابین ربط کی صورت بھی پیدا ہوئی ہے۔ کونسل اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے مشاہیر عربی ادب پر کتابیں شائع کرنا چاہتی ہے تاکہ اردو حلقہ بھی ان مشاہیر سے واقف ہو سکے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ عربی زبان پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ عربی زبان و ادب سے ہندوستان کا بہت گہرا رشتہ رہا ہے یہاں عربی کے بہت سے شعرا اور نثر نگار ہیں جنھیں عالمی سطح پر شناخت حاصل ہے۔ کونسل ہندوستان میں عربی ادب سے جڑے ہوئے فنکاروں پر ترجیحی طور پر کتابیں شائع کرے گی تاکہ عالم عرب کو ہندوستان کی ادبی خدمات کا اندازہ ہو سکے۔ اس میٹنگ کی صدارت پروفیسر نعمان خان نے کی۔ انھوں نے مشاہیر عربی ادب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ کونسل کے لیے ایک نئے باب کا آغاز ہوگا۔ اس موقع پر دوسرے ممبران نے بھی اپنی آرا رکھی۔

میٹنگ میں حسنین اختر، پروفیسر مسعود انور علوی، ڈاکٹر مشیر حسین صدیقی، محمد علاء الدین ندوی، جناب مولانا صہیب قاسمی کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، محترمہ آبگینہ عارف، ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 14 دسمبر 2017

کونسل کے تعاون سے

اردو کے تاریخی ناول

وانم باڑی: شعبۂ اردو اسلامیہ ویمنس کالج وانم باڑی تمل ناڈو کے زیر اہتمام باشتراک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، دو روزہ قومی سیمینار 'اردو کے تاریخی ناول - ایک تحقیقی جائزہ' کے موضوع پر 10،11

اکتوبر 2017 کو عمل میں آیا۔ جس میں کل تین ریاستوں کی تقریباً 30 مقالہ نگار خواتین نے اپنے گراں قدر تحقیقی اور تنقیدی مقالات پیش کیے۔ پہلے دن کے افتتاحی اجلاس کی صدارت اسلامیہ ویمنس کالج کی پرنسپل محترمہ ڈاکٹر اختر بیگم صاحبہ نے کی۔ افتتاحی اجلاس کی مہمان خصوصی اُردو کی معروف ادیبہ، اے امیر النساء (میل وشارم) تھیں۔ محترمہ امیر النساء نے اپنی بصیرت افروز تقریر سے سامعین اور حاضرین کو محظوظ کیا۔ جبکہ کلیدی خطبہ محترمہ ڈاکٹر حلیمہ فردوس، سابق اُردو اسسٹنٹ پروفیسر آر سی کامرس کالج، بنگلور نے بحیثیت مہمانِ اعزازی پیش کیا۔

مہمانوں کا تعارف پروفیسر کے نادرہ بیگم نے کرایا۔ جبکہ نظامت کی ذمہ داری اسسٹنٹ پروفیسر ایس جی انیسہ بیگم اور پروفیسر فوزیہ حبیب نے بخوبی انجام دی۔ سیمنار کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ افتتاحی نشست کے ہدیہ تشکر کے بعد مقالوں کی نشست کا آغاز ہوا۔

پہلی نشست کی صدارت محترمہ ڈاکٹر حلیمہ فردوس نے کی۔ اس نشست میں محترمہ ڈاکٹر نجیبہ سلطانہ، ڈاکٹر شاہین قاضی، پروفیسر سعیدہ بیگم اور محترمہ اسماء عثمانی نے پرمغز مقالات پیش کیے۔ دوسری نشست کی صدارت ڈاکٹر نجیبہ سلطانہ نے کی۔ اس نشست میں حسینہ بیگم، پروفیسر تزئین جمال، پروفیسر طاہرہ بیگم، عرفانہ تزئین نے مقالات پیش کیے۔ تیسری نشست کی صدارت ڈاکٹر پروین فاطمہ سابق صدر شعبۂ اُردو کوئین میری کالج، چنئی نے کی۔ اس نشست میں ڈاکٹر بشیرہ سلطانہ، پروفیسر مسعودہ، پروفیسر مسعودہ تسکین محترمہ فضیلہ بیگم، محترمہ عائشہ صدیقہ وغیرہ نے مقالات پیش کیے۔ چوتھی نشست کی صدارت ڈاکٹر بشیرہ سلطانہ صدر شعبۂ اُردو (جسٹس بشیر احمد سعید کالج) چنئی نے کی۔ پروفیسر نکہت سلطانہ، پروفیسر فوزیہ حبیب، محترمہ رشیدہ پروین، محترمہ کریم النساء نے مقالات پیش کیے۔

اختتامی اجلاس کی صدارت وائس پرنسپل اسلامیہ ویمنس کالج وانم باڑی محترمہ عارفہ بشیر صاحبہ نے کی۔

ڈاکٹر پروین ناظمہ نے تمام مقالہ نگاروں کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے منتظمین سیمنار کی تعریف کی اور قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی کی سرگرمیوں کی ستائش کی۔

(رپورٹ: پروفیسر کے نادرہ بیگم، صدر شعبۂ اُردو اسلامیہ ویمنس کالج، وانم باڑی، تمل ناڈو، 16 نومبر 2017)

اردو ادب کی ترویج و تشکیل میں خواتین کا کردار

سرینگر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون، کشمیر انور انمل اینڈ سوشل آرگنائزیشن اور ڈگری کالج سوپور کے باہمی اشتراک سے یک روزہ ریاستی سیمنار 'اردو ادب کی ترویج و تشکیل میں خواتین کا کردار' کے موضوع پر 28 نومبر 2017 کو منعقد ہوا۔ اس پروقار سیمنار میں وادی کے اطراف و اکناف سے محبان اردو اور مختلف ادبی و علمی شخصیات نے شرکت کی۔ سیمنار کی افتتاحی نشست کی صدارت جسٹس (ر) بشیر احمد کرمانی نے کی۔ اس موقعے پر ایوان صدارت میں پروفیسر شفیقہ پروین اور پروفیسر منصور احمد منصور اور میزبان پروفیسر مشتاق احمد ڈار موجود تھے۔ سیمنار کی نظامت کے فرائض ارشاد آفاقی نے انجام دیے۔ پروفیسر مشتاق احمد ڈار نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ سیمنار کی کارروائی کو آگے بڑھاتے ہوئے کشمیر انور انمل اینڈ سوشل آرگنائزیشن کے صدر افتخار رشید نے سیمنار کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ کلیدی خطبہ ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری نے پیش کیا۔ اس نشست میں پروفیسر شفیقہ پروین صاحبہ اور پروفیسر منصور احمد منصور نے اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں صاحب صدر نے اپنے پرمغز صدارتی کلمات سے سامعین کو محظوظ کر کے خوب داد و تحسین وصول کی۔ آخر میں ڈاکٹر ظہور مخدومی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ تعمیل ارشاد سری نگر، 30 نومبر 2017

تحریری مقابلہ

- ← زبانوں کے مسائل اور عالم کاری
- ← عالمی مسائل کا اظہار اردو ادب میں (فکشن، ڈراما، شاعری، صحافت، انشائیہ کے حوالے سے)
- ← عالمی مسائل کا اظہار تانیثیت کے حوالے سے
- ← اردو ادب تصوف اور امن عالم
- ← عالمی مسائل کا شعور اور اردو صحافت

مندرجہ بالا عنوانات پر قلم کاروں سے مضامین مطلوب ہیں۔ سب سے اچھے مقالے پر پانچ ہزار روپے، دوسرے مقالے پر تین ہزار اور تیسرے مقالے پر دو ہزار روپے کے انعامات دیے جائیں گے۔ دیگر اچھے مضامین پر تشجیعی انعامات دیے جائیں گے۔ مقالہ کم سے کم تین ہزار الفاظ پر مشتمل ہونا چاہیے۔ مقالہ ان پیج میں ٹائپ شدہ درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں:

director@ncpul.in, urdudunyancpul@yahoo.co.in

مقالہ موصول ہونے کی آخری تاریخ 15 فروری 2018 ہے۔

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی

آپریشن ڈیجیٹل بلیک بورڈ

نئی دہلی: فروغ انسانی وسائل کے وزیر پرکاش جاوڈیکر نے کہا کہ ملک بھر کے طالب علموں کو ڈیجیٹل تعلیمی نظام سے مربوط کرنے کی پہل کے تحت آنے والے برسوں میں ملک کے تمام اسکولوں میں 'آپریشن ڈیجیٹل بلیک بورڈ' کو نافذ کیا جائے گا۔ تعلیم کے موضوع پر منعقدہ دوروزہ ورکشاپ

سے خطاب کرتے ہوئے جاوڈیکر نے کہا کہ حکومت اور تعلیم کے میدان میں کام کرنے والے مختلف اداروں کو مواد اور مشترکہ ڈیجیٹل پلیٹ فارم تیار کرنے کی سمت میں تعاون کرنا چاہیے تاکہ ملک کے تمام طالب علموں کو ڈیجیٹل تعلیمی نظام سے منسلک کیا جاسکے۔ انھوں نے کہا کہ اس ورکشاپ میں تعلیم سے منسلک مختلف نکات پر تمام فریق بات چیت کریں گے جسے پانچ موضوعات ڈیجیٹل تعلیم، زندگی سے متعلق مہارت تعلیم، قابل استعمال درس وتدریس، جسمانی تعلیم اور اخلاقی تعلیم شامل ہیں۔ جاوڈیکر نے کہا کہ جسمانی تعلیم کے بغیر تعلیم نامکمل ہے۔ طالب علموں کو یوگا، ایروبکس، دوڑنے جیسی جسمانی مشق کرنا چاہیے جو اپنی پسند کے مطابق ہیں۔ جس سے جسم تندرست رہتا ہے۔ مرکزی وزیر نے کہا کہ زندگی کی مہارت سے منسلک تعلیم اور اخلاقی تعلیم وقت کی ضرورت ہیں اور مجموعی ترقی کے لیے ہمیں انھیں اپنے رویے میں شامل کرنا چاہیے۔ فروغ انسانی وسائل کے وزیر نے کہا کہ اس ورکشاپ کے ذریعے ہم ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور اس سے تعلیم کے پس منظر کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 نومبر 2017

علم صرف کتابوں تک ہی محدود نہیں: جاوڈیکر

نئی دہلی: فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر نے کہا کہ علم صرف کتابوں سے ہی نہیں ملتا بلکہ اسکل اور کھیل کود، ورزش وغیرہ سے بھی آدمی علم حاصل کرتا ہے اور بہت کچھ سیکھتا ہے۔ مسٹر جاوڈیکر نے یہاں تعلیم پر منعقدہ دوروزہ ورکشاپ میں یہ باتیں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک طالب علم کے لیے جسمانی تعلیم اور اسکل حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ تعلیم صرف کتابوں تک محدود نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ انسانی اقدار کی تعلیم روایتی تعلیم کے مقابلے میں زیادہ بامعنی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم صرف ریاستی مسئلہ نہیں بلکہ یہ ایک قومی مسئلہ ہے اور ہم سب اس میں برابر کے شریک ہیں۔ مسٹر جاوڈیکر نے ڈیجیٹل تعلیم پر زور دیتے ہوئے کہا کہ خواہ سرکاری تعلیمی ادارے ہوں یا پرائیویٹ یا این جی او سب اچھا کام کررہے ہیں، لیکن سب کو ایک چھت کے نیچے لانا ہے تاکہ معیار کو بہتر بنایا جاسکے۔ اس لیے بی وائی جے یو نام کا ایپ اچھا کام کررہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پہلے بلیک بورڈ سے تعلیم ہوتی تھی اور اب پورے ملک میں ڈیجیٹل بورڈ سے تعلیم دی جارہی ہے لیکن اس سے اساتذہ کا کردار کم نہیں ہوتا ہے۔ فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر نے کہا کہ اساتذہ کو جدت اپنانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ طالب علموں کے مسائل کو حل کرسکیں۔ ورک شاپ میں مسٹر جاوڈیکر نے شگھا سارتھی نام کا ایک پورٹل بھی جاری کیا جس پر تعلیم کے میدان میں پوچھے گئے تمام پروگراموں کو ایک جگہ شامل کیا جائے گا۔ کیمپ کو فروغ انسانی وسائل کے وزیر مملکت ستیہ پال سنگھ اور اسکول کے ایجوکیشن سکریٹری انل سوروپ نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 7 نومبر 2017

تلنگانہ میں اردو دوسری سرکاری زبان

حیدر آباد: ریاست تلنگانہ میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا بل قانون ساز اسمبلی میں متفقہ طور پر منظور کرلیا گیا۔ اسمبلی میں وزیر اعلیٰ کے چندر شیکھر راؤ کی جانب سے ان کی عدم موجودگی میں وزیر پنچایت راج ٹی ناگیشور راؤ نے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا بل پیش کیا جسے تمام جماعتوں کی حمایت حاصل رہی۔ وزیر پنچایت راج ٹی ناگیشور راؤ نے جناب اکبرالدین اویسی فلور لیڈر مجلس کے مطالبہ پر اردو اکادمی کی تشکیل اور سرکاری زبان کمیشن میں اردو کا نمائندہ مقرر کرنے کا بھی اعلان کیا۔ ٹی ناگیشور راؤ نے کہا کہ ریاست بھر میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جارہا ہے وہیں وہ بھی اردو سیکھنے کی کوشش کریں گے۔ اردو چونکہ مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، بھارت کی زبان ہے سب لوگ اردو بولتے ہیں اور اسی لیے تمام جماعتوں نے اس کی حمایت کی ہے۔ وزیر اعلیٰ کے چندر شیکھر راؤ خود اردو سے محبت کرتے ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 نومبر 2017

چھ روزہ میموری ڈیولپمنٹ ورکشاپ

نئی دہلی: مرکزی وزیر کامرس اینڈ انڈسٹریز سریش پربھو انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں میموری ڈیولپمنٹ کی کارکردگی دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہندوستان

کے مسلم نوجوان تعلیمی وتربیتی میدان میں اسی طرح آگے بڑھتے رہے تو ہندوستان کو سپر پاور بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں چھ روزہ میموری ڈیولپمنٹ ورکشاپ کی اختتامی تقریب میں شرکا کی کارکردگی کا مشاہدہ کرنے کے بعد بطور مہمان خصوصی خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے میموری ٹرینر محمد عبداللطیف خان اور ان کی ٹیم کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ مجھے یہاں آنے سے پہلے کچھ خاص اندازہ نہیں تھا کہ یہاں کیا نظارہ دیکھنے کو ملے گا لیکن جب میں یہاں آیا تو میموری کے استاد نے جو جادو دکھایا اس سے میں حیران رہ گیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں محض چھ دن کی ورکشاپ میں میموری کے نسخے سیکھ کر چند شرکا نے جس کارکردگی کا

مظاہرہ کیا وہ میرے نزدیک ناممکن سی بات ہے مگر جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا وہ جادو نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ واضح رہے کہ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں میموری ڈیولپمنٹ کی یہ دسویں سالانہ ورکشاپ تھی اور اس میں اس مرتبہ صرف اسکولوں کے ٹیچرس کو ہی داخلہ دیا گیا تھا۔اس موقعے پر عبداللطیف خان کے ذریعے تیار کردہ میموری ڈیولپمنٹ پر مشتمل ایک نصاب کا بھی اجرا کیا گیا۔ اس نصاب کے تحت فی الحال انھوں نے چار کتابوں کا ایک سیٹ تیار کیا ہے۔ واضح رہے کہ دنیا میں ابھی تک اس فن پر کوئی نصابی کتاب ترتیب نہیں دی گئی ہے۔ ورکشاپ کے تمام شرکا کو سرٹی فکیٹ اوران چاروں کتابوں کا سیٹ بھی مفت دیا گیا۔ آئی آئی سی سی کے صدر سراج الدین قریشی نے اس موقعے پر مرکزی وزیر سریش پربھو کو بتایا کہ اس ملک کے مسلمانوں کی فکر تعمیری ہے اور اگر انھیں پرامن ماحول میسر ہو تو وہ کم وسائل میں بھی شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کر کے دکھا سکتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں منعقد ہونے والی تعلیمی وتربیتی ورکشاپ سے اب تک 15 ہزار سے زائد نوجوان تربیت پاکر روزگار سے لگ چکے ہیں۔ میموری ٹرینر عبداللطیف خان نے سریش پربھو کو بتایا کہ مسلمانوں کو اگر مواقع میسر ہوں تو وہ ہر میدان میں کمال حاصل کر سکتے ہیں۔ اس موقعے پر عبداللطیف خان کو مرکزی وزیر سریش پربھو کے ہاتھوں اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کی جانب سے انھیں ٹرافی، توصیفی سند کے علاوہ میموری خان کے لقب سے متصف سرٹیفکیٹ بھی پیش کیا گیا۔ ان کے ساتھ ہی دوسرے معاون میموری ٹرینرس نزہت صوفی خان اور حبیب الرحمٰن کو بھی اعزاز سے نوازا گیا۔ جن شرکا کو ان کی بہتر کارکردگی کی بنیاد پر اعزاز سے نوازا گیا ان میں افشا، فرح ادیبہ، ثنا، ثانیہ، نزہت، فائزہ، امرین، بلال مومن، مولانا ارشد، مفتی وسیم، فرحت اور افشاناز کے نام قابل ذکر ہیں۔ پروگرام کی نظامت پروگرام کے کوآرڈی نیٹر اور صحافی ایم ودود ساجد نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 نومبر 2017

'مغلوں کے آخری دور کا فارسی ادب' کے موضوع پر منعقدہ سمینار

مغلوں کے آخری دور کا فارسی ادب

نئی دہلی: بنیاد فارسی ہند، غالب انسٹی ٹیوٹ، و بنیاد بیدل تہران کی مشارکت سے غالب انسٹی ٹیوٹ میں دو روزہ بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سفیر ایران غلام رضا انصاری نے بنیاد فارسی ہند و غالب انسٹی ٹیوٹ کو سمینار کے انعقاد کی مبارک باد دی اور کہا کہ اس طرح کے سمیناروں کا انعقاد حقیقی طور پر مختلف اداروں کو ایک ساتھ مل کر کام کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور ساتھ ہی نئی نسل میں علمی کام کرنے کا ذوق وشوق پیدا کرتا ہے۔ ڈاکٹر شیدا محمد ابدالی (سفیر افغانستان) نے مغلوں کے آخری دور کے فارسی ادب پر مختصر گفتگو کی اور کہا کہ ایران، افغانستان و ہندوستان کے دانش مندوں اور اداروں کے لیے بیدل ایک مشترک نقطۂ نظر ہے اور اس سلسلے میں غالب انسٹی ٹیوٹ اور بنیاد فارسی ہند کے ذریعے اس سمینار کا انعقاد خوش آئند اقدام ہے۔ افتتاحی جلسے کے مہمان اعزازی پروفیسر ارتضیٰ کریم، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے متعلقہ امور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اضافہ کیا کہ بنیاد فارسی ہند قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی مالی و معنوی استمداد کے ساتھ فارسی اردو، ہندوستانی تہذیب وتمدن کے دو مشترکہ دھاروں پر ایک بین الاقوامی سہ یا چہار روزہ سمینار کا انعقاد کرنا چاہیے۔ پروفیسر آذرمی دخت صفوی، سابق ڈائرکٹر مرکز تحقیقات فارسی علی گڑھ نے اپنی تقریر میں کہا کہ آج بھی ہم بیدل کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے سبک ہندی ہی کو ٹھیک سے نہیں سمجھا، لہٰذا بیدل کو سمجھنے کے لیے سبک ہندی کو اساس سمجھنا چاہیے۔ اسی طرح ڈاکٹر عبداللہ (تاجکستان) نے ہندو تاجکستان کے ادبی روابط پر روشنی ڈالی اور کہا کہ بنیاد فارسی ہند و اتفاق نویسندگان تاجکستان کے درمیان دائمی مشارکت ہے۔

افتتاحی جلسے کے آغاز میں ڈاکٹر سید رضا حیدر، ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر بنیاد فارسی ہند کے سکریٹری ڈاکٹر علی اکبر شاہ نے اپنے تعارفی کلمات میں اس سمینار کے انعقاد کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی اور اضافہ کیا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی مشارکت سے ہر سال ایک بڑے پیمانے پر سمینار منعقد کرنے کے منصوبہ کو عملی پہنایا جائے گا۔ پروفیسر گل فشاں خان، شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کلیدی خطبہ پیش کیا جس میں انھوں نے مغلوں کے آخری دور کے فارسی ادب اوراس کے مختلف رجحانات پر بحث کی اور کہا کہ اس دور کا فارسی ادب درواقع بدلتے رجحانات کا ادب ہے اور شعر وشاعری کے علاوہ اس دور کے سفرنامے، تذکرے، ترجمے، لغات، تاریخیں نہایت اہم ہیں اور ان کا بالاستیعاب مطالعہ لازم جس کے فقدان کی وجہ سے اس دور کا ادب کم جانا گیا یا صرف چند ناموں کی وجہ سے معروف ہے۔ اپنے صدارتی کلمات میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کہا کہ بیدل پر منعقدہ یہ سمینار نہایت عمدہ اقدام ہے جس کے نتیجے میں بیدل کے علاوہ مغلوں کے آخری دور کے فارسی ادب پر نیز دانشمندوں کی توجہ مبذول ہوگی۔ آخر میں پروفیسر چندشیکھر، ڈائرکٹر بنیاد فارسی ہند نے اظہار تشکر میں مہمانان و سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت بنیاد فارسی ہند کے جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر سید نقی عباس کیفی نے کی۔ اس جلسے میں بڑی تعداد میں مختلف علوم وفنون کے افراد موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 نومبر 2017

محبوبہ مفتی کا اردو میں ٹویٹ

سری نگر: جموں وکشمیر کی وزیراعلیٰ محبوب مفتی نے اردو زبان میں بھی ٹویٹ کرنا شروع کردیا ہے۔ رواں برس کے 25 ستمبر کو ٹوئینگ کا آغاز کرنے والی محبوبہ مفتی کے اس اقدام کی سوشل میڈیا پر ستائش کی جارہی ہے۔ مبصرین کے مطابق محترمہ مفتی اردو میں ٹویٹ کرنے والی پہلی بھارتی سیاست دان بن گئی ہیں۔ وزیراعلیٰ نے اردو میں ٹوئینگ کا آغاز اتوار کو اس وقت کیا جب وہ شمالی کشمیر کے ضلع بانڈی پورہ میں عوامی دربار کے دوران وفود اور لوگوں سے ملاقات کررہی تھیں۔ انھوں نے اردو میں ٹویٹ کرتے ہوئے لکھا بانڈی پورہ میں عوامی وفود سے دن بھر ملاقات۔ اپنے ضلع کے مسائل اور تجاویز تحریری طور پر پیش کریں۔ محترمہ مفتی نے اردو زبان میں اپنا دوسرا ٹویٹ پیر کی صبح کیا اور لکھا کشمیر کے بیس بال کھلاڑی طاہر شبنم دوبئی کپ 2017 کے لیے منتخب۔ وادی کشمیر کے

نوجوانوں کے لیے بنے قابل فخر۔'' انھوں نے انگریزی زبان میں بھی ٹویٹ کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ اردو جموں وکشمیر کی سرکاری زبان ہے، لیکن ریاست میں اس کا استعمال اراضی دستاویزات کی تحریروں اور راشن کارڈوں پر ناموں کی لکھائی تک محدود ہے۔ محترمہ مفتی کا اردو میں ٹویٹنگ شروع کرنے پر سوشل میڈیا پر ملا جلا ردعمل سامنے آرہا ہے۔ ایک صارف نے محترمہ مفتی کے اردو میں ٹویٹ پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے لکھا ''اردو میں ٹویٹ۔ بہت خوشی ہوئی۔ اس زبان کی حفاظت، ترقی اور ترویج، ہم سب کی ذمے داری ہے۔'' نزاکت منہاس نامی صارف نے لکھا، ''بہت خوب۔ اردو ہماری سرکاری زبان ہے۔ ہم اردو میں ہی ٹائپ کیا کریں۔'' عرفان نامی ایک صارف نے لکھا ''اپنے وزیر اعلیٰ کو اردو میں ٹویٹ کرتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔'' مفتی نے اردو میں ٹویٹنگ کے ساتھ ساتھ اپنے آفیشل فیس بک پیج پر بھی اردو میں پوسٹ کرنا شروع کر دیا ہے۔ 57 سالہ محبوبہ مفتی نے 4 اپریل 2016 کو ایک نئی تاریخ رقم کرتے ہوئے جموں وکشمیر کی پہلی مسلم خاتون وزیر اعلیٰ بننے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 5 دسمبر 2017

دھلی

لغت نویسی ولغت بینی

نئی دھلی: شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے اس تعلیمی سیشن کا تیسرا توسیعی خطبہ بعنوان 'لغت نویسی و لغت بینی کا طریقہ' میر انیس ہال دیار میر تقی میر میں منعقد

کیا گیا۔ اس خطبے کا آغاز شعبہ کے بی اے سال آخر کے طالب علم دانش اقبال نے تلاوت کلام پاک سے کیا، جبکہ نظامت توسیعی خطبات کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر سید کلیم اصغر نے کی۔ اس خطبے کے مقرر خاص پدم شری پروفیسر ریحانہ خاتون تھیں۔ خطبے کی صدارت شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر عبدالحلیم نے انجام دی، جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز پروفیسر وہاج الدین علوی موجود تھے۔ پروفیسر ریحانہ خاتون نے اپنے خطاب میں کہا کہ فارسی کی سب سے پہلی لغت فرہنگ قطران' حاج خلیف کی تصنیف ہے جو ایران میں دستیاب ہے۔ ہندوستان میں لغت نویسی کو 8، 9، 10ویں صدی میں عروج حاصل ہوا۔ انھوں نے کہا کہ لغت نویسی سمندر میں سچے موتی کی تلاش کرنے کے مترادف ہے۔ لغت نویسی کے لیے ایک ادارے کی ضرورت ہوتی ہے کسی ایک شخص کا کام نہیں۔ اس پروگرام میں خاص طور سے ڈاکٹر اورنگ زیب، ڈاکٹر ہیفا شاکری، ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن، ڈاکٹر زہرہ خاتون، ڈاکٹر احمد حسن، ڈاکٹر شاداب تبسم، ڈاکٹر محضر رضا، ڈاکٹر فضل الرحمٰن تمنا، ڈاکٹر حسین الزماں، ڈاکٹر ساجد مبین، یاسر عباس، مغیث احمد اور طلبہ وطالبات نے بڑی تعداد میں شرکت فرمائی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 نومبر 2017

معماران جامعہ پر یک روزہ سمینار

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ عربی درجات نے ادارہ کے بانیوں اور موسسین کو یاد کرتے ہوئے معماران جامعہ پر ایک روزہ سمینار منعقد کیا۔ شعبۂ عربی کے انجمن طلبہ کی جانب سے منعقدہ سمینار کا مقصد بی اے اور ایم اے کے طلبہ وطالبات کے درمیان بانیان ادارہ کا تعارف پیش کرنا تھا۔ اس سمینار کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا جس میں افتتاحی جلسے کے ناظم ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن نے انجمن طلبہ کا تعارف کراتے ہوئے انجمن طلبہ کی سرگرمیوں کو بیان کیا۔ پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر شفیق احمد خان ندوی نے شرکت کی، تعارفی کلمات کے بعد مہمان خصوصی اور صدر شعبہ کو شعبۂ عربی کی دو طالبات نے گلدستہ پیش کرکے ان کا استقبال کیا۔ اس کے بعد پروفیسر شفیق احمد خان ندوی نے اپنا کلیدی خطبہ پیش کیا جس میں انھوں نے جامعہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے جامعہ کے قیام کے مقاصد اور معماران جامعہ کی قربانیوں کو یاد کیا، نیز طلبہ وطالبات کو تعلیم کے میدان میں اپنے سفر کو جاری رکھنے کی نصیحت کی۔ اس جلسے میں ایک کتاب 'عظمت شبلی' مرتبہ ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی کا اجرا بھی عمل میں آیا، افتتاحی پروگرام کے آخر میں ایڈوائزر انجمن طلبہ ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی نے مہمان خصوصی، صدر شعبہ اور اساتذہ کرام اور دیگر حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد جلسوں میں 25 سے زائد طلبہ وطالبات نے اپنے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 26 نومبر 2017

'بیسویں صدی کے اردو ادب میں خواتین مصنفین کی خدمات' پر منعقدہ سمینار میں خطاب کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع

بیسویں صدی کے اردو ادب میں خواتین مصنفین کی خدمات

نئی دھلی: قومی سطح کی تنظیم ایس ویژن کے زیر اہتمام مورخہ 3 دسمبر 2017 کو انڈیا ہیبیٹیٹ سینٹر جوہر ہال نئی دہلی میں یک روزہ قومی سمینار 'بیسویں صدی کے اردو ادب میں خواتین مصنفین کی خدمات' کے عنوان سے منعقد کیا گیا۔ خیر مقدمی اور تعارفی تقریر میں سمینار کی کنوینر محترمہ ڈاکٹر مہر فاطمہ حسین صدر ایس ویژن اور ایسوسی ایٹ پروفیسر سروجنی نائیڈو سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے پینل کے اراکین و شرکا کے ساتھ ساتھ سامعین کا استقبال کیا اور وزارت ثقافت حکومت ہند کے مالی تعاون کے لیے خصوصی شکریہ ادا کیا۔ بیسویں صدی کی خواتین قلم کاروں کے ترقی پسند افکار وخیالات اور ان کے کردار کو اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر مہر فاطمہ نے کہا کہ انہوں نے خوب صورتی کے ساتھ اپنے عہد کے سماج اور تہذیب کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔

پروگرام کے مہمان خصوصی پروفیسر اختر الواسع صدر مولانا آزاد یونیورسٹی جودھ پور، راجستھان نے اس طرح کے اہم ادبی موضوعات پر سمینار منعقد کرانے کے لیے ایس ویژن کی تعریف کی۔ اس موقعے پر انھوں نے اے۔ آر۔ خاتون اور پروین شاکر کی ادبی خدمات کا خصوصی طور پر ذکر کیا اور کہا کہ ان دونوں فن کاروں نے نہ صرف اپنے عہد کی حسیت کو پیش کیا ہے بلکہ بطور خاتون اپنے احساسات کی کامیاب ترسیل بھی کی ہے۔ پروفیسر ایم۔ شافع قدوائی صدر شعبہ ماس کمیونی کیشن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی۔ اپنی صدارتی تقریر میں انہوں نے ایس ویژن کی کوششوں کی ستائش کرتے

ہوئے کہا کہ بیسویں صدی میں خواتین قلم کاروں کی تخلیقات کا مبسوط جائزہ وقت کا اہم تقاضا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر طلعت عزیز سابق صدر شعبہ ایجوکیشن، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور پروفیسر صبیحہ حسین ڈائریکٹر سروجنی نائیڈو سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ افتتاحی اجلاس میں مہمان اعزازی کی حیثیت سے شریک ہوئیں۔ پروفیسر طلعت عزیز نے اپنی تقریر میں کہا: بے شمار خواتین شاعرات اور ادیب کی تحریریں اب تک توجہ کا مرکز نہیں بن سکی ہیں۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ان کی خدمات کا مکمل جائزہ لیں اور ان کے خیالات کی روشنی سے ملک و ملت کو مستفید ہونے کا موقع فراہم کریں۔ پروفیسر صبیحہ حسین نے سمینار کے موضوع پر صنفی سیاق میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ آج ضرورت ہے کہ ادبی متن میں جو تانیثی مسائل و موضوعات پوشیدہ ہیں انھیں طشت ازبام کیا جائے۔ پروفیسر صادق، سابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے سمینار کے افتتاحی اجلاس میں نہایت جامع اور مبسوط کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے کلیدی خطبے میں خواتین قلم کاروں کی مختلف الجہات خدمات پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 دسمبر 2017

جشن معین شاداب

نئی دھلی: ہوٹل ریور ویو ابوالفضل انکلیو میں اردو کے منفرد شاعر و ناظم مشاعرہ معین شاداب کے اعزاز میں 'جشن معین شاداب' منایا گیا۔ اس موقعے پر ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ پروگرام کا آغاز نسیم مجید کی تلاوت سے ہوا۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر شہپر رسول صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے کی۔ مہمان ذی وقار (چیف گیسٹ) میں پروفیسر ایچ دوبے مشہور و معروف ماہر سماجیات، پروفیسر ایس کے دتا ماہر سیاسی تجزیہ کار، امیر حیدر زیدی معروف سماجی خدمت گار، ڈاکٹر تابش مہدی، مشہور شاعر اور خود صاحب اعزاز معین شاداب اسٹیج پر موجود تھے۔ تمام مہمانان کرام کا استقبال شال اوڑھا کر کیا گیا۔ صدر محفل پروفیسر شہپر رسول کو سالک دھامپوری نے، پروفیسر ایچ دوبے جی کو خان رضوان نے، پروفیسر ایس کے دتا کو عبدالغفار صدیقی نے، ڈاکٹر تابش مہدی کو فیروز احمد سیفی نے، امیر حیدر زیدی کو افضال احمد سیفی نے اور معین شاداب کو مانوا ایکتا مجلس کے قومی صدر اور صلاح کار کے مدیر حامد علی اختر نے شال اڑھائی اور ان کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ سپاس نامہ کو عبدالغفار صدیقی نے پڑھ کر سنایا۔ ساتھ ہی 'مانوا ایکتا مجلس و ماہنامہ صلاح کار'

اوریکل پبلک اسکول، چوہان بانگر نیو سیلم پور میں اردو ڈے تقریب

کے ذمے داروں کے اس اقدام کی بھی تحسین کی جس کے زیراہتمام یہ جشن اور عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا۔ صدر محفل نے شمع روشن کرکے مشاعرہ کا آغاز کیا۔ ہدیۂ نعت ضمیر اعظمی نے پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت حامد علی اختر نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 نومبر 2017

انجمن ترقی اردو کے زیرِاہتمام یومِ ذوق کا انعقاد

نئی دھلی: انجمن ترقی اردو (دہلی) کے زیراہتمام غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین دہلی میں یوم ذوق کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی صدر غالب اکادمی نے کی، جلسے کی ابتدا میں شاہد ماہلی صدر انجمن ترقی اردو دہلی نے اپنے افتتاحی کلمات میں کہا کہ انجمن ترقی اردو کے زیراہتمام ہر سال یوم ذوق منایا جاتا ہے اور استاد ذوق کے ادبی کارناموں پر سیر حاصل گفتگو کی جاتی ہے۔ اس سال بھی یوم ذوق پر غالب اکادمی میں جلسہ منعقد کیا گیا، شیخ ابراہیم ذوق اردو کے نمائندہ شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں مگر افسوس انھیں وہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جس کے وہ مستحق تھے۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ استاد ذوق کو اردو والوں نے بھلا دیا وہ قادرالکلام شاعر تھے اور ان کے کئی مجموعے شائع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں۔ جلسے کے اخیر میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں استاد ذوق کی زمین میں کچھ شعرا نے اپنے کلام پیش کیے۔ مشاعرے کی صدارت وقار مانوی نے کی ظفر مرادآبادی، ابرار کرت پوری، متین امروہی، نسیم عباسی، محترمہ آشکارا خانم کشف نے بھی اپنے کلام پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 نومبر 2017

اوریکل پبلک اسکول، چوہان بانگر نیو سیلم پور میں اردو ڈے تقریب

نئی دھلی: اوریکل پبلک اسکول، چوہان بانگر، نیو سیلم پور، دہلی میں اردو ڈے کے سلسلے میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن کے رضا کاروں نے خدمات پیش کیں۔ اوریکل پبلک اسکول کے مینجنگ ڈائرکٹر جناب فہیم احمد علیگ نے اردو ڈے تقریب کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ پروگرام 'اردو ڈے' کے سلسلے میں منعقد کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر آرٹی آئی ایکٹیوسٹ جناب سردار کشن سنگھ نے بطور مہمان ذی وقار شرکت کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے جس لگن سے پنجابی کے لیے جدوجہد کی ہے اس کے مقابلے میں اردو داں طبقہ مایوسی کا شکار نظر آرہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ گرودوارہ پربندھک کمیٹی و دیگر سکھ تنظیموں نے دہلی میں اردو اور پنجابی کو سیکنڈ آفیشل لینگویج کا درجہ ملنے پر اس کے نفاذ کے لیے عملی جدوجہد شروع کردی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو والے بھی ہمارے ساتھ آئیں تاکہ اردو کو بھی اس کا واجب حق مل سکے۔ مہمان ذی وقار نوجوان صحافی محمد زبیر خان سعیدی بدایونی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے تعلق سے والدین کو اپنی ذمہ داری نبھانی چاہیے۔ اپنے گھروں میں اردو کے رسائل و جرائد و اخبارات خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالیں۔ انھوں نے دورِ حاضر میں علامہ اقبال کے اقوال کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر مجیب الرحمٰن (جنرل سکریٹری، آل انڈیا یونانی طبی کانگریس، مغربی بنگال) نے کہا کہ اردو ہر ہندوستانی کے جذبات کی زبان ہے اور یہ ہندوستانی قوم کی لسانیاتی پہچان ہے۔ اس موقع پر عالمی یوم اردو آرگنائزنگ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر سید احمد خاں بھی موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا مستقبل روشن ہے، مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اپنے حصے کی ذمہ داری نبھانے کی انتہائی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہماری غفلت کا خمیازہ نسلوں کو نہ بھگتنا پڑے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو نبھائیں۔ اس کے علاوہ قاری محمد مزمل اور قاری امتیاز احمد وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ پروگرام کی صدارت حکیم عطاء الرحمٰن اجملی نے کی۔ تمام شرکا کا شکریہ فہیم احمد علیگ نے ادا کیا۔

رپورٹ: حکیم عطاء الرحمٰن اجملی، دہلی، 18 نومبر 2017

خالد جاوید کی کہانی پرنسٹن نصاب میں شامل

نئی دہلی: اردو کے مشہور رائٹر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر خالد جاوید کی کہانی 'آخری دعوت' کو نیوجرسی کی پرنسٹن یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ پرنسٹن یونیورسٹی میں اردو سبجیکٹ میں گریجویشن کررہے طلبا انگریزی ترجمہ کی مدد سے اس کہانی کو اردو ادب کے طور پر پڑھیں گے۔ جاوید کی کہانی 'آخری دعوت' دراصل اردو میں لکھی گئی ہے جس کا انگریزی ترجمہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سید عابد حسین سینئر سیکنڈری اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر عبدالنصیب خان نے 'دی لاسٹ سپر' کے عنوان کیا ہے۔ جامعہ سے موصول جانکاری کے مطابق حال ہی میں خالد جاوید کو پرنسٹن یونیورسٹی نے میٹ دی آرتھر پروگرام کے تحت اپنے یہاں مدعو کیا تھا اور ان کی کہانی پر طلبا اور اساتذہ کے ساتھ کھلی بحث ہوئی۔ یونیورسٹی کے ساؤتھ ایشیا ڈپارٹمنٹ میں منعقد ساؤتھ ایشین لٹریری ٹرینڈس پروگرام میں ڈاکٹر جاوید نے اپنا ایک پیپر بھی پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 نومبر 2017

اترپردیش:

یوم اقبال

علی گڑھ: نور ادب علی گڑھ کے زیراہتمام یوم اقبال کے پرمسرت موقعے پر علی گڑھ میں ایک تقریب کا انعقاد

کیا گیا۔ اس موقعے پر شاعر مشرق علامہ اقبال کے فن و شخصیت کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی گئی۔ اس موقعے پر علامہ قیصر اکادمی علی گڑھ کے سربراہ ڈاکٹر رضی امروہوی نے اقبال کی شاعری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ تشبیہات و استعارات و علامات کا سہارا لے کر صاف اور شفاف گفتگو کرنے کے قائل نظر آتے ہیں اور نہایت سادہ و سلیس زبان میں سماج اور کائنات کو پیغام دینے کا عمل انجام دیتے ہیں۔ گویا کہ وہ بہ یک وقت مفکر بھی ہیں مبلغ بھی ہیں قوم پرست بھی ہیں وطن پرست بھی ہیں اور دردمند اور حساس دل کے مالک بھی۔ اقبال کی ولادت کے دن کو یوم اردو کے طور پر منائے جانے سے ساری دنیا میں ایک اچھا پیغام جائے گا جس سے دنیا کو اردو پڑھنے اور سیکھنے کی طرف راغب کیا جاسکے گا۔ علیم نواز نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جہاں اقبال ایک سچے محب وطن بھی ہیں اور وہیں قوم وملت کے دلدادہ بھی۔ ان کا کلام تصوف کی وادیوں میں بھی سرگرداں ہے تو کہیں وہ ایسی دنیا کے مخالف بھی ہیں جو انسان کی صلاحیتوں اور پرواز کو کوتاہ کرتی ہیں۔ گلشن ادب علی گڑھ کے سربراہ محمد عادل فراز نے کہا کہ شاعر مشرق علامہ اقبال کا شمار اردو ادب کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے شرکا نے بھی اقبال کے حوالے سے گفتگو کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 نومبر 2017

جشن اردو

وارانسی: ہندوستان مختلف رنگوں، نسلوں، تہذیبوں، مذاہب اور زبانوں کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ مختلف علاقوں میں بولی جانے والی زبانیں اصلاً اسی ملک کی وراثت اور اثاثہ ہیں۔ ہر زبان کی اپنی تہذیب ہوتی ہے۔ تاریخ اور تہذیب زبانوں کی محافظ ہوتی ہیں اور زبانیں خود تاریخ اور تہذیب کو زندگی عطا کرتی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار علامہ اقبال کے یوم پیدائش کی مناسبت سے عالمی یوم اردو کے موقعے پر اردو بی ٹی سی ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن بنارس کی جانب سے میدان امرتی بھون میں منعقد جشن اردو سیمینار میں مہمان خصوصی بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو اس ملک کی زبانوں میں تاج محل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی شیرینی، لطافت، شگفتگی، نزاکت اور حلاوت نے عوام کے ذہن وفکر اور روح کو جو تازگی عطا کی ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ اردو کسی ایک قوم، خطے یا علاقے کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ ہندوستان کے کروڑوں شہریوں کے دل کی دھڑکن ہے۔ اردو نے جنگ آزادی کی جدوجہد کے پہلو بہ پہلو آزاد ہندوستان کی تعمیر وترقی میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ مادری زبان کسی قوم کے زندہ رہنے کی علامت ہوتی ہے۔ اسی لیے اردو کی تابناکی، ترقی وترویج ہماری ذات اور معاشرے سے وابستہ ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جاوید احمد افتخار نے کہا کہ پہاڑوں جیسی رفعت، سمندروں جیسی وسعت رکھنے والی اردو صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک قابل رشک تہذیب وثقافت ہے۔ اپنے صدارتی خطبے میں مفتی بنارس مولانا عبدالباطن نعمانی نے کہا کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ اور تہذیب ترقی یافتہ ہو تو ضروری ہے کہ اردو زبان کی ترویج وترقی پر توجہ اور اپنے بچوں کو اردو زبان سے آراستہ کرنا ہوگا۔ انھوں نے محبان اردو سے اپیل کی کہ وہ اردو اخبارات، کتابیں اور رسائل خرید کر پڑھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 نومبر 2017

یوم اردو پر سیمینار

سہارنپور: شہر کے معروف تعلیمی ادارہ براؤن پبلک اسکول میں اسکول کے بانی مرحوم سید افتخار حسین کی یاد میں جشن اردو کا ایک خوبصورت پروگرام منعقد کیا گیا، جس کی صدارت جامعہ مظاہر علوم کے امین عام مولانا سید شاہد الحسنی نے اور نظامت شبینہ شمسی نے کی، بطور مہمانان خصوصی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے شعبہ اردو سے وابستہ ڈاکٹر سہیل فاروقی، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر شہزاد انجم اور مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے اسلامیہ ڈگری کالج کے کنٹرولر پروفیسر اختر علی خاں اور ایم آر ایس کالج کے پرنسپل اشوک چندر نے شرکت کی۔ اس موقعے پر براؤن ووڈ پبلک اسکول، الپائن پبلک اسکول اور مسلم گرلز انٹر کالج کے طلبہ و طالبات نے غزل خوانی، تمثیلی مشاعرہ، بیت بازی اور قوالی کے مقابلہ میں حصہ لیا اور داد وتحسین حاصل کی۔ بیت بازی کا آغاز ڈاکٹر سہیل فاروقی نے ایک شعر سے کیا اور بیت بازی کے اصول وقواعد بتائے اور کہا کہ بیت بازی سے طلبہ میں شعروسخن اور زبان وادب میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور ذوق میں نکھار آتا ہے۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ اردو صرف زبان نہیں ایک تہذیب بھی ہے۔ انھوں نے اردو کو قومی ورثہ قرار دیا۔ پرفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ مادری زبان کی حفاظت ہم سب کی ذمے داری ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو قوم اپنی مادری زبان کی حفاظت نہیں کرپاتیں وہ تہذیب وتمدن سے محروم ہوجاتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایسے پرگرام اردو کے فروغ میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے صدارتی کلمات میں مولانا سید شاہد الحسنی نے کہا کہ بغیر درس وتدریس کے اردو کا فروغ اور تحفظ ممکن نہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ خوش آئند بات ہے کہ انگریزی میڈیم کے مسلم اسکولوں نے اردو کی تعلیم کا بندوبست کررکھا ہے جو اردو کی بقا کا ضامن ہوسکتا ہے۔ اظہار خیال کرنے والوں میں پروفیسر اختر علی خاں، اشوک چندر اور شاہد زبیری نمایاں تھے۔ دریں اثنا

اس پروگرام میں اردو صحافیوں کو اعزاز سے نوازا گیا اور کامیاب ہونے والے طلبہ و طالبات کو مہمانوں کے ہاتھوں انعامات اور سرٹیفکیٹس تقسیم کیے گئے۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 نومبر 2017

موجودہ منظرنامے میں قومی اتحاد کی اہمیت

سنبھل: ایم جی ایم کالج میں اردو ڈے ہفتہ کے موقعے پر سمینار منعقد کیا گیا جس کا عنوان 'موجودہ منظرنامے میں قومی اتحاد کی اہمیت' تھا۔ سمینار میں ندا علیم نے اپنے مقالے میں کہا کہ لاکھ زمانہ خراب ہو لیکن بھارت میں قومی اتحاد ختم نہیں ہوسکتا۔ تسنیم زہرا نے کہا کہ اگر ہم قومی اتحاد کو نظرانداز کر رہے ہیں تو پھر ہندوستان خطرے میں ہوگا۔ عابد رضا نے اردو ادب میں ہولی، دیوالی، محرم، جنم اشٹمی پر کہی گئی نظموں سے مثال دے کر قومی اتحاد کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ گلشن جہاں نے کہا کہ ہمیں یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ دوسرا کیا کر رہا ہے، ہمارا پیغام محبت ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی نے نئی نسل میں قومی اتحاد کے جذبے کی تعریف کی۔ شاذیہ افروز اور شفیق برکاتی نے پرامن زندگی کی حمایت کرنے کا پیغام دیا۔ پرنسپل ڈاکٹر عابد حسین نے کہا کہ قومی اتحاد کا دوسرا نام اردو ہے اور اردو نے امیر خسرو سے لے کر آج تک قومی اتحاد پر زور دیا ہے۔ نظامت ڈاکٹر شہزاد احمد نے کی۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 9 نومبر 2017

معین احسن جذبی پر کل ہند سمینار

آگرہ: اردو زبان کے مشہور اور معروف شاعر معین احسن

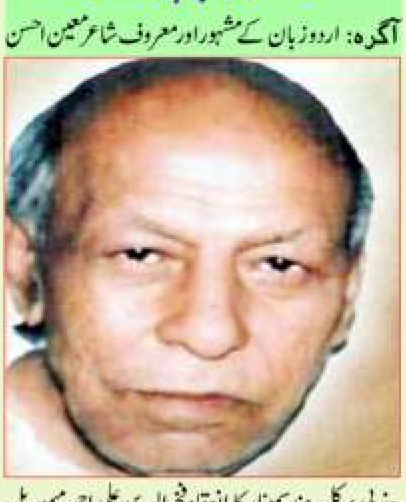

جذبی پر کل ہند سمینار کا انعقاد فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی (حکومت اتر پردیش) لکھنؤ کی جانب سے سینٹ جانس کالج آگرہ میں کیا گیا۔ سمینار میں ملک کے کونے کونے سے آئی شخصیات نے مقالہ پیش کیے۔ سمینار کا آغاز سینٹ جانس کے پرنسپل پی ای جوزف نے شمع روشن کرکے کیا۔ سمینار کے کنوینر پروفیسر سید شفیق احمد اشرف نے کہا کہ معین احسن جذبی کا ایک خاص رشتہ سینٹ جانس کالج سے رہا ہے، وہ یہیں کے طالب علم رہے۔ اس کی وجہ سے معین احسن جذبی پر کل ہند سمینار سینٹ جانس کالج آگرہ میں رکھا گیا۔ اس موقعے پر مہاراشٹر سے آئے ڈاکٹر ارشاد احمد خان، پٹنہ کے ڈاکٹر رفیع الدین، اورنگ آباد کے ڈاکٹر قاضی نوید احمد صدیقی، امبور بلور سے ڈاکٹر کے ایچ کلیم اللہ، نظام آباد تلنگانا سے ڈاکٹر محمد عبد کوی کلکتے کے ڈاکٹر افتخار احمد نے مختلف جہتوں سے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ علی گڑھ کی ڈاکٹر سیما صغیر نے اپنے مقالہ میں کہا کہ جذبی نے غم دیکھا برتا اور سہا جوان کی نظموں میں ڈھلتا چلا گیا۔ علی گڑھ کے پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ جذبی نے اپنی شاعری میں میناکاری کی ہے نہ بوٹے بنائیں بلکہ الفاظ کے صحیح استعمال پر زور دیا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق نے کہا کہ جذبی کے ساتھ انصاف نہیں ہوا، ان کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ حق دار تھے۔ پرفیسر شفیع کڈوای نے جذبی پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ پروگرام کے اختتام پر فخرالدین علی میموریل کمیٹی کے سکریٹری کا پیغام پڑھا گیا تھا، جو حکومت کی مصروفیت کی وجہ سے پروگرام میں شرکت نہیں کرسکے۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 نومبر 2017

بہار:

فروغ اردو سمینار و مشاعرہ

سہسرام: روہتاس ضلع راج بھاشا اردو سیل کی جانب سے فروغ اردو سمینار و مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ پروگرام کا افتتاح ڈی آر ڈی اے کے ڈائرکٹر، ایس ڈی ایم سہسرام امریندر کمار، انچارج راج بھاشا روہتاس اروبندر کمار بھارتی، محکمہ تعلیم کے ڈی پی ای او نے مشترکہ طور پر شمع روشن کر کے کیا۔ ڈاکٹر اے کے علوی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ نظامت اثر فریدی نے کی۔ اس موقعے پر رضیہ خاتون نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ پرانے وقتوں میں جس طرح مکتب ہوا کرتے تھے ویسا ہی نظام دوبارہ شروع ہو، اردو کے فروغ کے لیے خواتین کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ سید شاہ سراج الدین فریدی نے اردو کے فروغ کے لیے اسکولوں میں اساتذہ کی کمی کو دور کرنے کی صلاح دی۔ انھوں نے ضلع انتظامیہ کو اردو کی دوسری سرکاری زبان ہونے کا احساس دلایا۔ ایس جمشید انصاری نے کہا کہ اس زبان کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ اسے صرف مسلمانوں کی زبان نہ سمجھا جائے۔ اس موقعے پر اردو کے فروغ کے سلسلے میں مدارس اور اسکول کے بچوں کو بھی مقالے پیش کرنے کا موقع دیا گیا۔ مقالہ کے علاوہ صدر اجلاس ڈائرکٹر ڈی آر ڈی اے نے کہا ہے کہ اردو کے رسالے، ہم محبان اردو کو خرید کر پڑھنے چاہئیں۔ سرکاری طور پر بہت سی مراعات اردو کے لیے تیار کی گئی ہیں جس کی جانکاری لے کر اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 26 نومبر 2017

اردو کی بقا اور ہماری ذمہ داریاں

سیوان: اردو کی زبوں حالی کے ذمہ دار غیر نہیں بلکہ ہم خود ہیں۔ ہم اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم نہیں دیتے ہیں، اردو کا ایک اخبار نہیں خریدتے ہیں، اردو میں باتیں نہیں کرتے ہیں، صرف نمائشی طور پر اردو کے خیرخواہ بنے پھرتے ہیں اور حکومت کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ یہ باتیں جاوید اقبال الیکشن افسر گوپال گنج نے اردو ڈائرکٹوریٹ بہار سرکار کے زیراہتمام منعقد سمینار 'اردو کی بقا اور ہماری ذمہ داریاں' میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم اردو کی بات تو کرتے ہیں لیکن اپنی ذمہ داری ایمانداری سے نہیں نبھاتے۔ ڈاکٹر ذکی ہاشمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہماری تہذیب وثقافت کی وراثت ہے۔ اس وراثت کو قائم رکھنے کے لیے اردو کا تحفظ و بقا لازمی ہے، کیونکہ جس دن اردو ختم ہوجائے گی ہماری تہذیب بھی مٹ جائے گی۔ آفتاب عالم نے کہا کہ دور حاضر کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اپنے بچوں کو جدید اعلیٰ تعلیم سے ضرور آراستہ کریں لیکن انھیں اردو زبان کی بھی تعلیم دیں تاکہ وہ اردو کے ادبی و مذہبی سرمائے کی حفاظت کرسکیں۔ شاہ عالم نے کہا کہ اردو کی بقا کے لیے ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اپنے گھروں میں اردو بولیں، پڑھیں اور اپنے بچوں کو اردو پڑھنے کی ترغیب دیں۔ اس موقعے پر صدر مجلس طارق شجاع پرنسپل ڈی سی کالج بڑہریا سیوان نے کہا کہ مغربی تہذیب ہمارے اوپر حاوی ہوتی جارہی ہے۔ ہمیں اس مغربی یلغار سے اپنے بچوں وقوم کو بچانا ہوگا۔ اپنے بچوں میں یہ احساس اجاگر کرنا ہوگا کہ اردو نہایت ہی مہذب زبان ہے۔ اس موقعے پر اردو زبان سے تعلق رکھنے والے ضلع کے سبھی اسکول، کالج اور مدارس کے اساتذہ کے ساتھ دیگر محبان اردو کثیر تعداد میں موجود رہے۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 1 دسمبر 2017

شوق نیموی یادگاری تقریب

شوق نیموی یادگاری تقریب

پٹنہ: اردو مشاورتی کمیٹی بہار کے چیئرمین شفیع مشہدی نے کہا کہ شوق نیموی کی شخصیت ریاست بہار کی ہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت کثیرالجہات اور ملک گیر سطح کی تھی۔ انھوں نے جس صنف میں بھی طبع آزمائی کی اس میں انھیں کافی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہفتہ کو وہ اٹھیلیکھ بھون میں شوق نیموی کی یادگاری تقریب سے خطاب کررہے تھے۔ امتیاز احمد کریمی ڈائرکٹر اردو نے کہا کہ یادگار یا دیگر تقریبات کے انعقاد کا مقصد جہاں اپنے اسلاف کی خدمات اور ان کے کارناموں کا یاد کرنا ہے، وہیں بہار میں اردو کا فروغ بھی کرنا ہے۔ اس کے لیے اردو ڈائرکٹوریٹ ریاست کے تمام اضلاع میں اردو ورکشاپ، فروغ اردو سمینار، طلبا حوصلہ افزائی منصوبہ چلا رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اردو کے فروغ کے لیے محنت اور لگن سے کام لیا جائے تو اس عظیم اور میٹھی زبان کی ترقی ضرور ہوگی۔ انھوں نے شوق نیموی کے حوالے سے کہا کہ شوق نیموی کی زبان، ادابندی، نازک خیالی ان کے اشعار میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ انھوں نے ایک پردرد مثنوی لکھی جس کا تاریخی نام نغمہ راز ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ وہ قرآن، حدیث، فقہ، منطق وفلسفہ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ عربی زبان میں بھی ان کی بارہ تصانیف ہیں جن میں 'آثارالسنن' کافی مقبول ہے۔ نازیہ اعجاز اور حذیفہ شکیل نے شوق نیموی کی حیات و خدمات پر تقریر کی۔ ڈاکٹر محمد نسیم، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، معروف ادیب وناقد عتیق الرحمٰن نے شوق نیموی کی حیات و خدمات پر اپنے مقالے پیش کیے جبکہ بزم سخن کے تحت فردوس گیاوی، اقبال اختر دل، طارق متین، مصلح الدین، طلعت پروین نے اپنے خوبصورت کلام سے سامعین کا دل جیت لیا۔

تقریب کا اختتام شعری نشست پر ہوا۔ اس کی نظامت کا فریضہ سید جلال کاکوی نے انجام دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 نومبر 2017

سہیل عظیم آبادی یادگاری تقریب

پٹنہ: سہیل عظیم آبادی کو پریم چند کا پرتو سمجھا جاتا ہے جو غلط ہے۔ پریم چند ایک عظیم افسانہ نگار تھے مگر سہیل عظیم آبادی کا ایک منفرد ویژن تھا اور ایک الگ شناخت تھی۔ ان کی تحریر دور سے پکار کر ان کا پتہ دیتی ہے۔ افسانہ نگاری میں

بہار کو جو آج برتری حاصل ہے اس کا بیج سہیل عظیم آبادی نے ڈالا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی عوام کے دلوں میں زندہ ہیں۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیراہتمام بدھ کو ابھی لیکھ بھون میں منعقد عظیم افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی کی یادگاری تقریب میں انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ معروف افسانہ نگار پروفیسر عبدالصمد نے یہ باتیں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ سہیل عظیم آبادی کے ادب میں سماجی اور انسانی قدریں ہر سطح پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ غالب ایوارڈ یافتہ مشہور افسانہ نگار شفیع مشہدی نے کہا کہ سہیل عظیم آبادی کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے آدی باسیوں کے درمیان اردو کی ترویج واشاعت اور اردو کے لیے ماحول سازی کی۔ انھوں نے کہا کہ سہیل عظیم آبادی کو پریم چند کا وارث بتا کر ان کی شخصیت کو مقید کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے ان دونوں میں تھوڑی مماثلت ضرور پائی جاتی ہے مگر سہیل عظیم آبادی کا دائرۂ عمل اور دائرۂ نگارش پریم چند سے آگے تھا۔ اس لیے دونوں عظیم افسانہ نگاروں کا موازنہ کسی طرح درست نہیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ سہیل عظیم آبادی نے میری افسانہ نگاری کی حوصلہ افزائی کی۔

اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائریکٹر امتیاز احمد کریمی نے اس سے قبل مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے سہیل عظیم آبادی کا مختصر خاکہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ سہیل عظیم آبادی کا شمار ہندوستان کے بڑے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم جاوداں نے نظامت کرتے ہوئے سہیل عظیم آبادی کو اردو تحریک کار بتایا۔ انھوں نے کہا کہ انھوں نے چھوٹا ناگپور میں اردو مرکز قائم کرکے آدی باسیوں کو اردو سے روبرو کرایا۔ پروفیسر عبدالصمد کے علاوہ ڈاکٹر احمد صغیر اور ڈاکٹر جلال اصغر فریدی نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ علاوہ ازیں تین طلبا وطالبات شبنم، پٹنہ یونیورسٹی، محمد مرشد ویر کنور سنگھ یونیورسٹی اور یاسمین خاتون بہار یونیورسٹی مظفر پور نے بھی سہیل عظیم آبادی کی شخصیت اور فکر وفن پر اپنے مقالے پیش کیے۔ انھیں اردو ڈائرکٹوریٹ نے سند سے بھی نوازا۔ اس موقعے پر سہیل عظیم آبادی کے صاحب زادے مایہ ناز شاعر وادیب شان الرحمٰن اور دوسرے بیٹے لطیف الرحمٰن بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 نومبر 2017

ساہتیہ اکادمی کا گراما لوک پروگرام شیرگھاٹی میں

شیرگھاٹی: 5 نومبر' ساہتیہ اکادمی نئی دہلی کا گراما لوک پروگرام گاندھی آزاد پبلک اسکول بیدا شیرگھاٹی میں منعقد کیا گیا ہے۔ جس کی صدارت ڈاکٹر ایس۔ رضوان اللہ نے کی اور نظامت ڈاکٹر احمد صغیر نے انجام دی۔ احمد صغیر نے پروگرام کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی کے ذریعہ چلائے جا رہے گراما لوک پروگرام کے بارے میں سامعین کو متعارف کراتے ہوئے کہا کہ ساہتیہ اکادمی نے اس سال سے ایک نیا پروگرام گراما لوک شروع کیا ہے۔ جس کا مقصد گاؤں میں بسنے والے ساہتیہ کاروں کو سامنے لانا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بڑے شہروں اور چھوٹے شہروں میں رہنے والے ادبا وشعرا کو اپنی تخلیق پڑھنے اور سنانے کا موقع ملتا ہے اور وہ ادب کے اُفق پر ستاروں کی طرح

چمکتے رہتے ہیں لیکن گاؤں دیہات میں رہنے والے ادبا و شعرا کو کوئی اس طرح کا اسٹیج نہیں ملتا' نہ ہی اس طرح کی کوئی ادبی تقریب کا اہتمام ہوتا ہے' جہاں وہ اپنی تخلیق سنا سکیں اور انھیں عوامی سطح پر مقبولیت حاصل ہو سکے۔ ایسے فنکاروں کو عوام کے سامنے لانے کے لیے ساہتیہ اکادمی نے گراما لوک پروگرام شروع کیا ہے تاکہ گاؤں میں بسنے والے ساہتیہ کاروں کو سامنے لایا جا سکے۔ احمد صغیر نے آگے کہا کہ آپ کو جان کر یہ حیرت ہوگی کہ اُردو کا پہلا گراما لوک پروگرام اس سرزمین یعنی بیدا شیر گھاٹی میں کیا جا رہا ہے۔

احمد صغیر نے سب سے پہلے ڈاکٹر ایس رضوان اللہ کو بطور صدر اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ بعد ازاں نعمان الحق، عمران علی، اشراق حمزہ پوری، احمد اسلم شیر گھاٹوی اور رضا شیر گھاٹوی کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ پروگرام کے آغاز میں شری لکشمن پرشاد بی ڈی او آمس نے صدر 'ناظم اور شاعروں کو گلدستہ پیش کر کے ان کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد شیر گھاٹی کے ایس۔ڈی۔او۔ شری جیوتی کمار نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ یہ شیر گھاٹی کے لیے فخر کی بات ہے کہ ساہتیہ اکادمی نے یہاں کے شاعروں کو منظر عام پر لانے کے لیے گراما لوک پروگرام کا اہتمام کیا ہے۔ مشاعرے کی صدارت کر رہے ڈاکٹر ایس رضوان اللہ نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اس پروگرام میں شامل ہو کر میں فخر محسوس کر رہا ہوں۔ میں احمد صغیر کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے بیدا شیر گھاٹی میں ساہتیہ اکادمی کا گراما لوک پروگرام کروانے کا فیصلہ لیا اور ساہتیہ اکادمی نے اسے منظوری دی۔ پانچ شاعروں نے اپنے کلام پیش کیے۔ اس پروگرام کے بعد ان شاعروں میں ایک نئی جولانی پیدا ہوگی اور وہ نا صرف شیر گھاٹی بلکہ صوبائی سطح یا ملک گیر سطح پر اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوں گے۔

پریس ریلیز: احمد صغیر، گیا، بہار، 7 نومبر 2017

تحریک آزادی میں اردو کا اہم رول

مونگیر: اردو ایک اچھی زبان ہے، اردو زبان کی مٹھاس کی وجہ سے اسے سننے میں کافی اچھا لگتا ہے۔ لوگوں کو اردو سیکھنا اور دوسروں کو سکھانا چاہیے۔ یہ باتیں سوچنا بھون میں منعقد اردو کے فروغ پر منعقد سیمینار اور معاشرہ کو خطاب کرتے ہوئے ڈی ایم اودے کمار سنگھ نے کہیں۔ ضلع اردو سیل مونگیر کے زیر اہتمام ضلع انتظامیہ کے تعاون سے منعقد اس پروگرام کی صدارت ڈی ایم نے کی۔ اس موقعے پر موجودہ مقررین نے کہا کہ ملک کی آزادی سے لے کر چاہے جتنے بھی انقلاب ہوئے ہیں اس میں اردو زبان کا اہم تعاون رہا ہے۔ ایسے میں اردو صرف مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ سبھی علاقوں میں استعمال ہونے والی زبان ہے۔ ضلع اردو سیل کے اپر ڈویژن کلرک محمد سہیل شمس نے کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے حکومت سے زیادہ ہم لوگوں کو کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس شیریں زبان کو محفوظ رکھنا ہماری ذمے داری ہے۔ مہمان خصوصی میں ڈاکٹر قاسم خورشید، مہمان اعزازی ڈاکٹر اقبال حسن آزاد، ڈاکٹر شبیر حسن، پروفیسر منصور نیازی نے بھی اردو کے فروغ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اسٹیج کی قیادت محمد سہیل شمس نے کی جبکہ شکریہ کی رسم ضلع اقلیتی فلاح افسر و انچارج میڈیکل افسر رتن نے ادا کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 دسمبر 2017

پروفیسر لطف الرحمٰن: فن اور شخصیت

مونگیر: رحمانی فاؤنڈیشن مونگیر میں اردو دنیا کی مشہور شخصیت ڈاکٹر 'پروفیسر لطف الرحمٰن فن اور شخصیت' پر قومی سیمینار منعقد ہوا، جس کا افتتاحی اجلاس صدارت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری مفکر اسلام امیر شریعت مولانا محمد ولی رحمانی نے کیا، مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مونگیر کے کلکٹر اودے کمار سنگھ موجود تھے۔ اسٹیج پر دونوں شخصیتوں کے علاوہ صفدر امام قادری، قاسم خورشید، ڈاکٹر شبیر حسن، سرور الہدیٰ، قیصر زماں، مشتاق احمد، فخر الدین عارفی، ظفر حبیب، نسیم احمد نسیم، راشد طراز، مولانا ظفر عبدالرؤف رحمانی، سنجے کمار، ول کمار، عاصم شہنواز، ابوذر، منظر حسین، فضل رحمان، حافظ امتیاز رحمانی موجود تھے۔

سیمینار میں قومی سطح کی دس یونیورسٹیوں کے اساتذہ، اہل قلم، ادیب اور اردو دنیا کی مشہور شخصیات نے شرکت کی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کلکٹر مونگیر اودے کمار سنگھ نے کہا کہ آج کے دور میں لوگوں کو اپنے خاندان اور پریوار کے لوگوں کا حال دریافت کرنے کی فرصت نہیں ہے، ایسے پر آشوب دور میں رحمانی فاؤنڈیشن پروفیسر لطف الرحمٰن پر سیمینار کر کے انھیں یاد کر رہا ہے۔ ڈاکٹر قاسم خورشید نے کہا کہ پروفیسر لطف الرحمٰن کی شخصیت کے بارے میں ابھی صرف ایک مردِ حق آگاہ اور آج کے صدر مفکر اسلام مولانا محمد ولی رحمانی کی بات کو دہراتا ہوں کہ وہ ایک مردِ آگاہ تھے۔ ان کی زندگی کے اکثر ایام ان دو تصنیف تازگی برگ نوا اور جدیدیت کی جمالیات کے درمیان گھومتے رہے۔

اخیر میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے مفکر اسلام مولانا محمد ولی رحمانی نے کہا کہ پروفیسر لطف الرحمٰن مخلص انسان تھے جو ان کے دل میں ہوتا وہی بولتے اور لکھتے تھے، اور کسی کی خوشی اور ناخوشی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اس موقعے پر چار کتابوں اردو نثر کی اسلوبی ارتقا میں مولانا منت اللہ رحمانی کا رول، پروفیسر لطف الرحمٰن مشاہدات و تاثرات، ولی نامہ منظوم، حضرت مولانا محمد ولی رحمانی پر ایک انگریزی کتاب دی شائن فیس آف اسلامک امہ کا اجرا عمل میں آیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 نومبر 2017

حسین الحق کے ناول پر گفتگو

گیا: اردو کے مشہور ناقد اور سابق آئی جی بہار پولیس معصوم عزیز کاظمی کی رہائش گاہ پر ایک ادبی مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشہور فکشن نگار حسین الحق کے تازہ ناول 'اماوس میں خواب' پر معصوم عزیز کاظمی نے عالم ارواح سے مرحوم انتظار حسین کا جو خط سنایا وہ تاریخی اور یادگاری لمحہ ہو گیا۔ انتظار حسین کا خط حسین الحق کے نام بقلم معصوم عزیز کاظمی کو سن کر شرکائے نشست نے بہت پسند کیا اور سبھوں نے معصوم کاظمی کی تحقیقی تنقید کی معروضیت کا اعتراف کیا۔ اس کے بعد حسین الحق نے اپنا افسانہ 'اندھیرے کا سفر' جو تشدد اور فرقہ ورانہ کشیدگی پر مشتمل تھا، سنایا۔ جس پر پروفیسر ڈاکٹر عین تابش نے بات شروع کی اور کہا کہ اگر یہ حالات حاضرہ کے تناظر میں انفرادیت پر مشتمل ہے تو واقعی یہ افسانہ لاجواب ہے، مگر یہ اجتماعیت پر ہے تو اس میں ان کا اتفاق نہیں ہو سکتا ہے۔ حالات تو ناخوشگوار ہیں، لیکن اس میں اکثریت نہیں۔ حسین الحق کے اس افسانے پر ڈاکٹر عین تابش سے شروع ہوئی بات پر تمام سامعین میں گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ پروفیسر عبدالقادر نے کہا کہ یہ دکھی افسانہ ہے اور اس میں جو کردار پیش کیے گئے ہیں وہ منفی خیالات رکھتے ہیں۔ سماج میں ایسا نہیں ہوتا ہے کہ ایک طبقے کے سبھی لوگ منفی خیالات کے حامل ہوں بلکہ ہر طبقہ میں اس طرح کے افراد ہیں جو نیکی اور دینداری کے قائل ہیں۔ پروفیسر افصح ظفر نے اختصار میں معصوم عزیز کاظمی کے خط اور پروفیسر حسین الحق کے افسانہ پر اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد شعری نشست بھی منعقد ہوئی۔ واضح ہو کہ یہ نشست اردو فکشن اور شاعری پر مشتمل تھی۔ ایک خوشگوار ادبی بحث اور خوشنما ماحول قائم کرنے کے لیے شرکا نے معصوم عزیز کاظمی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 نومبر 2017

'اے پی جے عبدالکلام: شخصیت اور خدمات' پر موضوع منعقدہ سمینار

تلنگانہ:

یومِ آزادتقریب

حیدر آباد: مولانا آزاد اور سرسید احمد خان تکثیریت اور کثرت میں وحدت پر ایقان رکھنے والے قائدین تھے۔ دراصل دونوں کی فکر کا ماخذ قدیم ہندوستانی تمدن اور اسلامی تہذیب کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ ان خیالات کا اظہار اختر الواسع، پروفیسر ایمریٹس جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کیا۔ وہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں یوم آزاد تقریب کے سلسلے میں منعقدہ مولانا آزاد یادگاری خطبہ دے رہے تھے۔ ان کے خطبے کا عنوان 'تہذیبی تکثیریت کے علم بردار: سرسید اور مولانا آزاد' تھا۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز وائس چانسلر نے صدارت کی۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ دونوں قائدین پرآشوب عہدوں کے عینی شاہد تھے۔ جہاں سرسید نے 1857 کی ہولناکی دیکھی، وہیں مولانا آزاد نے جدوجہد آزادی کی صعوبتیں برداشت کیں۔ دونوں حتی الامکان قوم کو سنبھالنے اور ایک صحیح سمت دینے کی کوشش کرتے رہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے کہا کہ دونوں قائدین مولانا آزاد اور سرسید نے اسلام کو بحیثیت دین کے سمجھا اور مسلکی اختلافات سے گریز کیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد جہاں ترجمان القرآن لکھتے ہیں وہیں ستار بھی بجاتے ہیں اور ہندو۔مسلم اتحاد کی بھرپور تائید کرتے ہیں۔ انیس اعظمی، صدرنشین یوم آزاد تقاریب نے کارروائی چلائی اور تقاریب پر رپورٹ پیش کی۔ ڈاکٹر فہیم اختر، صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ میر ایوب علی خان، کنوینر یوم آزاد تقاریب نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 نومبر 2017

راجستھان

تحریک آزادی میں اردو زبان وادب کی خدمات

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ قانون کے سینئر استاد پروفیسر شکیل صمدانی نے راجستھان یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی کے زیر اہتمام

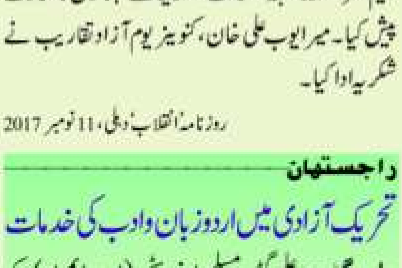

'تحریک آزادی میں اردو زبان وادب کی خدمات خصوصاً راجستھان کے حوالے سے' موضوع پر منعقدہ قومی سمینار میں اے ایم یو کی نمائندگی کی۔ پروفیسر شکیل صمدانی نے سمینار کی اختتامی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ جنگ آزادی میں اردو زبان نے اہم ترین تعاون پیش کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اخبارات سے وابستہ مدیران، مالکان، قلم کاروں اور شعرا نے اپنے اپنے انداز میں ملک کو آزاد کرانے میں اہم خدمات پیش کیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کا یہ مطلب ہرگز نہیں نکالنا چاہیے کہ اس میں صرف مسلمان ہی شامل تھے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ اردو اس دور میں کسی مخصوص فرقہ کی زبان نہیں تھی بلکہ اس سے بھی فرقوں اور علاقوں کے لوگ وابستہ تھے۔ انھوں نے کہا کہ تحریک آزادی میں راجستھان کا خصوصی کردار رہا ہے اور یہاں کے لوگوں نے بھی ملک کی آزادی میں تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 نومبر 2017

مدھیہ پردیش:

داستانِ مرثیہ کا انعقاد

بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکادمی محکمہ ثقافت کے ذریعے 30 اکتوبر 2017 کو شام 7 بجے اسٹیٹ میوزیم، شیاملہ ہلز، بھوپال میں 'مرثیہ گوئی' کربلا سے کاشی تک جشن بہار ٹرسٹ، دلی کے ذریعے ڈاکٹر کامنا پرساد اور اپرنا شریواستور کے ڈائرکشن میں پیش کیا گیا۔ داستان گو تھیں ملک کی اول خاتون داستان گو محترمہ فوزیہ کے علاوہ جناب فیروز اور محترمہ حنا کوثر۔ اس کے علاوہ 'مرثیہ پر سمینار' بھی منعقد کیا گیا جس میں ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا) نے مرثیہ میں اخلاقی اور سماجی قدریں، ڈاکٹر جلیل الرحمٰن، برہانپور نے جدید مرثیہ نگاری پر اپنے مضمون پڑھے جبکہ ڈاکٹر علی عباس امید نے بھوپال، مرثیہ گوئی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کئی مرثیہ بھی سنائے۔ ابتدا میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی سکریٹری، ڈاکٹر نصرت مہدی نے مہمانوں کا استقبال کرنے کے بعد پروگرام کے سلسلے میں بتایا کہ مرثیہ، اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے جو کربلا میں امام حسین اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کے بیان سے زیادہ مقبول ہوئی۔ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کی ابتدا 16 ویں صدی عیسوی میں دکن سے ہوئی۔ آہستہ آہستہ ایک صدی کے اندر اندر شمالی ہند پہنچ گئی۔ یوں تو مرثیے تمام ہندوستان میں لکھے جاتے رہے لیکن یہ صنف 19 ویں صدی میں لکھنؤ میں عروج کمال تک پہنچی۔ پروگرام کی نظامت محترمہ رشدا جمیل نے بہت خوبصورت انداز میں کی۔ کثیر تعداد میں موجود سامعین اس انوکھے پروگرام کے گواہ بنے۔

رپورٹ: سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال، 8 نومبر 2017

مغربی بنگال:

اے پی جے عبدالکلام: شخصیت اور خدمات

کلکتہ: مسلم انسٹی ٹیوٹ کے 115 سالہ جشن یومِ تاسیس کے تیسرے دن مغربی بنگال اردو اکادمی کے مولانا آزاد آڈیٹوریم میں سابق صدر جمہوریہ مرحوم اے پی جے عبدالکلام پر ایک قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں اشفاق احمد عارفی نے اے پی جے عبدالکلام: ایک عظیم دانشور، عبدالحئی نے ان کی شخصیت اور شاعری جبکہ صدر سمینار سائنسداں محمد خلیل نے ان کی سائنسی خدمات پر مقالے پیش کیے۔ متوسط خاندان کے ایک بچے نے اپنی محنت، ذہانت اور خدا پر کامل یقین رکھ کر صدر ہند کے منصب تک قدم رکھا۔ ہوائی جہاز اڑایا، راکٹ داغا اور جوہری دھماکے کر کے اپنے وطن کو جوہری ٹکنالوجی میں ترقی یافتہ ملکوں کی صفوں میں لاکھڑا کیا۔ وہ شخص حب الوطن بھی تھا، مذہبی بھی تھا، دوسروں کے مذاہب کی قدر کرنے والا تھا، وہ شخص اپنی مادری زبان 'تمل' سے بے حد محبت رکھتا تھا۔ اس نے اپنی حیات میں 40 ہزار سے زائد طلبہ سے خطاب اور ملاقات کر کے انھیں سائنس سے محبت سکھائی۔ اپنے صدارتی خطبہ میں سائنسداں محمد خلیل نے سامعین سے سوال کیا کہ کیا ہم اپنی مادری زبان سے

محبت کرتے ہیں، عبدالکلام تو خوب کرتے تھے۔ انھوں نے تمل اخبارات فروخت کیے، تمل زبان میں کتابیں پڑھیں، مضامین لکھے اور شاعری بھی کی۔ سوال یہ ہے کہ ہم کہاں ہیں؟ آج سائنسی دور ہے، کیا ہمارے بچے اردو پڑھتے ہیں، گھروں میں اردو رسالے آتے ہیں، سائنس کے رسالے آتے ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو ایسے سارے مقالے بیکار ہیں۔ سائنس خشک ضرور ہے لیکن اس میں گہرائی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تہذیبی رکھ رکھاؤ میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ خود کچھ نہ کرنے کا مسئلہ تھا۔ ہم جب تک رسالوں کی خریداری نہیں کرتے ہیں تو اس وقت تک ہم اپنی زبان سے محبت کا مظاہرہ نہیں کرتے ہیں، نہ ہی ہم بچوں میں سائنس سے محبت پیدا کر سکتے ہیں۔ سائنس رٹنے کا علم نہیں ہے بلکہ سمجھنے کا علم ہے۔ انھوں نے لوگوں سے تلقین کی کہ وہ سرکاری رسالہ 'سائنس کی دنیا' کے خریدار بنیں، اسے پڑھیں، اسے عام کریں۔ انھوں نے اپنے مقالے میں کہا کہ عبدالکلام نے ہوائی جہاز، سٹیلائٹ اور میزائل انجینئرنگ سے متعلق تحقیقی و ترقیاتی منصوبوں سے گرانقدر سربراہی کا مظاہرہ کیا۔ اشفاق احمد عارفی نے کہا کہ عبدالکلام اپنی ذات میں انسانیت کی مشعل جلاتے ہوئے جیتے رہے۔ دفاعی ٹکنالوجی کو مفاد عامہ میں استعمال کے نظریے کے خواب کی عملی تعبیر کرتے ہوئے اس سے سماجی فلاح اور انسانی بہبود کی قابل تقلید مثال بھی پیش کی۔ پولیو سے متاثرہ بچوں کو لکڑی کی بھاری بھرکم ٹانگوں کے ذریعہ اذیت کے ساتھ چلتے دیکھ کر میزائل ٹکنالوجی میں استعمال ہونے والے Florr Reaction Orthosis یعنی FRO جس کے ذریعے ہندوستان میں موجود بھی ہیں سے مصنوعی ٹانگوں کی ایجاد کی تجویز دی۔ اس کے بعد DRO سے تیارہ کردہ FRO سے تیار محض 300 گرام کی خفیف ترین مصنوعی ٹانگوں کی تقسیم ان ہی کی جیب خاص سے ایک غریب پولیو زدہ لڑکی کی مدد کی، اس کے علاوہ جدید ترین حمل مخالف آلہ، آئی یو سی ڈی اور کاربن کے مرکب سے دل کی دیوار اور کولھے کی ہڈی کی تنصیب کے ڈیزائن کی تیاری بھی ہے۔ اس موقعے پر مسلم انسٹی ٹیوٹ کے جنرل سکریٹری، نثار احمد بھی موجود تھے۔ نقابت کی ذمے داری سمینار کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر نوشاد مومن نے نبھائی۔ سمینار میں رسم شکریہ ادا کی اور کہا کہ ایسے سمینار وقت کی ضرورت ہیں تا کہ اردو کے دامن کو مزید وسعت دی جاسکے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 6 دسمبر 2017

اعزاز و اکرام:

غالب انسٹی ٹیوٹ کے ایوارڈ کا اعلان

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کی ایوارڈ کمیٹی کی ایک اہم میٹنگ 27 نومبر کو ایوانِ غالب میں غالب ایوارڈ کمیٹی

کے چیئرمین جسٹس آفتاب عالم کی صدارت میں ہوئی، جسٹس آفتاب عالم کے علاوہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر چندشیکھر، ڈاکٹر اطہر فاروقی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر میٹنگ میں موجود تھے۔ اس اہم موقعے پر تمام ممبران نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے پروقار غالب انعامات 2017 کے 6 اہم انعامات پر فیصلہ کیا۔ اردو کے ممتاز ناقد و دانشور کئی اہم کتابوں کے مصنف اور شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق پروفیسر قاضی جمال حسین کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے اردو تحقیق وتنقید کے لیے منتخب کیا گیا۔ فارسی کے نامور اسکالر اور رضا لائبریری رام پور کے ڈائرکٹر پروفیسر سید حسن عباس کو فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے فارسی تحقیق و تنقید کے لیے منتخب کیا گیا۔ معروف تحقیق کار و اردو مشاورتی کمیٹی، بہار کے چیئرمین شفیع مشہدی کا نام غالب ایوارڈ برائے اردو نثر کے لیے طے کیا گیا۔ عہد حاضر کی نامور شاعرہ اور کلکتہ یونیورسٹی شعبۂ اردو کی سابق چیئر پرسن پروفیسر شہناز نبی کا نام غالب انعام برائے اردو شاعری کے لیے تجویز کیا گیا۔ ہم سب غالب انعام برائے اردو ڈرامہ کے لیے مشہور ڈرامہ نگار اور اپنی تحریر کے ذریعے اردو زبان وادب کے فروغ میں اپنا اہم کردار ادا کرنے والے ڈرامہ نویس ڈاکٹر محمد کاظم کے نام پر اتفاق ہوا۔ اور مجموعی ادبی خدمات کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر و شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر ارتضیٰ کریم کے نام پر میٹنگ میں بیٹھے تمام لوگوں نے اتفاق کیا۔ یہ تمام ایوارڈ بین الاقوامی غالب تقریبات کے افتتاحی اجلاس 22 دسمبر 2017 کو سرٹیفکیٹ، مومنٹو اور 75 ہزار روپیہ نقد کے ساتھ ایوانِ غالب میں عطا کیے جائیں گے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ پچھلے 40 برسوں سے 200 سے زائد انعامات اردو و فارسی، ادب، ثقافت، سائنس اور مختلف علوم وفنون میں کام کرنے والے اہم دانشوروں کو ان کی گرانقدر خدمات کے لیے نواز چکا ہے۔

غالب ایوارڈ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اردو اور فارسی کے اساتذہ، ادبا، شعرا اور نامور ہستیوں کے مشوروں کو مدنظر رکھ کر ایوارڈ کمیٹی انعامات کا فیصلہ کرتی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 نومبر 2017

شہپر رسول دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین

نئی دهلی: اردو زبان کے معروف استاد اور شاعر، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر شہپر رسول کو دہلی اردو اکادمی کی کمان بطور وائس چیئرمین کی ذمے

داری سونپی گئی ہے۔ پروفیسر شہپر رسول معلوم ہے کہ ایک معروف شاعر، ادیب اور نقاد ہیں اور اردو کے سینئر استاد کی حیثیت سے ملک اور بیرونِ ملک میں ملک کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ پروفیسر وجیہ الدین (شہپر رسول) 17 اکتوبر 1956 کو اترپردیش کے ضلع امروہہ، قصبہ چھجرایوں میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی اور پی ایچ ڈی کی ڈگری جامعہ ملیہ اسلامیہ سے حاصل کی۔ پروفیسر شہپر رسول کی شناخت شاعر اور نقاد کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ وہ اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے اپنے فرائض

انجام دے رہے ہیں۔ ان کی مطبوعات میں 'صدف سمندر'، 'سخن سراب'، 'اردو غزل کی پیکر تراشی: آزادی کے بعد'، 'چشم دروں'، 'نقش و رنگ'، 'بیانۂ صفات'، وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی متعدد کتابوں پر اتر پردیش اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی اور اردو اکادمی، دہلی کی جانب سے انعامات مل چکے ہیں۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 دسمبر 2017

پروفیسر طلعت احمد کو سرسید لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد کو ان کی تعلیم اور سائنسی تحقیق میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں طلبائے قدیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، نیویارک نے انھیں ایک پروقار تقریب میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا۔ یہ اعزاز نیویارک میں سید احمد خان کی پیدائش کے دوسو سال مکمل ہونے پر ان کی یاد میں منائے جانے والے پروگرام میں پیش کیا گیا، جہاں مہمان خصوصی

کی حیثیت سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر شریک تھے۔ پروفیسر احمد خود بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قدیم طلبا میں سے ہیں۔ نیویارک میں پروفیسر طلعت احمد نے بروکلن کالج کا دورہ بھی کیا جہاں انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سینٹر فار ارلی چائلڈ ہوڈ ڈیولپمنٹ اینڈ ریسرچ اور اسکول آف ارلی چائلڈ ہوڈ اینڈ آرٹس کے مابین اشتراک کے موضوع پر بات چیت کی۔ اس ادارے میں بروکلن کالج کے پروفیسر جیکلن شینن (چیئر، اسکول آف ارلی چائلڈ ہوڈ اور آرٹس ایجوکیشن)، پروفیسر مریم ڈیبی اور پروفیسر شاہین عثمانی کی موجودگی میں پروفیسر احمد نے انضمام تعلیم کی ضرورت پر زور دیا اور معذور بچوں کی حالت کی اصلاح کے امکانات پر تبادلہ خیال کیا۔ نیشنل سیمپل سروے آرگنائزیشن (این ایس ایس او 2002) کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں تقریباً 18.5 ملین افراد (1.8 فیصد آبادی) میں اضافہ ہوا ہے، پروفیسر احمد اور پروفیسر ڈیبی دونوں اس مسئلے کو حل کرنے کے عہد بند تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 نومبر 2017

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی انعامات

ممبئی: مہاراشٹر کے وزیر برائے اقلیتی امور اور تعلیم ونود تاوڑے نے کہا ہے کہ اردو زبان ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی ایک شناخت ہے جس میں نزاکت و شرافت پائی جاتی ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ اردو ہندوستان کی عزت ہے اور اس کی شیرینی سے سبھی لوگ فیضیاب ہو رہے ہیں۔ گزشتہ شب جنوبی ممبئی کے وائی بی چوان آڈیٹوریم میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی تقریب تقسیم انعامات سے خطاب کرتے ہوئے ونود تاوڑے نے مزید کہا کہ اردو میں اس ملک کی خوشبو ہے۔ کسی دوسرے ملک کے ذریعے اس زبان کو اپنانے کی وجہ سے یہ ہمارے لیے غیر نہیں ہوجاتی بلکہ اس کی جڑیں ہماری تہذیب وثقافت میں انتہائی گہری ہیں۔ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اردو ادب نہ پڑھے جانے سے زبان کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ مراٹھی، ہندی کی طرح اردو زبان کا فروغ بھی انتہائی ضرور ہے۔ اردو اکادمی کی اس تقریب میں وزیر مملکت دلیپ کامبلے، سماج وادی لیڈر ابوعاصم، ممبران قمر سید، فاروق سید، رفیق شیخ، اعجاز فاطمہ پاٹنکر وغیرہ موجود تھے۔ سال 2015 اور 2016 کے لیے انعامات کا اعلان کیا گیا ہے، مرزا غالب لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ کے لیے مصنف فضیل جعفری اور قاضی عبدالستار کے ناموں کا اعلان کیا گیا لیکن علالت کے سبب دونوں نے شرکت سے معذوری ظاہر کی۔ اس موقعے پر ولی دکنی ایوارڈ نیو ٹیلنٹ، لے آؤٹ ڈیزائننگ، صحافتی اور دیگر انعامات اور خصوصی ایوارڈز دیے گئے۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 15 نومبر 2017

فخر صحافت ایوارڈ

دیوبند: اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی جانب سے یوم اردو کے موقعے پر دیوبند کے 5 اردو صحافیوں کو 'فخر صحافت ایوارڈ'

سے نوازا گیا۔ تفصیل کے مطابق یوم اردو کے موقعے پر ضلع مظفرنگر کے رحمت نگر میں واقع آئی پی ایس کڈس میں منعقدہ پروگرام میں دیوبند کے اردو صحافی اشرف عثمانی، رضوان سلمانی، عارف عثمانی، چودھری سمیر کو 'فخر صحافت' کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اردو صحافیوں کو مبارکباد دیتے ہوئے دارالعلوم وقف دیوبند کے مہتمم مولانا محمد سفیان قاسمی نے کہا کہ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے یوم اردو کے موقعے پر دیوبند کے اردو صحافیوں کو 'فخر صحافت ایوارڈ' سے نواز کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کا یہ قدم لائق تحسین اور قابل مبارکباد ہے۔ مولانا ندیم الواجدی نے کہا کہ دیوبند کے اردو صحافیوں کو یہ اعزاز ملنا ان کی ایماندارانہ صحافت کی دلیل ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان صحافیوں کی جدوجہد، محنت لگن اور صاف ستھری صحافت ہی ان کی پہچان ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے پروفیسر سید سراج اجملی نے کہا کہ اردو صحافت کا دائرہ محدود ہونے کی وجہ سے بھی وہ اپنے مشن کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافی اپنی محنت کی طاقت پر اردو تحریر سے معاشرے کے ہر طبقے کو متعارف کرانے کا کام کر رہے ہیں۔ یہ ان کی کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے کہ موجودہ وقت میں بھی اردو صحافت کا وجود قائم ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 نومبر 2017

ڈاکٹر محمد سعادت شریف کو بیسٹ ٹیچر ایوارڈ

حیدرآباد: 20 نومبر ڈاکٹر محمد سعادت شریف، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ کامرس، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو تلنگانہ اردو اکیڈیمی کی جانب سے بیسٹ اردو ٹیچر ایوارڈ 2016-17

سے سرفراز کیا گیا ہے۔ انھیں یہ ایوارڈ اردو زبان میں گراں قدر تعلیمی وسماجی خدمات کے اعتراف میں دیا گیا ہے۔

موصوف کامرس کے بہترین استاد ہیں اور انھوں نے اردو کے ذریعہ پوری تعلیم حاصل کی ہے۔ کامرس کے موضوع پر ان کی اردو میں کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں 'ایڈوانسڈ مینجمنٹ اکاؤنٹنگ' اور 'لاگت اور انتظامی کھاتے' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر سعادت شریف نے ''کسانوں کی خودکشی کے سماجی ومعاشی اثرات- علاقہ تلنگانہ کے حوالے سے'' کے موضوع پر جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد سے پی ایچ ڈی کی ہے۔ موصوف مولانا آزاد

نیشنل اردو یونیورسٹی میں گذشتہ 12 برسوں سے تعلیم و تدریس سے وابستہ ہیں۔ اس سے قبل وہ ضلع محبوب نگر میں 17 سال سے زائد عرصہ تک مختلف مدارس میں بحیثیت سرکاری مدرس خدمت انجام دے چکے ہیں۔

پریس ریلیز: ایس او، پبلک ریلیشنز، آفس، مانو، حیدرآباد،20 نومبر 2017

اقصیٰ سکندر کو اعزاز

نئی دہلی: زینت محل اسکول کی ٹاپر اور اردو مضمون میں صد فیصد نمبر حاصل کرنے والی ہونہار طالبہ اقصیٰ سکندر کو

گروپ آف حج اینڈ سوشل ورک آرگنائزیشن نے ایک تقریب میں اعزاز سے سرفراز کیا۔ گروپ کے صدر حاجی ادریس خاں کی رہائش گاہ واقع ترجمان گیٹ میں منعقد تقریب میں شہر کی سرکردہ شخصیات کی موجودگی میں اقصیٰ سکندر کو ٹرافی، سند اور نقد انعامات سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر حاجی ادریس نے کہا کہ اقصیٰ سکندر نے بارہویں بورڈ امتحانات میں صد فیصد نمبر حاصل کرکے غیر معمولی کام کیا ہے، یہ یقیناً اس کی سخت محنت کا ثمرہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ گروپ آف حج اینڈ سوشل ورک آرگنائزیشن عازمین حج کی خدمت کے ساتھ سماجی کاموں کو بھی کرنے کا جذبہ رکھتا ہے، لہٰذا گروپ نے اس ہونہار طالبہ کی حوصلہ افزائی کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ تعلیمی شعبے میں نمایاں کارکردگی پیش کرنے والے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ اس سے ان میں مقابلہ جاتی دور میں آگے بڑھنے کا حوصلہ اور جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ گروپ کے سکریٹری حاجی ریاض الدین، خزانچی حاجی ظہور اینٹھی والے، حافظ مطلوب کریم، حاجی صابرین اور ذوالفقار قریشی نے بھی اقصیٰ سکندر کی تعلیمی کامیابی پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 دسمبر 2017

اجرا:

جدید ہندی شاعری

نئی دہلی: یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ اردو اور ہندی خانوں میں بٹی رہی۔ ان دیواروں کو ٹوٹنا چاہیے اور یہ کتاب اس جانب ایک بڑا قدم ہے۔ ان خیالات کا اظہار انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام اردو گھر نئی دہلی میں خورشید اکرم کی ترتیب دی ہوئی کتاب جدید ہندی شاعری کی رسم رونمائی کے موقعے پر مشہور دانشور و نقاد پروفیسر شمیم حنفی نے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ زبانوں کے بیچ فرق سیاست نے پیدا کیا ہے اور جب زبان اور ادب سیاست کا حصہ بن جائیں تو بڑی تباہی آتی ہے۔ شمیم حنفی نے مزید کہا کہ اس کتاب میں شامل نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ اتنی آسان زبان میں ہے کہ اس میں اردو نظمیں بھی ملا دی جائیں تو یہ آپس میں گھل مل جائیں گی۔

اس موقعے پر ہندی کے مشہور نقاد پروفیسر وشوناتھ ترپاٹھی نے کہا کہ وہ پابند شاعری کے بہت قائل رہے ہیں لیکن شاعری اب اپنے ارتقا کے اس درجے میں پہنچ گئی ہے کہ بحر سے آزاد شاعری پڑھ کر بھی مہاکاویہ کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دنیا کو اپنا وجود بچائے رکھنے کے لیے شاعری کی بہت ضرورت ہے۔ سیاست اور سماج میں شاعری کی کمی کا نتیجہ ہے کہ آج یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ اب صرف سیر کرنا خطرناک ہے۔ مشہور ہندی شاعر منگلیش ڈبرال نے کہا کہ اس طرح کے کاموں سے دو زبانوں کے بیچ کی دوری کم ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب کو دیکھ کر یہ لگتا ہے کہ یہ ہندی شاعری کا نہیں نظموں کا انتخاب ہے اور جس میں پورے طور پر خورشید اکرم کی اپنی پسند کا دخل ہے۔

اس موقعے پر دوسرے شرکا نے بھی خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 نومبر 2017

دشت زاد

بھونیشور: اڑیسہ کے معروف شاعر سہیل اختر کی شاعری کے حوالے سے اظہار کرتے ہوئے مہمان خصوصی اور اڈیشہ اردو اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر سید مشیر عالم نے کہا کہ وہ جتنے سادہ مزاج اور سنجیدہ ہیں اتنی ہی ان کی شاعری میں شخصی درد و کرب، اداسی، محرومی اور بے بسی کے ساتھ دورِ حاضر کا منظرنامہ بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر سید مشیر عالم نے یہ بات سہیل اختر کے مجموعے 'دشت زاد' اور احسن امام احسن کی کتاب 'مہاراشٹر کے قلم' کی رسم رونمائی انجام دیتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ یہی چیزیں ان کی شاعری میں بھی جھلکتی ہیں اور وہ اپنا ایک منفرد تیور رکھتے ہیں۔ آج کے انسان کا المیہ، اس کے مسائل جیسے انسانیت، بھائی چارہ، اقدار نیز وفاپرستی کا فقدان وغیرہ کا خوبصورت اور منفرد تخلیقی اظہار ان کے یہاں پایا جاتا ہے۔ بھیڑ میں رہتے ہوئے اپنی الگ شناخت پر اصرار کرتے ہیں جس میں وہ کامیاب بھی ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 نومبر 2017

مختلف کتابوں کا اجرا

گورکھپور: دبستان گورکھپور ہمیشہ سے اپنی علمی، ادبی، سماجی و ثقافتی سرگرمیوں کے باعث اردو دنیا میں جانا جاتا رہا ہے۔ اسی گورکھپور میں 'اسٹار چیریٹیبل ٹرسٹ' کی جانب

سے چوتھا 'سید مظہر علی شاہ میموریل آل انڈیا مشاعرہ و کوی سمیلن' کا انعقاد ہوا۔ یہ مشاعرہ 11 نومبر 2017 کی ایک شام 'منشی پریم چند اور فراق کے نام' کے عنوان سے میاں صاحب اسلامیہ انٹر کالج کے وسیع میدان میں ہوا جس کی نظامت بین الاقوامی شاعر اور ناظم ڈاکٹر کلیم قیصر نے کی۔ اس موقعے پر گورکھپور کی چار شخصیات کو ان کے کارناموں کے باعث اعزاز سے نوازا گیا۔ جن میں جناب وید پرکاش پانڈے (ادیب)، پروفیسر کمار ہرش سنہا (ماہر تعلیم و صحافی)، اشفاق احمد عمر (ریسرچ اسکالر، جے این یو، دہلی)، ڈاکٹر درخشاں تاجور (معروف ادیبہ اور مورخ) وغیرہ قابل مبارک ہیں۔ اعزاز کے بعد نوجوان محقق اشفاق احمد عمر، حمید اللہ (ایگزیکیوٹیو انجینئر محکمہ آب پاشی، اتر پردیش) کی مرتب کی ہوئی کتاب 'جذبات مائل' کلیات مائل گورکھپوری اور ڈاکٹر ہیم لتا کی کہانیوں کا مجموعہ 'کشمکش' کی رسم اجرا مہمان خصوصی آئی اے ایس جناب اکھلیش کمار مشرا، پروفیسر وسیم بریلوی، ڈاکٹر کلیم قیصر، مشہور و معروف معالج ڈاکٹر وجاہت کریم، ڈاکٹر سرہیرتا کریم، ڈاکٹر عزیز احمد، جسٹس کلیم اللہ، کے ہاتھوں ادا کی گئی۔

مشاعرے کا باضابطہ آغاز مشہور شاعر اقبال اشہر کی نظم 'اردو ہے میرا نام' سے ہوا۔ اس مشاعرے میں جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا ان میں پروفیسر وسیم بریلوی، محمد موسیٰ (دبئی)، آفتاب قریشی (سعودی عربیہ)، منظر بھوپالی، اقبال اشہر، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، پرمود تیواری، شبینہ ادیب، حسن کاظمی، انا دہلوی، شائستہ ثنا، ڈاکٹر نسیم نکہت، عثمان مینائی، پی کے دھت، ڈاکٹر اتل چوبے، انشو پریا، ڈاکٹر اکھلیش مشرا، ڈاکٹر ماہتاب عالم، سنیل کمار تنگ، ملک زادہ جاوید وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز: اشفاق حق، 20 نومبر 2017

داستانِ حریت

پانی پت: کسی بھی قوم کو اس کے ماضی اور اس کی تہذیب وتمدن سے دور کرنا ہوتو اس کو خود کی تاریخ سے دور کردو، اس سے کتابی ورثہ چھین لو، اسلاف کے کارناموں کو اوجھل کردو، تب وہ قوم اسی رنگ میں رنگ جائے گی، جس میں آپ رنگنا چاہتے ہیں اور پھر متعلقہ سماج ہراس چیز کو حرزِ جان سمجھے گا جو آپ کو دیں گے۔ ان خیالات کا اظہار ریاست اتراکھنڈ کے مفتی اعظم مفتی رئیس احمد نے اس 'داستانِ حریت' نامی کتاب کو قوم کے نام جاری کرتے وقت مدرسہ فیض القرآن میں کیا۔ انھوں نے کہا کتابیں اس خیرامت کا عظیم سرمایہ ہیں اور امت مسلمہ کے پاس ہر موضوع پر اس قدر سرمایہ ہے کہ دیگر اقوام کے پاس اس کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے، انھوں نے کہا آج جو کچھ طبی درس گاہوں، دوربین، کیمیا وسیمیا اور طبعیات وفلکیات نیز جراحی میں ہے اس کی بنیاد ہمارے ہی اکابر نے ڈالی تھی، ہم پر بوجہ تعیش غفلت طاری ہوگئی اور دوسری اقوام نے ان علوم کا ترجمہ کرکے اصلاحات کیں اور ان کے مبادی واصولوں کو عہد جدید کے موافق کرلیا، یہی وہ نکتہ ہے، جہاں امت مسلمہ سے تاریخی چوک ہوئی ہے اور وہاں صورت حال میں تلافی مافات میں دقتیں پیش آرہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ابن رشد، ذہبی، بوعلی سینا اور دوسرے مسلم حکما وماہر فلکیات کو تاریخ سے ان مٹ نہیں کیا جاسکتا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 نومبر 2017

وضعات واضاءات

نئی دهلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کی فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز کی جانب سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ٹیگور ہال، دیارِ میر تقی میر میں فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز کے سابق ڈین پروفیسر ضیاء الحسن ندوی مرحوم کی کتاب 'وضعات واضاءات' کی تقریب رسم اجرا منعقد ہوئی۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر وہاج الدین علوی نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر ظفرالاسلام خان نے شرکت کی۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے کتاب کے مرتب اور شعبۂ عربی کے استاد پروفیسر عبدالماجد قاضی نے کتاب اور مصنف کا تعارف پیش کیا اور کہا کہ مصنف آج گرچہ ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی تحریریں ان کی قدآور شخصیت کا عکس جمیل ہیں، ان کی خوشگوار یادوں کا لطیف احساس ہمیں اس وقت بھی ہوا تھا جب ان کے اردو مضامین کو 'اوراق پریشاں' کے عنوان سے مرحوم کی شریک حیات 'رضیہ سلطانہ' نے شائع کیا تھا۔ مرحوم کی کتاب 'وضعات و اضاءات' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ 'روشنی کی جھلکیاں' مرحوم کے ادبی، شعری، تاریخی، مناہج تعلیم و تربیت اور دینی وفکری مضامین پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ 'تابانیاں' ترجموں پر مشتمل ہے، جس میں مختلف علمی وفکری موضوعات پر مشرق ومغرب کے اہم ترین مضامین کے ترجمے پیش کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام نے کہا کہ ان کا مطالعہ اور علم انتہائی وسیع تھا، وہ عربی زبان وادب، تاریخ، اسلامیات اور اردو زبان وادب پر یکساں قدرت رکھتے تھے، ان کے علمی وفکری مضامین اور تراجم کی اشاعت ایک انتہائی قابل قدر عمل ہے۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ میں نے ان کو صاحب طرز ادیب پایا، وہ انتہائی بذلہ سنج شخصیت کے مالک تھے۔ شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر حبیب اللہ خان نے مرحوم کی شخصیت کو انتہائی پرکشش اور نفع بخش بتایا، انھوں نے کہا کہ مرحوم کی شخصیت روشن اور پرنور تھی اور لوگ ان سے روشنی حاصل کرتے تھے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 24 نومبر 2017

راجدھانی ایکسپریس

نئی دهلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس کے کمیٹی روم میں 'ایجوکیشنل ہاؤس دہلی اور ایشیا ٹائمز' کے باہمی اشتراک سے ایک پروگرام منعقد کیا گیا جس میں ڈاکٹر سلیم خان کی کتاب 'راجدھانی ایکسپریس (ناول)' کا اجرا پروفیسر شہپر رسول صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر غضنفر علی ڈائرکٹر اکیڈمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر خالد مبشر نے کی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی ڈاکٹر تابش مہدی نے کہا کہ سلیم خان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ موضوع کو سماج سے مربوط رکھتے ہیں اور قاری کو اپنی کتاب پڑھنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ ڈاکٹر سلیم خان کا مزاج تخلیقی ہے۔ وہ ایک ناول نگار ہی نہیں بلکہ بہترین مضمون نگار بھی ہیں۔ انھوں نے کئی ناولیں اور کہانیاں بھی لکھی ہیں جو کہ قابل رشک ہیں۔ مختصر یہ کہ مقالہ میں اعتراف کیا کہ راجدھانی ایکسپریس کا موضوع سلیم خان کی فکری اور فنی انفرادیت کا غماز ہے۔ تقریب رسم اجرا میں پروفیسر کوثر مظہری، قاسم رسول الیاس اور ڈاکٹر خالد جاوید کے علاوہ بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالرز بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 نومبر 2017

آوارجہ[1]

پٹنه: بزم انقلاب کی ماہانہ ادبی نشست کے موقعے پر نئی غزل کے پیش رو شاعر حسرت موہانی یاد کیے گئے۔ ڈاکٹر توقیر عالم توقیر نے کہا کہ حسرت نے اس وقت غزل کو سہارا دیا جب ملک میں مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا

محمد حسین آزاد کی تحریک پر جدید نظم کی آبیاری کی جارہی تھی۔ ان کی غزلوں میں جابہ جاایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو حب الوطنی سے سرشار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حسرت موہانی ایک عہد ساز شاعر تھے۔ جن کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ وہ ایک اچھے شاعر کے ساتھ معروف صحافی اور مجاہد آزادی بھی تھے۔ انقلاب کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر احمد جاوید نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اس بزم میں ہماری عام دعوت پر جتنی بڑی تعداد میں خواص جمع ہوجاتے ہیں، ہم چاہتے ہوئے بھی اس کا شکر و سپاس نہیں کرسکتے۔ نشست کے آغاز میں اردو شعر ونغمہ کی معتبر آواز قیصر صدیقی کے دست مبارک سے مشہور شاعر شکیل سہرامی کے مجموعہ کلام 'آوارجہ' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ جناب قیصر صدیقی نشست کی صدارت کررہے تھے۔ نشست کے دیگر شرکا میں احسن راشد، ظفر صدیقی، جلال کاکوی، ارشد حسین ارشد، بے نام گیلانی، گمنام صدیقی، عامر نظر، محمد نصر عالم نصر، شمیم شعلہ، شکیل سہرامی، عرفان احمد بیلہاڑی، افتخار عاکف کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 نومبر 2017

[1] حساب کتاب

وفیات:

ریاض ہاشم نوگانوی

نوگانواں سادات: اردو ادب کی معروف شخصیت اور نوگانواں سادات میں عصر حاضر کے نامور استاد شاعر ریاض ہاشم نوگانوی کا 80 سال کی عمر میں 11 نومبر کو انتقال ہوگیا، مرحوم کی آخری رسومات ان کے آبائی قبرستان سیدوالہ میں ادا کی گئی جہاں مولانا عزیز الحسن نے نماز جنازہ ادا کرائی۔ تدفین میں کئی ہزار لوگوں نے اس کربلائی شاعر کو نمناک آنکھوں سے رخصت کیا۔ اردو

ادب کے معمار ریاض ہاشم نوگانوی کے کم وبیش 100 سے زائد شاگرد ہیں جو نہ صرف ملک بلکہ بیرون ملک میں بھی حلقہ کا نام روشن کر رہے ہیں۔ ریاض ہاشم نوگانوی کی 20 سے زائد اہم کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں سب سے زیادہ ریاض سخن اور ریاض کوثر نہایت مقبول ہوئیں۔ مرحوم کے پسماندگان میں 2 بیٹے اور 2 بیٹیاں ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 12 نومبر 2017

کنور نارائن

نئی دہلی: گیان پیٹھ اور پدم بھوشن اعزاز یافتہ ہندی کے معروف شاعر کنور نارائن کا طویل علالت کے بعد 15 نومبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ 90 برس کے تھے۔ ان کے

کنبے میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا ہے۔ ان کی آخری رسومات شام پانچ بجے لودھی روڈ شمشان گھاٹ پر ادا کی گئی۔ 19 ستمبر 1927 کو فیض آباد میں پیدا ہوئے مسٹر کنور نارائن (معروف ادیب) 'اگیئے' کے ذریعے مرتب شدہ 'تیسرا سپتک' ہندی شاعری میں مشہور ہوئے تھے اور سات دہائی سے ادب میں سرگرم تھے۔

ساہتیہ اکادمی، بھارتیہ گیان پیٹھ جنوادی لیکھک سنگھ سمیت کئی تنظیموں نے ان کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے اور اسے ہندی ادب کے لیے ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔ بھارتیہ گیان پیٹھ کے ڈائرکٹر لیلا دھر منڈلوئی میں کہا کہ کنور نارائن ہندی کے ایک مفکر اور شاعر تھے اور شاعری کے علاوہ انھوں نے تنقید اور فلموں کے تعلق سے تحریر کیا۔ معروف شاعر اور نقاد اشوک باجپئی نے انھیں اگیئے کے بعد ہندی کا دوسرا مفکر شاعر قرار دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ادب میں انسانیت نوازی اور تہذیبی اقدار پر سوالات اٹھائے۔ مسٹر کمار نارائن کو 2005 میں گیان پیٹھ اور 2009 میں پدم بھوشن کے علاوہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ نیز ہندی اکادمی کا شلا کا سمان، ویاس سمان، کبیر اور پریم چند پرسکار بھی ملا تھا۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے 1951 میں انگریزی ادب میں ایم اے کیا تھا۔ ان کی اہم تخلیقات میں آتم جئی، کوئی دوسرا نہیں، واج شروا، آمنے سامنے اور آکاروں کے آس پاس شامل ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 نومبر 2017

شمس جلیلی

پورنیہ: قادرالکلام شاعر و ادیب شمس جلیلی ایڈوکیٹ (اصل نام: محمد شمس الزماں، ولادت 4 جولائی 1935،

مقام لائن بازار، پورنیہ، ولد: محمد عبدالجلیل مرحوم) کا انتقال 14 نومبر 2017 کو بوقت مغرب ہوگیا۔ ان کی رحلت سے پورا سیمانچل سوگوار ہے۔ مرحوم نہایت خلیق، ملنسار اور مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل تھے۔ پسماندگان میں شریک حیات کے علاوہ بیٹے آفتاب الزماں اور بیٹیاں ہما غزالہ، گلستاں شمسی شامل ہیں۔ سیمانچل میں وہ بے حد متحرک، فعال ادبی شخصیت تھے۔ ان کی مطبوعہ کتابوں میں ڈاکٹر فیض الرحمٰن (پورنیہ کمشنری کی ایک تاریخ ساز شخصیت، آئینہ شیشہ باڑی واطراف (کتابچہ)، بابائے سرجاپوری اور ان کے باوا، محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی (مثنوی)، مکاں سے لامکاں تک' (شعری مجموعہ) شامل ہیں جبکہ 'شاہنامۂ سیمانچل' (منظوم تاریخ پورنیہ کمشنری)، مقامات ومقالات شمس جلیلی (منثور ومنظوم) ان کی زیر طبع کتابیں ہیں۔ اسی سال جون میں بہار اردو اکادمی کے سکریٹری جناب مشتاق احمد نوری نے انھیں مجموعی خدمات کے اعتراف میں پروگرام 'اکادمی آپ تک' کے تحت اعزاز ونقد رقم سے نوازا۔ مرحوم نے بی اے (اردو آنرس) کی تعلیم سینٹرل کلکتہ گورنمنٹ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج) کلکتہ سے حاصل کی اور یہاں قائم 'بزم اردو' نامی ادبی انجمن کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔

بذریعہ فیس بک، 16 نومبر 2017

زاہد عیش

پٹنہ: طنز ومزاح کے مشہور ومعروف شاعر جناب زاہد عیش 29 نومبر بروز بدھ بوقت ساڑھے تین بجے مالک حقیقی سے جاملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ موصوف کی عمر 82 سال کی تھی۔ ان کا مجموعہ کلام 'چٹکیاں' کے نام سے منظر عام پر آکر داد وتحسین حاصل کرچکا ہے۔ ان کے انتقال پرملال پر معین گریڈیہوی کے علاوہ قومی تنظیم کے دیگر اراکین نے اظہار تعزیت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کی مغفرت کرتے ہوئے ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ (آمین)

روزنامہ 'قومی تنظیم' پٹنہ، 30 نومبر 2017

راشدہ خلیل

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ اردو کے سابق استاد اور برصغیر کے ممتاز شاعر پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی کی اہلیہ محترمہ راشدہ خلیل کا طویل بیماری کے بعد مسلم یونیورسٹی کے جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج میں 1 دسمبر 2017 کو انتقال ہوگیا۔ وہ 74 سال کی تھیں۔ محترمہ راشدہ خلیل کو بعد نماز جمعہ یونیورسٹی قبرستان منٹو۔ اسی میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کی نماز جنازہ میں بڑی تعداد میں یونیورسٹی اور شہر کی معزز شخصیات نے شرکت کی۔ انھوں نے پسماندگان میں دو بیٹوں کے علاوہ ایک بیٹی کو چھوڑا ہے۔ ان کے ایک فرزند ڈاکٹر سلمان خلیل جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج کے کمیونٹی میڈیسن شعبہ میں سینئر استاد ہیں۔ واضح ہو کہ محترمہ راشدہ خلیل نے عمر کا طویل عرصہ سماجی خدمات کی نذر کیا۔ وہ علمی و ادبی سرگرمیوں کی سرپرست کی حیثیت سے جانی جاتی تھیں۔ محترمہ راشدہ تعلیم نسواں کی زبردست حامی وعلمبردار تھیں۔ انھوں نے خواتین کے علمی و ادبی فروغ کے لیے 'بزم ادب خواتین' تشکیل دی تھی جو عرصۂ دراز سے سرگرم عمل ہے۔ وہ خواتین کے ممتاز جریدے 'بزم ادب خواتین' کی مدیر اعلیٰ بھی تھیں جس کے توسط سے انھوں نے سیکڑوں نئی قلم کار خواتین کی حوصلہ افزائی کا فریضہ انجام دیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 2 دسمبر 2017

فکشن نگار ارشاد امروہوی

نئی دہلی: اردو ادب اپنے ایک انتہائی مخلص خدمت گزار ارشاد امروہوی کا انتقال 1 دسمبر کو ہوگیا۔ ارشاد امروہوی اردو ادب کے نہ صرف ایک مخلص خدمت گزار تھے بلکہ ایک بہترین افسانہ نگار اور ناولسٹ بھی تھے، آپ ایک طویل عرصے سے بڑی خاموشی کے ساتھ ادب کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ ارشاد امروہوی نے کم و بیش بیس ناول لکھے، جن میں سے ان کے لکھے ہوئے کچھ

ناول اپنے وقت میں کافی مقبول ہوئے، جیسے دیوار کے پیچھے، کبھی دھوپ کبھی چھاؤں، بیوی اور وہ، دلیز کی خوشبو وغیرہ ان کے بہترین ناول ہیں، جن میں انھوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے اقدار، اور اخلاقی قدروں کے زوال اور انسانی سماج کے ٹوٹتے اور بکھرتے ہوئے رشتوں پر کافی دلپذیر انداز میں خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کے مزاحیہ افسانے کا مجموعہ 'خیر مقدم کا ہوکا' طنز و ظرافت کا بہترین نمونہ ہے، ارشاد امروہوی طنز و مزاح کے انداز میں بھی اپنی بات کہنے کے ہنر سے واقف تھے، ان کا ایک افسانوی مجموعہ 'گونگا درد' ابھی حال ہی میں فخرالدین احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے مالی اشتراک سے شائع ہوا۔

روزنامہ 'قاصد' دہلی، 2 دسمبر 2017

یاس چاند پوری

نئی دهلی: معروف بزرگ شاعر اور تقریباً 10 شعری مجموعوں کے خالق حافظ عبدالعزیز ولد حافظ بشیر احمد مرحوم

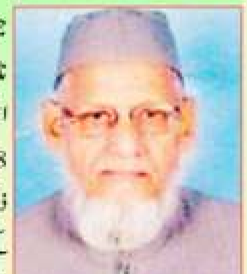

جو یاس چاند پوری کے نام سے مشہور تھے، کا انتقال ہو گیا۔ وہ تقریباً 88 برس کے تھے اور ذاکر نگر میں اپنے بچوں کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ پسماندگان میں دو بیٹے اور 4 بیٹیوں کے علاوہ پوتے اور پوتیوں سمیت بھرا پورا کنبہ ہے۔ ان کی تدفین اوکھلا بٹلہ ہاؤس قبرستان میں کی گئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 دسمبر 2017

خراج عقیدت:

مولانا آزاد کے 129ویں یوم پیدائش پر خراج عقیدت

نئی دهلی: 11 نومبر آج امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کے 129ویں یوم ولادت کے موقع پر دہلی کی آئی۔سی۔سی۔آر۔ کی جانب سے انھیں خراج عقیدت پیش کی گئی۔ تقریب میں نہ صرف صدر جمہوریہ ہند عزت مآب جناب رام ناتھ کووند، نائب صدر جمہوریہ ہند جناب وینکیا نائیڈو اور محترمہ سشما سوراج، وزیر خارجہ کی جانب سے مخصوص گلہائے عقیدت پیش کیے گئے بلکہ وزیر اعظم ہند، جناب نریندر مودی کی نمائندگی نائب وزیر خارجہ ایم جے اکبر کی جانب سے کی گئی۔ پارلیمنٹ میں اپوزیشن

کے رہنما، جناب غلام نبی آزاد نے بھی اپنی جانب سے مولانا آزاد کے تعلق سے اظہار خیال کیا۔ اس تقریب میں جناب فیروز بخت احمد کے علاوہ محترمہ ریوا گنگولی داس، ڈائریکٹر، آئی سی سی آر، جناب سید محمود، ڈپٹی ڈائریکٹر، آئی سی سی آر، ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد، نامور مسلم مفکر جناب م افضل، معتبر وکیل، جناب بہار برقی، قاری محمد ساجد، حاجی میاں فیاض الدین، جناب مدھوپ موہتہ اور نوجوان مسلم سماجی کارکن محمد عمران کے علاوہ دہلی کی معزز ہستیوں نے اس میں حصہ لیا۔

پروگرام کی شروعات قاری محمد ساجد کے ذریعہ تلاوت کلام پاک سے ہوئی۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جناب ایم جے اکبر نے کہا کہ مولانا آزاد کی مایہ ناز ہستی تو ایسی تھی کہ جس کی مثال پوری صدی میں بلکہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ انھوں نے بتایا کہ جہاں تک ہندوستان میں تعلیمی ترقی کا تعلق ہے، اس میں مولانا آزاد نے جو خاکہ دیا تھا، اس کی وجہ سے تمام ملک میں تعلیم کا معیار بلند و بالا ہے۔ جناب غلام نبی آزاد نے کہا کہ مولانا آزاد کی باہمی یگانگی کے نظریے کی آج اشد ضرورت ہے۔

معروف سماجی کارکن جناب فیروز بخت احمد نے کہا کہ ہمیں امام الہند حضرت مولانا آزاد سے سیکھنا چاہیے کہ کس طرح سے باہم ہم آہنگی کی اقدار کو عوام الناس میں مقبول کیا جائے اور کس طرح سے تعلیم سے فیض حاصل کیا جائے۔ معروف مسلم مفکر جناب ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ ہم لوگ ہندو مسلم ایکتا کے اس راستے پر نہیں چل رہے ہیں جو ہمیں مولانا آزاد نے دیا تھا۔ آئی سی سی آر کی ڈائریکٹر محترمہ ریوا گانگولی داس نے مولانا آزاد کے تعلق سے کہا کہ مولانا آزادؒ نے ملک کو تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر تعلیمی سرگرمیوں کا عملی خاکہ پیش کیا تھا۔ وہ آج تک لائق عمل و قابل تحسین ہے۔ انھوں نے بتایا کہ آئی سی سی آر کے علاوہ ملک کے آئی۔ آئی۔ ٹی۔ ساہتیہ اکادمی، مختلف زبانوں کی اکادمیاں ساہتیہ و نرتیہ کلا اکادمی، آئی۔سی۔ایس۔آر۔ وغیرہ جیسے ادارے قائم کر کے ملک کو ترقی کی قومی شاہراہ پر گامزن کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان کی خواہش ہے کہ پانچویں سے بارہویں تک کی ہر زبان کی نصابی کتابوں میں مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمات و کارکردگیوں سے متعلق ایک مضمون دیا جائے تاکہ نونہالان ملک کے دلوں میں نظریات آزاد جاگزیں ہو جائیں۔

اس موقعے پر معروف دانشور و معروف قانون داں جناب بہار برقی نے اپنے تاثرات پیش کیے۔

پریس ریلیز: میڈیا سیل فرینڈز فار ایجوکیشن تنویر احمد حسینی (سکریٹری)، 15 نومبر 2017

پروفیسر رفیع الدین

نئی دهلی: عربی زبان و ادب کی خدمات پر صدر جمہوریہ ہند ایوارڈ یافتہ پروفیسر شاہ رفیع الدین کی وفات پر شعبۂ عربی میں کل ہند انجمن اساتذہ و علمائے عربی اور شعبۂ عربی نے مشترکہ طور پر ایک تعزیتی جلسے کا اہتمام کیا۔

تعزیتی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر محمد نعمان خان صدر شعبۂ عربی ڈی یو نے کہا کہ پروفیسر رفیع الدین اس وقت بزرگ ترین استاد تھے۔ ان کا تعلیمی سلسلہ دہلی سے علی گڑھ ہوتا ہوا ناگپور پہنچتا ہے، جہاں سے آپ نے پی ایچ ڈی کی تعلیم مکمل کی۔ آپ نے عربی، فارسی اور اردو میں ایم اے کے علاوہ سنی دینیات میں بھی ایم ٹی ایچ کیا تھا۔ شروع میں کرناٹک میں ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر 1943 میں ناگپور یونیورسٹی کے مورس کالج سے لکچرر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے اور وہاں سے 1976 میں پروفیسر اور صدر شعبہ عربی و فارسی اور اردو کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے۔ پروفیسر رفیع الدین کو ان کی نعتیہ شاعری کے موضوع پر وقیع مقالہ کی بنیاد پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی۔ ان کے تحریر کردہ اردو ڈراموں میں سے صرف دو ڈرامے 'کشاکش' (1956) اور 'زہر و تریاق' (2004) شائع ہوئے۔ 1994 میں انھیں ان کی عربی خدمات کی بنیاد پر صدر جمہوریہ ہند نے صدارتی سند اور انعام سے نوازا۔ پروفیسر رفیع الدین انتہائی بااخلاق بامروت انسان تھے اور اسلامی اور ہندوستانی اقدار کے امین و پاسدار تھے۔ تعزیتی نشست سے شعبہ کے دیگر اساتذہ نے بھی خطاب کیا۔ دعائے مغفرت پر جلسہ ختم ہوا۔ اس موقعے پر شعبے کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرس، طلبہ اور کل ہند اساتذہ کے بعض ممبران موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 نومبر 2017

■

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اصلاح الاصلاح

مصنف: ابراحسنی گنوری
مقدمہ: شمس رمزی
صفحات: 129
قیمت: 85روپے

مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات

مصنف: محمد حسن
صفحات: 373
قیمت: 168 روپے

عوام الناس کے صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام

مصنف: ایس۔ایم۔خان
مترجم: سید وجاہت مظہر
صفحات: 166
قیمت: 125 روپے

کرداراورافسانہ یعنی دنیائے افسانہ (حصہ دوم)

مصنف: عبدالقادر سروری
صفحات: 118
قیمت: 75 روپے

قدیم علم الامراض

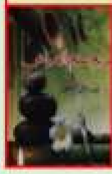

مصنف: ملک واثق امین
صفحات: 131
قیمت: 50 روپے

اصول افسانہ نگاری

مصنف: اویس احمد عزیز
صفحات: 86
قیمت: 65 روپے

بہار کی بہار (جلد دوم)

مصنف: اعجاز علی ارشد
صفحات: 242
قیمت: 150 روپے

مغرب میں تنقید کی روایت

مصنف: عتیق اللہ
صفحات: 568
قیمت: 245 روپے

بہار گلشن کشمیر (جلد اوّل ودوم)

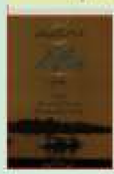

مرتبہ ومولفہ: پنڈت برج کشن کول
وپنڈت جگت موہن ناتھ رینہ
صفحات: 454، 537
قیمت: 275، 300 روپے

رشید حسن خاں (مونوگراف)

مصنف: عبدالحمید
صفحات: 122
قیمت: 74 روپے

دیوندر ستیارتھی (مونوگراف)

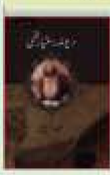

مصنف: عبدالسمیع
صفحات: 162
قیمت: 90 روپے

سید امتیاز علی تاج (مونوگراف)

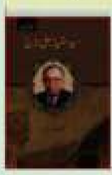

مصنف: محمد شاہد حسین
صفحات: 136
قیمت: 80 روپے

یاس یگانہ چنگیزی (مونوگراف)

مصنف: حسن مثنیٰ
صفحات: 149
قیمت: 90 روپے

علی سردار جعفری (مونوگراف)

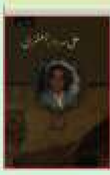

مصنف: عمر رضا
صفحات: 165
قیمت: 90 روپے

حسن نعیم (مونوگراف)

مصنف: شمیم طارق
صفحات: 143
قیمت: 85 روپے

فدائے لکھنؤ

مصنفہ: پروین طلحہ
مترجم: ڈاکٹر صبیحہ انور
صفحات: 182، قیمت: 100 روپے

آغا حشر کاشمیری (جلد ہشتم)

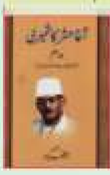

مرتب: یعقوب یاور
صفحات: 460
قیمت: 215 روپے

رینگنے والے جانور

مصنف: قیصر سرمست
صفحات: 84
قیمت: 22 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, January-2018, Vol.20, Issue:01
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/12/2017
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیشکش

خاکہ پر ایک دستاویزی شمارہ جس میں خاکہ کے فن اور روایت، اردو کے اہم اور نمائندہ خاکہ نگاروں پر مضامین کے علاوہ رفتگاں اور قائماں پر اہم ادبی خاکے بھی شائع کیے گیے ہیں۔

صفحات: 422 قیمت: 50روپے

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025